قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

شبلی اور دارالمصنفین

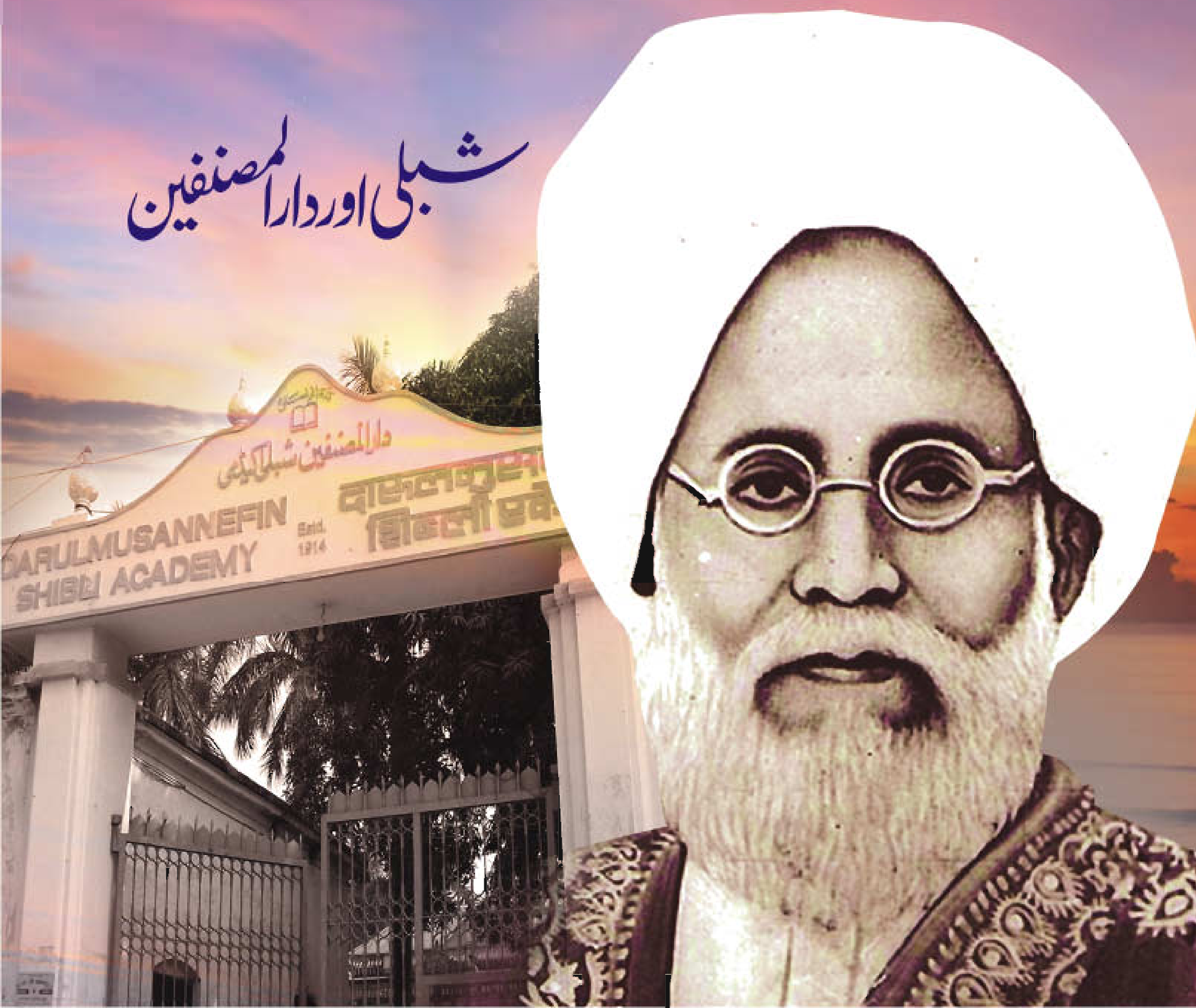

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

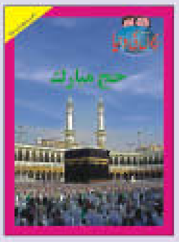

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

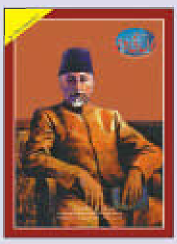

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:10، اکتوبر 2014

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
اطہر فاروقی — خواجہ محمد اکرام الدین 9

کتاب میلہ
سری نگر کتاب میلہ — امتیاز وحید 11

کور اسٹوری
مولانا شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت — شمس بدایونی 18
شبلی کی سوانح نگاری — جوہر جاوید گیاوی 21
شبلی کی اردو شاعری اور ملی دردمندی — سعود الحسن ندوی 25
سفرنامۂ شبلی کی تاریخی و تہذیبی اہمیت — شاہ نواز فیاض 29
شبلی کے خطوط سرسید کے نام — خالد ندیم 32
دارالمصنفین ماضی و حال — کلیم صفات الٰہی 36
دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی اور ایک یادگار مشاعرہ — محمد عبدالحفیظ صدیقی 38
قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ اور مختصر حالات — علامہ شبلی 40
انتخاب کلام — علامہ شبلی 43

زبان و تعلیم
اردو میڈیم سے تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کے درخشاں مواقع — محمد ظفر الدین 45

ادبی مباحث

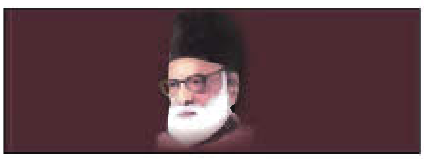

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری — عبدالناصر 47
پروفیسر نذیر احمد کی ادبی خدمات — عتیق الرحمٰن 50

شخصیات
خان عبدالغفار خان انبالوی — عطاء الرحمٰن قاسمی 52

ہماری مطبوعات
مذہبی جستجو (مہاتما گاندھی) — ٹی آرنندا 54

خراج عقیدت

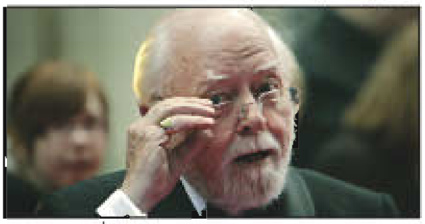

رچرڈ ایٹن برا: ایک عظیم گاندھی شناس — محمد عبدالرحمٰن ارشد 58

حج کے موقعے پر
حج: اقتصادی تطہیرِ نفس کے دائرے میں — سید اطہر رضا بلگرامی 60

ہم نے جنھیں بھلا دیا

ترجمانِ محبت: شعری بھوپالی — فاروق ارگلی 63

صحت
ایبولا کا قہر — محمد رفیق 66

کتابوں کی دنیا

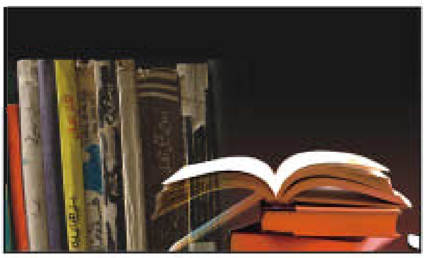

تبصرہ و تعارف 68

عالمی اردو نامہ
عالمی خبریں — ادارہ 76

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 78

ہماری بات

یہ سال اردو کی عبقری شخصیت، علامہ شبلی نعمانی کی وفات اور ان کے تشکیل کردہ ادارے دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے قیام کی صدی کا سال ہے۔
علامہ شبلی اپنی ذات میں خود ایک ادارہ تھے۔ علمی تحقیق و جستجو کے میدان پر نظر دوڑائی جائے تو ہندوستانی مسلمانوں میں دور دور تک کوئی دوسرا شبلی نظر نہیں آتا۔ شبلی کی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے پورا دفتر درکار ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل شعرالعجم، عربی زبان کے ادب سے متعلق شبلی کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس کا عربی ادب کے اسکالر آج بھی حوالہ دیتے ہیں۔ سیرت نگاری و سوانح نویسی کے فن کو اردو ادب میں وہ معراج انھوں نے بخشی ہے جس کے آس پاس بھی اب تک کوئی نہیں پہنچ پایا۔ ادبی نقد و نظر میں 'موازنۂ انیس و دبیر' مولانا شبلی کا وہ کارنامہ ہے جس نے اردو تنقید کے پیمانوں کو مزید وسعت بخشی۔ شاعری کے فن کو شبلی نے محض شوق کے درجے پر اختیار کیا تھا مگر اُن کی قادرالکلامی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ علمی و تحقیقی کام چھوڑ کر وہ صرف فکر شعر و سخن سے وابستہ ہو جاتے تو اس میدان میں بھی شاید سب سے آگے نظر آتے۔
سیاست سے اگرچہ عملی طور وابستہ نہیں ہوئے لیکن سیاسی فہم و فراست اور دور اندیشی میں مولانا شبلی سبھی مسلم ہم عصروں سے آگے تھے۔ علم و عمل سے ایک مذہبی شخصیت اور راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوصف انھوں نے برصغیر میں ہندو مسلم یک جہتی کی پرزور طرف داری کی تھی۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ اور اس کے نظریات کو بھی انھوں نے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ مانا اور ہندوستانی مسلمانوں کو ہمیشہ مسلم لیگ سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ اس وقت تمام مسلم قوم ان کی دور اندیشی پر ایمان لے آتی تو اُسے اور پورے برصغیر کو وہ سب نہ جھیلنا پڑتا جو علامہ شبلی کی وفات کے تیس چالیس سال بعد ہولناک حقیقتوں کی شکل میں سامنے آیا۔ ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی سے پیدا ہونے والی توانائی، متحدہ ہندوستان کو کبھی کا، دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی اور سیاسی طاقت بنا چکی ہوتی۔

دارالمصنّفین کا قیام شبلی اس لیے چاہتے تھے کہ اسلامی علوم و ادبیات کے معاملے میں تحقیق و جستجو کے مزاج کو تقویت حاصل ہو۔ جو معیاری مصنّفین اسلامی علوم کے شعبوں میں کتابیں تصنیف یا مرتب کرنا چاہیں انھیں ایک ہی جگہ رہ کر یک سوئی سے اپنا کام کرنے کے موافق ماحول میسر آئے، ان کی مالی امداد ہوتی رہے، ایک ایسی بڑی لائبریری موجود ہو جس سے وہ دورانِ تصنیف استفادہ کر سکیں اور انھیں دوسری لائبریریوں کے لیے یہاں وہاں گھومنے میں وقت نہ ضائع کرنا پڑے۔ تحقیقی کاموں کے لیے شبلی کو خود بھی دور دراز کے سفر اختیار کرنے پڑے تھے اس لیے وہ مصنّفین کو پیش آنے والی مشکلات سے بخوبی واقف تھے۔
ادارے کا جو نقشہ شبلی نے مرتب کیا تھا اس میں شعبہ طباعت و اشاعت کا بھی اہتمام تھا تاکہ وہاں تیار ہونے والی کتابیں وہیں سے شائع بھی ہوں اور ان کی آمدنی ادارے کو ملتی رہے۔ ظاہر ہے ادارے کو ان سبھی کاموں کے لیے سرکاری مدد نہ تو مل سکتی تھی نہ شبلی خود انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے حق میں تھے اس لیے ہم خیال متمول مسلمانوں سے مدد لینے کے علاوہ انھوں نے خود اپنی املاک بھی ادارے کے لیے وقف کر دیں۔ اپنی لائبریری دے دی اور دارالمصنّفین کو باقاعدہ ایک ٹرسٹ بنانے کے لیے قانونی کارروائی بھی زندگی کے اُن آخری دنوں میں مکمل کرالی جب انھیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ آخری وقت نزدیک ہے۔
'شبلی صدی' کو شایان شان طریقے سے منانے کا سلسلہ چل پڑا ہے اور 'اردو دنیا' کے زیر نظر شمارے کی کور اسٹوری بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والوں کی موجودہ نسل کو علامہ شبلی کے علمی و تحقیقی مزاج سے واقف کرایا جائے اور دارالمصنّفین کی شکل میں جو ادارہ انھوں نے کھڑا کیا تھا ہم اس کے استحکام و توسیع اور جدید کاری کی طرف توجہ دیں۔ کوششیں چل رہی ہیں کہ مالی مشکلات میں مبتلا دارالمصنّفین کو سرکاری سطح پر قومی اہمیت کا ادارہ تسلیم کرالیا جائے۔ لیکن اس کے انتظار میں ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ اردو کے تمام حلقوں کا فرض ہے کہ اس ادارے کی طرف توجہ دیں اور اس کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے آگے آئیں۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

پروفیسر شہزاد انجم
کوآرڈینیٹر، ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن، اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے گوشۂ ٹیگور اور اقبال پر جب نظر پڑی تو میں خوشی و مسرت سے سرشار ہوگیا۔ شمارہ وقیع اور معلومات افزا ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ ٹیگور اور اقبال کا شمار صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ نوبل انعام ملنے کے بعد ٹیگور کی شہرت وعظمت میں مزید چار چاند لگ گئے۔ ایک عام اندازے کے مطابق ٹیگور کی تخلیقات پندرہ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں جس میں کئی نظموں اور گیتوں کے مجموعے، افسانوں کے مجموعے، ناول، ڈرامے اور دیگر تحریریں شامل ہیں۔ میں گذشتہ دو برس سے وزارت ثقافت حکومت ہند کے تفویض کردہ 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' کی تکمیل میں منہمک ہوں۔

پیش نظر شمارے میں ٹیگور اور اقبال کے تعلق سے شامل مضامین تازہ اور نئے ہیں۔ محمد ارشاد علی نے ٹیگور اور اقبال کے افکار اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں یکسانیت کی نشاندہی کی ہے۔ محمد علم اللہ کا مضمون 'ٹیگور اور اقبال کا مشترکہ المیہ' بحث انگیز اور فکر انگیز ہے۔ علم اللہ کے ذہن رسا کی داد دینی ہوگی۔ انھوں نے دونوں عظیم تخلیق کاروں کا تجزیہ نہایت علمی، معروضی اور بے باکانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں بحث کی کافی گنجائش ہے۔

شمیم احمد اپنے مضمون 'ٹیگور کی زندگی اور تخلیقی عناصر' میں ٹیگور کے ادب، تعلیمی نظریات، تھیٹر اور مصوری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس مضمون میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ شمیم احمد اگر ٹیگور کی کسی ایک جہت پر مفصل روشنی ڈالتے تو مضمون زیادہ معنی خیز ہوتا۔ اسامہ شعیب علیگ نے اپنے مضمون میں ٹیگور اور اقبال دونوں عظیم شاعروں کے نظریات اور شخصیت کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں شخصیات کے نظریات وافکار کا ایک فریم متعین ہو چکا ہے اور جس کی توضیح وتشریح مقالہ نگار حضرات کرتے ہیں۔ منظر اعجاز کا زاویۂ نظر مختلف

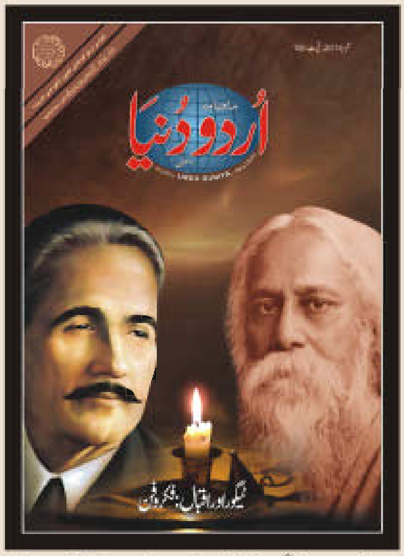

ہے۔ انھوں نے ٹیگور کے تصورِ الوہی، انسان دوستی، قوم پرستی، وطن دوستی، مختلف علوم وفنون سے فطری اور غیر معمولی دلچسپی کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یاسمین فاطمہ کا مضمون 'اقبال کا تصورِ تعلیم' اور محمد عارف کا مضمون 'اقبال اور ٹیگور: ایک مختصر جائزہ' بھی قابل تحسین ہے۔

گذشتہ دو برسوں میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ورکشاپس، سیمیناروں، توسیعی خطبات اور متعدد ثقافتی پروگراموں کا انعقاد ٹیگور کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ اس پروجیکٹ کے زیر اہتمام گیتانجلی، ٹیگور شناسی، باغبان، میری یادیں، ٹیگور شاعر اور دانشور، ٹیگور فکر وفن کے ہزار رنگ، ٹیگور کے مضامین، ٹیگور کے ڈرامے، ٹیگور اور اقبال وغیرہ کتابوں کی اشاعت ہو چکی ہے۔ عنقریب کلام ٹیگور، ناول 'گورا'، ٹیگور کی بازیافت اور 'ٹیگور کی کہانیاں' کی اشاعت بھی ہوگی۔ آپ کے اس شمارے سے ہمیں بڑی طاقت ملی۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاریخی کارنامے 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' کو آپ کے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور آپ کے ادارے کے رسالے 'اردو دنیا' نے بڑی تقویت بخشی۔ ہم آپ کے احسان مند اور شکرگزار ہیں۔

سید اطہر رضا بلگرامی
سیکٹر 8، جسولا وہار، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا نیا شمارہ 'ٹیگور اور اقبال' نظر نواز ہوا۔ مضامین کے انتخاب میں معیار، پرکشش کتابت اور حسن طباعت نے متاثر کیا۔ رسالے کو ہاتھ میں لے کر فخر اور پڑھ کر علمی تسکین کا احساس جاگتا ہے۔

اس بار ایک خلش نے سر اٹھایا جو معذرت کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ علامہ اقبال کی نثری کاوشوں پر توجہ کم دی جارہی ہے۔ ان کو شاعری کے حدود میں شاعر ملت اور مفکر سمجھا اور سمجھایا جاتا رہا ہے ان کی تصنیفات، خطبات اور خطوط میں ان کی نثری کاوشوں پر توجہ کم دی گئی ہے۔ ان کی تصنیف 'علم الاقتصاد' ان کو مفکر معاشیات ثابت کرتی ہے جو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی معاشی مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں اصولِ معاشیات کو تاریخ اور قومی و عالمی سطح کے مسائل کے دائرے میں واضح کیا گیا اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً معاشیات کا مشہور قانون، پیداوار کا قانونِ انحطاط پذیری یا قانون تقلیل حاصل Law of Diminishing Returns ہے جس کو علامہ نے تاریخ انسانی کے ارتقا کے پس منظر میں واضح کیا ہے۔

پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے اپنی ایک تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ جن کاشت کاروں کی آمدنی ایک خاص حد سے نیچے ہو، انھیں انکم ٹیکس کی طرح لگان میں رعایت ملنی چاہیے۔ اس تجویز کو اس وقت منظور نہیں کیا گیا لیکن دور حاضر میں حکومتیں اس تجویز پر عمل پیرا ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ آپ ان کے خطبات وخطوط میں بھی اسی طرح کے ریفارمس کے نظریے پائیں گے۔ 'علم الاقتصاد' 1903 میں شائع ہوئی۔ اردو میں یہ اُس وقت شائع ہوئی جبکہ انگریزی میں بھی معاشیات پر کتابیں شائع کرنے کا چلن نہیں تھا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
کوہسار، بھاگلپور (بہار)

ستمبر کے 'اردو دنیا' میں آپ نے ٹیگور اور اقبال پر نیا مواد دیا ہے۔ ان دونوں کی مماثلت میں قبل ازیں اختر حسین رائے پوری، پیارے لال ذاکر، مخدوم محی الدین،

مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی، سردار جعفری، ہنس راج رہبر، قمر حسن، عارف بٹالوی، آفاق احمد، افصح ظفر، شہزاد انجم وغیرہ نے باضابطہ مضامین لکھے ہیں، آپ کو مبارکباد کہ اتنے مضامین کا اضافہ ہوا۔

اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ایک آواز یہ بھی اٹھ رہی ہے کہ ٹیگور کو نوبل انعام ملا، علامہ اقبال کو کیوں نہیں ملا۔ اس پر الگ الگ خیالات پیش کیے جاتے رہے ہیں جب کہ سچائی یہ ہے کہ ٹیگور کی پرداخت انگلینڈ میں ہوئی۔ وہاں کی یونیورسٹی سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہ زمانے کی نبض پر انگلی رکھنا جانتے تھے اور یہ زمانہ برطانیہ سے لے کر امریکہ تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ صرف آسٹریلیا نہیں گئے باقی دنیا کا بیشتر حصہ گھوم آئے۔ 'گیتانجلی' کا ترجمہ خود انھوں نے Song Offering کے نام سے کیا تھا جسے 'انڈیا سوسائٹی، لندن' نے شائع کیا تھا اور جس کا دیباچہ ڈبلیو بی ایٹس نے لکھا۔ ایزرا پاؤنڈ اور یوروپ کے دوسرے کئی بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے اس کتاب کی خوب پذیرائی کی اور یہ سچ ہے کہ تکثیری سماج کے ٹیگور نئے جزئیات نگار تھے۔ وہ شاعر تھے، موسیقار تھے، مصور، ڈراما نگار، افسانہ اور ناول نویس اور مضمون نگار تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بڑے پیمانے پر پروجیکٹ کیا۔ سجاد ظہیر اور جوش ملیح آبادی نے اس سلسلے میں کھل کر لکھا ہے۔ نوبل انعام ملنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے نوبل کمیٹی کے چیئرمین ہرالڈ ہارنے لکھا ہے:

''انھوں نے اپنی نظموں کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ جو اسلوب سخن کے مطابق پرتاثیر اور حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے ملکہ الزبتھ کے دور سے ہی برٹش تہذیب کی توسیع میں تعاون کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

ٹیگور کے مقابلے میں اقبال اردو اور فارسی میں لکھ رہے تھے۔ ملت اور قوم کے درد و کرب کو بیان کر رہے تھے اور اسلامی فکر اور قرآنی نکتے کو شاعری کا لباس پہنا رہے تھے۔ ساتھ ہی اسلام کے معنوی امکانات کی بازیافت کر رہے تھے۔ ان کے یہاں آفاقی سچائی تھی لیکن وہ برٹش تہذیب کی توسیع میں حصہ نہیں لے رہے تھے اور ان کے تعلقات غیر ملکی قلمکاروں سے نہیں تھے جن کی سفارش کام آتی کہ نوبل انعام ملے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے بارے میں بہت سی نئی جانکاری ملی۔ محمد عارف اقبال کے سوالات ہی ایسے ہیں۔ غضنفر کا مضمون بھی اچھا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربے کو وسعت دی ہے۔ نصیر احمد خاں کا مضمون تشنہ ہے جب کہ بلوم فیلڈ کی لسانیات پر کتاب ضخیم ہے۔ اداریہ میں پروفیسر خواجہ صاحب نے خصوصی گوشے کے بارے میں رائے طلب کی ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کے خوبصورت معیاری اور بامقصد گوشوں سے سب کا بھلا ہوگا اور یکجا مواد کی وجہ سے بار بار استفادہ کیا ائے گا۔

پروین شیر
(کینیڈا)

آج مجھے پہلی بار رسالہ اُردو دنیا ستمبر 2014 کی ہارڈ کاپی موصول ہوئی۔ اس سے پہلے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دو بار انٹرنیٹ پر ضرور دیکھا لیکن ہارڈ کاپی سے زیادہ اندازہ ہوتا ہے، اس کی بات کچھ اور ہے۔ سب سے پہلے دلی مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔ اتنا معیاری، خوب صورت اور خوب سیرت اُردو رسالہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ ہر لحاظ سے اعلیٰ۔ دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوئی ہے۔ آج ہی ملا ہے اور مجھے اس نے اپنے سحر میں قید کر لیا ہے۔ مشمولات، طباعت، کتابت اور اس کا فارمیٹ سب بے حد عمدہ ہیں۔ چونکہ آپ کی ادارت ہے اس لیے یہ تو ہونا تھا۔ آپ کی بے حد ممنون ہوں کہ یہ خزانہ مجھے عطا کیا۔ فی الحال اقبال اور ٹیگور جیسی عظیم شخصیات کے گوشے نے مجھے گھیر کر سحر زدہ کر دیا ہے۔ ان دونوں کی موجودگی نے اس شمارے کو بہت قیمتی بنا دیا ہے۔ خاص کر ہم جیسے دیار غیر میں رہنے والوں کے لیے یہ نعمت ہے، جس کے لیے یہاں ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم
جمشید پور (بہار)

ستمبر 2014 کا 'اردو دنیا' اردو زبان و ادب کی تمام تر خوبصورتی دلکشی، رنگینی، سادگی و پرکاری، صناعی و سحر طرازیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ عالمی ادب کی وہ شخصیتیں جن پہ علم و ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا اور جو اذہان و دل کے لیے نت نئے افکار و تصورات کے دروازے کھولتے رہیں گے جن کو پڑھ کر، جن کو لکھ کر اور جن کی تدریس محض سے روحانی تسکین میسر آتی ہے ان ہی آفاقی شعرا میں ٹیگور اور علامہ اقبال کا شمار ہوتا ہے، جن کے متعلق ہماری بات کے عنوان سے مندرج آپ کے یہ جملے کہ ''مغربی فکر میں مشینی معیشت کی روشنی اور دماغی فتوحات کی چکاچوند کے ساتھ ساتھ دل کے نہاں خانوں میں جو تاریکیاں پائی جاتی ہیں اور روحانی احساسات کی وادیوں میں جو سناٹے سرسراتے ہیں انھیں مشرق سے طلوع ہونے والے یہ دو آفتاب ہی دور کر سکتے ہیں۔'' اپنی تمام تر ادبیت، عمدگی اور جاذبیت کے ساتھ دماغ پہ نقش ہو جانے والے جملے ہیں۔ اس شمارے کے ترتیب و تزئین میں آپ کا علمی ذوق اور ادبی کاوشیں دونوں قابل ستائش ہیں۔ محمد عارف اقبال 'مشرق کے دو آفتاب و آفتاب' (نصرت ظہیر) ٹیگور اور اقبال فکری و شخصی موازنہ، ٹیگور اور اقبال کا مشترکہ المیہ، اقبال کب پیدا ہوئے، ٹیگور کی زندگی اور تخلیقی عناصر، اقبال اور ٹیگور: ایک مختصر جائزہ زمین سے پیدا ہونے والا سورج رابندرناتھ ٹیگور، ٹیگور اور اقبال کا شخص و نظریاتی مطالعہ، اقبال کا تصور تعلیم، انتخاب کلام ٹیگور، افسانہ 'چھٹی' کلام اقبال: مختصر انتخاب، زبان کے مختلف معیار 'اردو درس و تدریس میں لغات کا کردار' افسانہ شعریات کی تشکیل کا جواز 'سجاد ظہیر خطوط کے آئینے میں' 20 ستمبر 1857 واقعات و اثرات یعنی مختصراً صرف اتنا عرض کیا جاسکتا ہے کہ ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔'' ٹیگور اور علامہ اقبال کی شاعری فنون لطیفہ کی عمدہ مثالیں ہیں اور کیوں نہ ہو کہ دونوں اپنی علمیت، قابلیت، ذہانت، فکر و فلسفہ کے ماہ کامل ہیں، دونوں مصور فطرت اور نباض وقت ہیں۔ 'گوشۂ ٹیگور و اقبال' کے تمام مضامین لائق داد و تحسین ہیں جن کے مطالعے سے درس و تدریس اور تحقیقات کے نئے موضوعات میسر آتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
(سابق ممبر راجیہ سبھا)
C-501، روز ووڈس اپارٹمنٹس، میوہار فیز I، دہلی 91

'اردو دنیا' کا اگست 2014 کا شمارہ محققانہ اور فکر انگیز مضامین کا علمی خزانہ ہے۔ مندرجہ ذیل مضامین اس ذیل میں آتے ہیں: جدوجہد آزادی ابھی جاری ہے، 1857 کی جنگ آزادی کا ایک گم شدہ مجاہد: پیر علی شہید، جنگ آزادی کی فراموش کردہ شخصیت: نجو خاں، دو مشہور انگریز شاعر اور ہندوستان کی آزادی، مولانا فیض احمد بدایونی دور غلامی کے محب وطن عالم دین، تحریک آزادی اور اردو، اردو زبان کی تاریخی اہمیت، ساغر نظامی کی شاعری کا جائزہ، اعظم کریوی افسانہ نویس، پاکستانی افسانے پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات، ان محققانہ اور حد درجہ معلوماتی مضامین کی اشاعت پر آنجناب دلی تہنیت اور مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان مضامین کے لکھنے والے حضرات بھی۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
کالی پلٹن، نزد دیوان جی کا کنواں، ٹونک (راجستھان)

'اردو دنیا' اگست 2014 کا شمارہ دستیاب ہوا۔

68ویں جشن آزادی کے موقعے پر جنگ آزادی اور تحریکات کے کارناموں پر مبنی مشمولات قابل تحسین ہیں۔ نسائی شاعری اور صنفی مساوات پر حلیمہ فردوس کا مضمون عمدہ ہے۔ تبصرے اور عالمی خبریں زبان کے زندہ اور مقبول ہونے کی علامت ہیں۔ زبان و تعلیم کے ضمن میں دو مضامین تاریخی اور علمی استعداد بڑھانے والے ہیں۔ محمد نور الحق صاحب نے تاریخی واقعات و حادثات اور تحریکات سے اردو

کا رشتہ جوڑا ہے۔ اسی طرح محمد نعمان خاں نے 'تدریس کے مسائل اور تقاضے' میں گنے چنے قائم و دائم، مسائل کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ آئین ہند اور سہ لسانی فارمولے سے لے کر اردو تنظیموں، بورڈوں اور اکادمیوں کے فرائض منصبی کے باوجود 'اردو تدریس' کا مسئلہ برقرار ہے۔ ابھی تک اس مسئلے کی ذمے داری طے نہیں ہو سکی ہے۔ Constructivism اور CCE کی تو کیا بات کی جائے۔ یہ ماہرین تعلیم کا مسئلہ ہے دیکھیے کب حل ہوتا ہے کب نصاب میں شامل ہوتا ہے۔ طفل مرکوز اور تعمیر پسندی کے رجحان کو کب نصاب اور درسی کتب میں شامل کیا جائے گا۔ کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ صدفی صد خواندگی، نیشنل لٹریسی مشن اور لٹریسی ڈپارٹمنٹ سے متعلقہ ہے۔ NIOS کے خواندگی کے امتحانات اردو میں ہوں تو کیا کہنے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ نعمان صاحب کے مضمون کو ایک فعال پروجیکٹ میں دیکھا جائے تو خوش آئند قدم ہوگا۔

ایم. راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا۔ 480001 (مدھیہ پردیش)

اردو وہ زبان ہے جو ہمیں تہذیب یافتہ بناتی ہے اور شائستگی کا ہنر بھی سکھاتی ہے۔ اس نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سرفروشانِ وطن کے حوصلوں کو توانائی اسی زبان نے بخشی۔ اردو نے مذہبی رواداری کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کی سرپرستی ہر مذہب کے لوگوں نے کی۔ وہ لوگ جو اس کے رسم الخط سے ناآشنا ہیں وہ بھی اس زبان کی شیرینی سے متاثر ہیں۔ افسانہ نگاری نے واقعات اور حادثات کے بیان کو منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات اور مکالمہ نگاری سے آراستہ کیا۔ کرداروں کی بھیڑ افسانے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ زیادہ کرداروں کے درمیان قاری کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ ساغر نظامی ایک فطری شاعر تھے، ان کے اندر جو فن کار تھا وہ اردو ادب کی تمام اصناف کا عاشق بھی تھا۔ انھیں نظم اور نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔

نجیب محفوظ کو پوری عرب دنیا کا بہترین ادیب اور دانشور سمجھا جاتا ہے انھوں نے اپنی پوری توجہ حقیقت پسند ناولوں پر مرکوز کر دی۔ نجیب نے مصری عوام کے مسائل اور خانگی زندگی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصطفی ندیم خاں غوری

زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، ضلع جالندھر (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' اگست 2014 کا شمارہ ہمدست ہوا۔ 'آپ کی بات' کے کالم میں ڈاکٹر ممتاز مہدی صاحب کا مکتوب نظر سے گزرا جو 'اردو دنیا' جولائی 2014 میں جناب نصرت ظہیر صاحب کے مضمون بعنوان 'خواجہ احمد عباس کے تین عظیم تحفے' کا نہایت دلچسپ اور معلوماتی اضافہ ہے۔ صدر

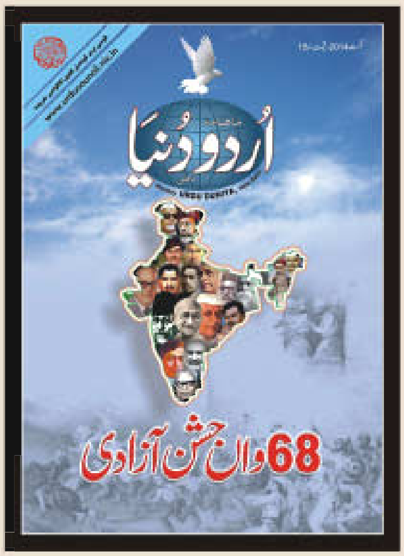

عالم گوہر صاحب کا مضمون 'خیام' انتہائی دل خوش کن ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ صفحہ 9 پر '68واں جشن آزادی' کے زیر عنوان کور اسٹوری میں شامل تمام مضامین نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس عنوان کے ذیل میں آپ نے جن اغراض و مقاصد کو بیان کیا ہے اور جن تقاضوں کی توقعات ظاہر کی ہیں یہ مضامین ان کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں جو ایک زندہ جاوید قوم کی نشانی ہے۔ ہمیں اپنے چہیتے ملک اور اپنی نمایاں کامیابیوں پر بے حد ناز ہے۔ کور اسٹوری میں شامل یہ تمام ہی مضامین حاصل شمارہ ہیں۔ باقی تمام مشمولات خوب سے خوب تر ہیں۔ خصوصاً حنیف نقوی صاحب کی عالمانہ تصنیف بعنوان 'تحقیق و تعارف' ناشر قومی اردو کونسل نئی دہلی سے اخذ شدہ جز 'غالب اور عیوبِ قوافی' (ص 58) لاجواب ہے۔ اس کی کل افادیت کتاب کے مطالعے کے بعد ہی تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ اک ذرا ص 84 پر دوسرے پیراگراف میں یہ جملہ کہ ''... میرا قلمِ دل کے سمندر سے احساسات کے قطرے باہر انڈیل دیتا ہے...'' کچھ توجہ کا متقاضی لگتا ہے کیونکہ قطرے انڈیلے نہیں جاتے بلکہ ٹپکائے جاتے ہیں۔ یا ٹپکتے ہیں۔ انڈیلنے کے لیے تو مائع کی زائد مقدار درکار ہوگی۔

خورشید حیات

چیف کنٹرولر، ساؤتھ ایسٹ سنٹرل ریلوے، بلاسپور

اردو دنیا اگست 2014 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی اردو زبان و ادب کے حسن میں مزید اضافہ کر گیا اور یہ بھی احساس دلا گیا کہ 'ادب کائنات' کی دھڑکن اپنی 'سنہری تہذیب' کے دم سے ہی ہے۔ یہ بھی ایک سچ ہے کہ 'ریشمی رومال' نے اس زبان کو اک نیا آنگن دیا۔ ایک ایسا آنگن جہاں آج بھی، گوپی چند نارنگ، جوگندر پال، ستیہ پال آنند، دیپک بدکی جیسے ڈھیر سارے چہرے ہمیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، کیسا محسوس ہوا ہوگا، ان پرندوں کو جنھوں نے پہلی بار آزادی کے سورج کو اپنی آنکھوں میں اگتے دیکھا ہوگا۔ اک آج کا دن ہے، زندگی کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ ہم تھکاوٹ کے لمحوں میں اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا ذائقہ مٹی کے کلھڑ میں چائے پیتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور کمبخت، زندگی کی یہ گاڑی پھر سے اپنے ٹریک پر آجاتی ہے۔

ریحان حسن کا مضمون/ مقالہ 'ڈاکٹر محمد حسن کی فراق شناسی' مختصر مگر جامع ہے۔ اس صدی کو رگھوپتی سہانے کے سے چہروں کی ضرورت ہے۔ اس عہد کو ضرورت ہے شیخ نور محمد، بیگم امام بی بی کی۔ اردو دنیا خاندان کو مبارکباد کہ آپ سب جانتے ہیں 'ندی' میں بہتا ہے کوئی اور۔ نئی جوت جلاتے رہیں کہ اندھیرا ابھی بھی بہت ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج مورتاڑ، ضلع نظام آباد

جولائی 2014 کا اردو دنیا وقت پر موصول ہوا۔ سرورق پر اردو اور ہندوستانیت کے ساتھ اردو زبان و ادب میں جو ثقافت وتہذیب وتمدن پنہاں ہے وہ آشکارا ہو رہی ہے۔ اردو دنیا کا سرورق معنویت ومقصدیت سے مزین ہوتا ہے قاری کو ایک Concept مل جاتا ہے۔ ہماری بات میں مدیر صاحب نے اردو کے تعلق سے جو بات کہی ہے وہ صد فیصد صداقت پر مبنی ہے۔ نصیر احمد خاں کا انٹرویو ادبی تنقیدی تحقیقی معلومات سے پر ہے انھوں نے ادب کے شعبوں تخلیق، تنقید وتحقیق کے موقف اس کے معیار پر اظہار خیال کیا ہے اور دانش ورانہ مشورے بھی دیے ہیں۔ مظفر حسین سید نے ہندوستانیت اور اردو پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ شائستہ فاخری، شاداب عالم کے مضامین بھی عمدہ ہیں۔ میں رسالے کے مدیر رفقائے کار کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اردو کے اس کساد بازاری کے ماحول میں ایسا شاندار رسالہ شائع ہو رہا ہے۔

پروفیسر ناشر نقوی

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ جولائی پیش نظر ہے جو اپنی ادبی اور معلوماتی جولانیوں کا مرقع ہے۔ معید رشیدی کو دیے گئے انٹرویو میں پروفیسر نصیر احمد خاں کا یہ مشورہ اچھا لگا کہ اردو کونسل کو چاہیے کہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں کی اردو تحقیقی سرگرمیوں کا ڈاٹا اپنے یہاں محفوظ رکھے تاکہ جانکاری کے علاوہ رابطہ کاری بھی آسان ہو۔ مظفر حسین سید نے اپنے مختصر سے مضمون میں اردو کے خمیر کو ہندوستانی خمیر میں عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔ اسی نہج کا اچھا مضمون شائستہ فاخری

کا بھی ہے۔ خلیق الزماں نصرت نے زبان کی وضاحت آسانی، سلطانی اور عوامی زمروں میں تقسیم کرکے اچھی تشریح کی ہے۔ محمد ذاکر کا مضمون اس امر کی دلیل ہے کہ نظیر اکبرآبادی برملا اور بے ساختہ شاعر تھا جس کی عظمت کو اجاگر کرنا ہمارا فرض ہے۔ نورالحسنین کا مضمون اردو افسانہ میں ہندوستانیت بہت چھوٹا ہے۔ اس پر تو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ عبدالقادر نے فارسی کے ہندو شعرا کو موضوع تو بنایا لیکن صرف نو شعرا سے ہی متعارف کرایا۔ جب کہ ہندوستان کے ہر صوبے سے دیکھا جائے تو یہ تعداد سیکڑوں میں جائے گی۔ پنجاب میں گورو گوبند سنگھ کا 'ظفرنامہ' اور گورو صاحب کے شاگرد نند لال گویا کا دیوان پنجابی کلچر کی روح ہے۔ پنجابی یونیورسٹی نے پنجاب اور کشمیر کے غیر مسلم فارسی شعرا پر جو کام کرائے ہیں ان میں ہی شعرا کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ ٹیپو سلطان اور مجاہدین آزادی پر مضامین خوب ہیں۔ خمار بارہ بنکوی کی شخصیت اور شاعری سے وسیم فرحت نے موثر طور پر متعارف کرایا ہے۔ اردو کی نئی کتابوں پر تبصرے اور اردو کی خبریں معلومات میں اضافے کا موجب ہیں۔ محمد فیروز نے مرحوم سید ضمیر حسن کو عمدہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

صلاح الدین (ممبئی)

'اردو دنیا' ایک عمدہ رسالہ ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں جو ایسا شاندار رسالہ شائع کرتے ہیں۔ مئی کے شمارے میں سبھی مضامین عمدہ تھے۔ البتہ عطیہ فیضی پر شائع شدہ مضمون کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عطیہ بیگم بہت قابل خاتون تھیں۔ ان کے مزاج میں ضد بھی خاصی تھی۔ وہ بڑی بیباک، دبنگ، زبان دراز اور دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمی کا بھی شکار تھیں۔ علامہ اقبال سے ان کے مراسم حدود کے اندر ہی رہے جو وطن سے دور کسی دو طالب علموں میں ہوتے ہیں جو یکدم ہم عمر ہوتے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ بہت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے۔ چونکہ عطیہ بیگم غیر معمولی ذہین اور انتہائی Polished تھیں اس لیے علامہ ان کی غیر معمولی قدر کرتے تھے۔

زیادہ تر نقادوں اور جانکاروں کو عطیہ کی زندگی کے اچھوتے پہلو کے بارے میں پتہ ہی نہیں ہے کہ عطیہ بیگم فیضی جدوجہد آزادیِ ہندوستان کی ایک بڑی مجاہدہ بھی تھیں۔ ان کے اس کام میں ان کی بڑی بہن رفیعہ نازلی سلطانہ فیضی بھی شریک تھیں۔ دونوں مہاتما گاندھی کے بہت قریب تھیں۔ نازلی فیضی نے بمبئی شہر میں تاریخ میں پہلی بار جدوجہد آزادی کے لیے خواتین کی الگ سے ایک تنظیم بنائی جس کی وہ خود صدر بھی تھیں اور چھوٹی بہن عطیہ فیضی اس کی سب سے زیادہ فعال رکن تھیں۔ جب گاندھی جی کی پکار پر بھارت کی عوام نے لبیک کہتے ہوئے غیر ملکی مالوں کے استعمال ترک کردیے اور برطانیہ کے بنے کپڑوں کے اونچے ڈھیر کو اکٹھا کرکے ہولی جلائی تو اس کام کے لیے بذات خود عطیہ بیگم نے 36 ہزار سلے کپڑے اکٹھا کیے۔ گاندھی جی کی کھادی (کھدر) کی صنعت کو کامیاب کرانے میں عطیہ کا بہت بڑا کردار تھا۔ اس نے خود سے چرخا چلانا اور کھادی بُنا سیکھا، بہنوں کو سکھایا، مسلمان عورتوں کو بڑی تعداد میں سکھایا، ہزاروں فٹ خود سے بُنے، بڑی تعداد میں مسلم گھروں میں دروازے دروازے پہنچ- پہنچ کر گاہک پیدا کیے اور کامیاب کرایا۔

کھادی کی بمبئی میں پہلی نمائش 31 جولائی 1921 بروز اتوار CP Tank علاقے میں ہوئی تھی تو اس کا افتتاح عطیہ بیگم فیضی کے ہاتھوں ہوا تھا جہاں مہاتما گاندھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے وہیں ایک تقریر کی جس میں عطیہ بیگم کا نام لے کر ان کی بڑی تعریف کی۔ یکم اگست 1921 کو انگریزی اخبار Bombay Chronicle میں رپورٹ بھی چھپی تھی جو گاندھی جی کے Collected Works of Mohatma Gandhi, Vol 24, p 34 پر درج ہے اور جس کو آپ انٹرنیٹ پر پڑھ بھی سکتے ہیں۔ وہ ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ اسے مع ترجمہ اردو دنیا میں شائع کریں۔ اتنا ہی نہیں، عطیہ فیضی نے گاندھی جی کے کہنے پر تلک سوراج فنڈ کے لیے چند روز میں ہی ایک لاکھ روپے اکٹھا کرکے لاکر دے دیے۔ خلافت فنڈ کے لیے بھی خاصی بڑی رقم اکٹھا کردی۔ ترک موالات، سودیشی تحریک، تحریکِ خلافت میں حصہ لیا۔ ڈیوک آف کناٹ اور پرنس آف ویلز کی نومبر 1921 میں بمبئی میں آمد کے خلاف بھاری عوامی جلسوں میں بڑی شاندار جوشیلی تقریریں ایسی کیں کہ عوام ان پر پھول برسا رہے تھے۔ یہ تفصیلی روداد انگریزی کے امریکی اخبار Sunday State Journal کے 15 جنوری 1922 کے شمارے میں صفحہ 29 پر آپ خود دیکھ لیں۔ وہ Wisconsin کا اخبار تھا۔ وہی بات اختصار سے ایک اور امریکی اخبار New York Tribune, Oct 1921 میں صفحہ نمبر 3 پر بھی ہے۔ وہ عورتوں کی تنظیم راشٹریہ استری سبھا کی سب سے فعال رکن تھیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آزادی کی اتنی اہم ایک نہیں تین مسلم مجاہداؤں کو بھلا دیا گیا۔ براہِ کرم اس پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ پاکستان میں انھیں بہت تکالیف دی گئیں کیونکہ ان کے شوہر نور محمد کا ایک سرکاری افسر سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ تو ایسے فرماں بردار شوہر تھے گویا وہ بیوی ہوں اور عطیہ شوہر۔

پروفیسر موہن سنگھ

سابق شعبۂ انگریزی، خالصا کالج، امرتسر، پنجاب

ممبئی کی فلم نگری ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور مختلف قوموں کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے جس سے فرقہ واریت کو ہوا دینے والوں کو سبق لینے کی ضرورت ہے۔ فلموں کے لیے زیادہ تر بھجن کی تخلیق مسلم شعرا نے کی ہے جو چونکانے والی بات ہے۔ بھجن کو مسلم موسیقار نے ترتیب دیا اور مسلم گلوکار نے نغمہ سرائی کی ہے۔ خیام اور جگ جیت کور کی خوشگوار ازدواجی زندگی، مشترکہ تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ 'اردو دنیا' اور اس کے ادارتی عملے کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے یوم آزادی پر خصوصی شمارے میں ان کا انٹرویو شائع کیا۔ دنیا کے قارئین کے لیے ان دونوں کی تصویر ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں انگریزی زبان کی کلاس میں 'رحیم خاں' کو پڑھایا کرتا تھا جو آج بھی پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ کے نصاب میں شامل ہے۔ اردو دنیا کے جون کے شمارے میں خواجہ احمد عباس کا مشہور زمانہ افسانہ 'ابابیل' پڑھ کر میں ماضی کے دریچوں میں کھوگیا۔ خواجہ احمد عباس کے خصوصی گوشے کی اشاعت پر پھر مبارکباد!

معین الدین شمسی

حاجی جمیل احمد روڈ بھنڈار یڈیہہ، گریڈیہہ

'اردو دنیا' ماہ جون 2014 اور جولائی 14 ایک ساتھ دستیاب ہوئے۔ ماہ جون کا سرورق خواجہ احمد عباس کے دیدہ زیب فوٹو سے آراستہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس شمارے میں گزشتہ شماروں کی طرح بے پناہ خوبیوں کے علاوہ ازحد معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ بالخصوص خواجہ احمد عباس کا گوشہ شمارہ کی روح ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر اختر الواسع کی ملاقاتیں پرلطف دلچسپ اور بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جناب ارشاد احمد انصاری کے مضمون 'اردو کا ہمہ جہت فنکار خواجہ احمد عباس' بار بار پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جناب شکیل دسنوی کی رحلت ادبی دنیا کے لیے بڑا خسارہ اور نقصان کی بات ہے۔ جولائی 14 کا 'اردو دنیا' ماشاء اللہ خوب ہے۔ ٹائٹل صفحہ پر لال قلعہ، تاج محل، جامع مسجد کے علاوہ چند اہم منادر کی تصاویر کے ساتھ 'اردو اور ہندوستانیت' نوشتہ دیکھ کر قاری ضرور اترانے لگے ہوں گے۔ شمارے کے جملہ مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بلاشبہ اردو زبان و ادب کے قیمتی اثاثے کی حفاظت اور اس کی تہذیبی روایات کی پاسداری اردو والوں کا عین فریضہ ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ماہنامہ 'اردو دنیا' کما حقہٗ کوشاں ہے۔

■

خواجہ محمد اکرام الدین

صوبائی اردو اکادمیاں بھی اردو تعلیم کے فروغ کے لئے کام کریں!

اطہر فاروقی

انجمن ترقی اردو (ھند) کے جواں سال جنرل سکریٹری اطہر فاروقی وہ پہلے اسکالر ھیں جنھوں نے اردو زبان و تعلیم کے مسائل کا سنجیدہ علمی موضوع کے طور پر تجزیہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر علمی توانائی وقف کردی ھے۔ متعدد علمی مضامین اور اخباری کالموں کے علاوہ ان کی دو کتابیں Redefining Urdu Politics in India اور Muslim & Media Images آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس سے شائع ھونے والی نہایت کامیاب مطبوعات کے ذیل میں آتی ھیں۔ انھیں اردو ترجمے کا ساھتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ھے۔ بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے بھی مالک ھیں اور اسی لیے، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کے طور پر ان کا انتخاب نہ صرف استصواب سے ھوا بلکہ اردو دنیا میں اس فیصلے کی پذیرائی بھی ھوئی۔ فاروقی صاحب 2008-11 تک قومی اردو کونسل کے ایگزیکٹو بورڈ کے رُکن اور کنوینر بھی رھے۔ انجمن ترقی اردو (ھند) اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ھندوستان کے دو سب سے بڑے ادارے ھیں۔ انجمن، اس لحاظ سے کہ یہ اردو کی سب سے پرانی (ایک سو گیارہ سال پرانی) تنظیم ھے اور قومی اردو کونسل، ملک کا سب سے بڑا اردو ادارہ اس لیے ھے کہ اس کا دائرۂ عمل ملک گیر ھے۔ اس لیے ایک بڑے ادارے کے سربراہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے خود 'اردو دنیا' کے لیے دوسرے بڑے ادارے کے سربراہ ڈاکٹر فاروقی سے ایک خصوصی گفتگو کی جس کے اہم اقتباس یہاں پیش ھیں۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین: انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سکریٹری بننے کے بعد آپ اس امر پر مسلسل زور دیتے رہے ہیں کہ اردو تحریک کا احیا اب ماضی کے طرز پر ناممکن ہے اور تبدیل شدہ حالات میں اردو کے فروغ کے لیے انجمن کو ایک نیا لائحۂ عمل مرتّب کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا اردو دنیا کے قارئین کے لیے آپ اپنے دلائل کی وضاحت فرمائیں گے؟

اطہر فاروقی: اردو کی دنیا میں اردو تحریک کی اصطلاح ایک کلیشے (Cliche) بن گئی ہے جس کا کوئی واضح تصور کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ دراصل یہ اصطلاح ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقا کی اس کامیاب ترین تحریک کے بعد رائج ہوئی جس کا مقصد اتر پردیش میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں بہ یک جنبشِ قلم اردو تعلیم کے درہم برہم نظام کا احیا اور اردو کو اُس کا حق (Legitimacy) دلانا تھا۔ تحریک کے عمائدین کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ اردو تعلیم کا فقدان اردو زبان کی تباہی کا سبب اس لیے بن جائے گا کیوں کہ دنیا کی تمام بڑی زبانیں —اور خود اردو بھی— اسی لیے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں کیوں کہ وہ باقاعدہ تعلیم سے جڑی ہوئی تھیں۔ اتر پردیش اُس وقت کے لحاظ سے اور آج بھی اردو کا سب سے اہم صوبہ اور اردو آبادی کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس لیے، یہ تحریک، اتر پردیش میں چلی جس میں 20 لاکھ 50 ہزار لوگوں کے دستخط پر مشتمل ایک محضر صدرِ جمہوریہ ہند کو 15 فروری 1954 کو ساڑھے چھے بجے پیش کیا گیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ہردے ناتھ کنزرو، اوما نہرو، علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی، مولانا حفظ الرحمن، پنڈت سندر لال، حیات اللہ انصاری، کرشن چند، پنڈت کشن پرساد کول اور قاضی عبدالغفار شامل تھے۔

اس محضر پر دستخط کرنے والی اردو آبادی کے 20 لاکھ 50 ہزار لوگوں نے اپنے گھر میں ان بچوں کی تعداد بھی بتائی تھی جو پرائمری اور سکنڈری سطح کی تعلیم حاصل کرنے کی عمر کے تھے اور اس وقت یہ تعداد ساڑھے بائیس لاکھ تھی۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد بتانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے اسکول کے نظام میں اردو تعلیم کے منقطع اسکولوں کو استوار کیا جائے۔ اتنی بڑی تعداد میں دستخط جمع کرنے کی مہم ظاہر ہے کہ اردو کی اہم ترین تحریک تھی۔ یہ تحریک انجمن ترقی اردو (ہند) کے پلیٹ فارم سے چلائی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت انجمن کے صدر تھے یوں انجمن اور اردو تحریک ایک دوسرے کے ہم معنی بن گئے۔ یوپی میں ہی نہیں ہندستان بھر میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں جن کی تعداد 650 تک پہنچ گئی مگر اس کے بعد یہ تحریک عملاً اس لیے تحلیل ہوگئی کیوں کہ اس وقت کی اردو قیادت اور خود ملک کے وزیرِ اعظم کے طور پر جواہر لال نہرو اردو مخالفین کے سامنے خود کو بے بس

پاتے تھے۔ انجمن علی گڑھ منتقل ہوگئی جہاں یہ عملاً علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا حصہ بن کر رہ گئی اور بالعموم اردو شعبے کا سربراہ انجمن کا بھی سربراہ بن جاتا تھا جس کی دل چسپیاں دوسرے قسم کی ہوتی تھیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی قائدانہ صلاحیتیں کسی کے پاس نہ تھی۔ انجمن کا ہفت روزہ ترجمان 'ہماری زبان' ایک تحریک کا ترجمان بننے اور اس کے فروغ میں معاون ہونے کے بجائے ایک علمی پرچہ بن کر رہ گیا اور جب 1977 میں علی گڑھ سے انجمن دہلی منتقل ہوئی تو اردو تحریک کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اکثر شاخیں یا تو بند ہوگئی تھیں یا پھر خود مختار۔ انجمن کی کروڑوں روپے کی املاک پر خصوصاً جنوبی ہند میں مفاد پرستوں نے قبضہ کرلیا۔ ہمارے صحافیوں کی نظر اس پیچیدہ ترصورتِ حال کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہی اور اردو تحریک کا نعرہ لگانے والا ہر شخص انجمن سے اسی قسم کی تحریک کی توقع بغیر سوچے سمجھے کرتا رہا جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے شروع کی تھی۔ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ تبدیل شدہ حالات میں انجمن اب وہ رول ادا نہیں کرسکتی جو اس نے 65 برس پہلے کیا تھا۔ یقیناً انجمن تبدیل شدہ حالات میں بہتر رول ادا کرسکتی ہے، اردو کے فروغ کے لیے تبدیل شدہ حالات میں نئے اور وقت سے ہم آہنگ کام کرسکتی ہے مگر اب وہ اس تحریک کا رول ادا نہیں کرسکتی جس کا ہیولا اردو والوں کے ذہن میں ہے۔ ویسے بھی جسے ہم اردو تحریک کہتے ہیں اس کا کوئی نتیجہ اس لیے نہیں نکلا کیوں کہ اردو کے خلاف فضا عام تھی۔ اب حالات 1952 کے مقابلے مختلف ہیں۔ یقیناً بہت بہتر ہیں، اس لیے، اب اردو والوں کو بھی انجمن کے سیاق وسباق میں نئی طرح سے سوچنا ہوگا۔

خ م ا: آپ کی بات صحیح ہے کہ جب اسکول کی سطح پر شمالی ہند میں اردو تعلیم کا نظام درہم برہم ہوگیا اور اردو رسم خط جو اردو کے وجود کی ضمانت تھا اور ہے، اس کے تحفظ کے لیے دینی مدارس آگے آئے اور انھوں نے یہ کام بہ حسن وخوبی کیا تو ظاہر ہے کہ ماضی کے تمام فارمولے بے اثر ہوگئے۔ اب جب کہ دینی مدارس اردو کے اہم قلعوں میں تبدیل ہوچکے ہیں، ضرورت اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کے نظام کے احیا کی ہے۔ اس پس منظر میں اردو تعلیم کے نظام کے احیا کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تدابیر ہیں؟

اطہر فاروقی: دینی مدارس کے سلسلے میں ایک اہم بات تو یہ ہے کہ دینی مدارس کے اپنے مقاصد تھے اور ہیں جو مذہب کے تحفظ اور مذہبی تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں۔ تقسیم کے وقت علما کی بڑی تعداد بھی پاکستان ہجرت کر گئی اور دینی مدارس کی سماجیات تبدیل ہوگئی۔ دینی مدارس میں بھی ایسے اساتذہ کی تعداد کم سے کم رہ گئی جو عربی کے ذریعے درسِ نظامی پڑھا سکیں، اس لیے، اردو دینی مدارس کا ذریعۂ تعلیم بن گئی۔ دینی مدارس کے اساتذہ میں فارسی سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بھی تقریباً معدوم ہوگئی۔ اب بڑے سے بڑے دینی مدارس کے اساتذہ فارسی سے کم وبیش ناواقف ہی ہیں۔ دینی مدارس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اردو رسم خط کے تحفظ میں تو اہم رول ادا کیا مگر اردو ادب کے فروغ کے لیے کچھ بھی اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان کے ایجنڈے میں شامل ہی نہیں تھا۔ دینی مدارس سے اردو ادب کے فروغ کی توقع کرنا بھی بے جا ہی ہے۔ قدیم اردو معاشرہ جن صالح اقدار کا امین تھا اس کی تشکیل میں اردو اور فارسی ادب کا اہم رول تھا۔ تقسیم کے بعد ہمارے معاشرے میں ادب کی جگہ مذہب نے لے لی یوں معاشرے کی نفسیات ہی تبدیل ہوگئی۔

بات صرف انجمن کی نہیں ہے۔ اردو کے ہر ادارے کو اس بات کی تشہیر کرنی ہوگی کہ اردو والے ہر وہ ممکن کام کریں جس سے پرائمری اور سکینڈری سطح کے اسکولوں میں اردو تعلیم کا

> **اردو اکادمیوں کے فرائض میں اردو تعلیم شامل ھی نہیں ھے، اس لیے اردو والوں کو اب یہ تحریک چلانی چاھیے کہ صوبائی اردو اکادمیاں بھی اردو تعلیم کے فروغ کے لیے کام کریں اور یہی در اصل ان کا سب سے اہم کام ہونا چاہیے۔**

نظم ذریعۂ تعلیم اور اردو مادری زبان والے بچوں کے لیے زبانِ اول کے طور پر ہوسکے۔ اردو اکادمیوں کے فرائض میں اردو تعلیم شامل ہی نہیں ہے، اس لیے اردو والوں کو اب یہ تحریک چلانی چاہیے کہ صوبائی اردو اکادمیاں بھی اردو تعلیم کے فروغ کے لیے کام کریں اور یہی در اصل ان کا سب سے اہم کام ہونا چاہیے مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صوبائی حکومتیں اردو تعلیم کو اردو اکادمیوں کے دائرۂ اختیار میں شامل نہ کریں۔ پرائمری اور سکینڈری سطح کے اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم ہی اردو کے ہمہ جہتی فروغ کا ضامن ہے۔ قومی اردو کونسل کو بھی صوبائی حکومتوں کو خط لکھ کر ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانی چاہیے کہ وہ اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کے نظم کو اردو اکادمیوں کے دائرۂ کار میں لائیں۔ اس اہم مدعے پر تو قومی اردو کونسل کو تمام اردو اکادمیوں اور اردو تعلیم کے فروغ میں دل چسپی رکھنے والے اداروں کی ایک کانفرنس بھی منعقد کرنی چاہیے جس کا ایک نکاتی ایجنڈا یہ ہو کہ اردو کس طرح اردو اکادمیوں کے دائرۂ کار میں شامل ہو۔

خ م ا: آپ کے انجمن میں آنے کے بعد اردو دنیا کی توقعات بہت بڑھ گئی ہیں جو کسی بھی ادارے کے سربراہ کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے 'ہماری زبان' کے مندرجات کو انقلابی طور پر تبدیل کیا ہے اور اب اس میں اردو زبان اور تعلیم کے موضوع پر مضامین اور اردو دنیا کی خبروں نے غالب رجحان کی شکل لے لی ہے۔ آپ نے داراشکوہ اور مشترکہ تہذیب میں اردو کے رول پر جو دو بین الاقوامی سمینار کرائے وہ بھی اپنا جواب آپ تھے۔ انجمن کے ذریعے غیر مسلم سیکولر دانش وروں کو اردو کی حمایت میں منظم کرنے کی کوشش بھی آپ نے کی ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کے مستقبل کا لائحۂ عمل یا یوں کہیں کہ انجمن کے ذریعے اردو کے فروغ کا لائحۂ عمل کیا ہے، 'اردو دنیا' کے قارئین کو یہ جاننے میں بہت دل چسپی ہوگی۔

اطہر فاروقی: سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ان حالات کے تابع جن کا ذکر میں نے کیا، انجمن قومی منظرنامے سے غائب ہوگئی۔ اس کے اراکین میں اردو کے خیر خواہ غیر مسلم حضرات کی تعداد نہیں کے برابر رہ گئی۔ ایسے میں کرنے کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ کم سے کم قومی سطح پر اردو کے اہم ترین رضاکار ادارے کے طور پر انجمن سے لوگ واقف ہوں جس کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے اور آج کم سے کم انجمن کے نام سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کی ادب اور ثقافت کے مسائل سے کچھ بھی دل چسپی ہے خواہ اس کی زبان کوئی بھی ہو۔

انجمن کو انفارمیشن ٹیکنولوجی کے ذریعے علمی دنیا سے جوڑنے کی ہر ممکن کوشش بھی ہم کررہے ہیں جس میں rekhta.org کے ذریعے انجمن کی لائبریری کو انجمن کی ویب سائٹ پر لانے کا اہم ترین منصوبہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق انجمن کی لائبریری میں تقریباً پچاس ہزار نایاب کتابیں اور مخطوطات ہیں جن میں بعض مخطوطات 600 سے 800 برس پرانے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ دو برسوں میں انجمن کی مکمل لائبریری انجمن کی ویب سائٹ پر دستیاب ہوگی۔

انجمن جیسے ادارے میں جس کے پاس حکومت کی براہِ راست یا بالواسطہ کوئی مدد نہیں ہے، جنرل سکریٹری کے وقت کا بڑا حصہ انتظامی امور میں گزر جاتا ہے۔ مجھے بھی گزشتہ دو برسوں میں کئی ایسے اہم مسائل سے نمٹنا پڑا جن سے نبرد آزما ہونا مشکل ہی تھا۔ یہ مسائل نئے ٹیکسیشن (Taxation) اور انجمن کے کرایے داروں سے متعلق تھے، اس لیے، انجمن کو ایک مثالی ادارہ بنانے میں کافی وقت لگے گا اور یہ کام اردو والوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔

■

Prof. Khwaja Mohd Ekramuddin, Director, NCPUL, New Delhi - 110025

امتیاز وحید

سری نگر، کتاب میلہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کی ایک نوڈل ایجنسی ہے، جو 1996 سے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں مصروف عمل ہے۔ کتابوں کی اشاعت اور اس کا فروغ کونسل کے بنیادی اہداف کا حصہ ہے، جس کے تحت یہ ادارہ ملک کے طول وعرض میں نمائش کتب کا اہتمام کرتا ہے اور علم وآگہی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کتابوں کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کی مختلف فلاحی اسکیموں کے تحت اردو زبان کے قلم کاروں، ریسرچ اسکالرس اور بہی خواہان کو مالی تعاون فراہم کیا جاتا ہے تاکہ اردو زبان میں علم وآگہی کا فروغ ہو اور زیادہ سے زیادہ اہل علم اس زبان کو ترقی دینے میں اپنا تعاون پیش کرسکیں۔ اپنے اشاعتی مقاصد کی تکمیل میں یہ ادارہ اردو زبان میں خود بھی طباعت کا نظم کرتا ہے۔ اس حوالے سے اس کی حیثیت اردو زبان وادب کی کتب کے ایک بڑے ناشر کی بھی بنتی ہے، جس کے پاس سردست 1153 اردو ٹائٹل ہیں۔ ادبیات، انسائیکلو پیڈیا ولغات، تاریخ تعلیم وتدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک و جغرافیہ، سماجیات، سیاست، صحافت، طب ومعالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری وکتابیات، معاشیات وتجارت، نفسیات، بچوں کا ادب، ایسوسی ایٹیڈ ٹکسٹ بک (جدید ریاضی، جدید تاریخ، حیوانیات، کیمیا، کامرس، طبعیات، طبعی جغرافیہ، علم شہریت، نباتات، معاشیات، تاریخ اور جغرافیہ) موضوعات پر محیط کونسل کے پاس اردو زبان میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جس کے ساتھ اس کی موبائل وین اردو آبادی کو ہدف بناکر ملک کی ریاستوں میں عام قاری تک کتابیں پہنچاتی ہے اور نمائشِ کتب کا اہتمام کرتی ہے۔ کتاب میلہ کا انعقاد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا اہتمام چھوٹے اور بڑے پیمانے پر ہر سال ملک کے مختلف مقامات پر کیا جاتا ہے۔ اب تک کونسل نے 18 کتاب میلوں کا انعقاد کیا ہے، جس میں اس کی قیادت میں اردو زبان کے سرکردہ کتب فروشوں، ناشرین اور اداروں نے حصہ لیا ہے اور علم وآگہی کے اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھایا ہے۔ جنوری 2014 میں مالیگاؤں اردو کتاب میلہ خریدارئ کتب اور میلے میں شائقینِ کتب کی شرکت کے اعتبار سے کونسل کی قیادت میں منعقد ہونے والا اب تک کا سب سے کامیاب کتاب میلہ ہے۔

23 تا 31 اگست 2014 سری نگر کشمیر میں منعقد ہونے والے کتاب میلے کی نوعیت اس اعتبار سے قدرے مختلف تھی کہ اس کی زمام کار حکومت ہند کے ایک دوسرے بڑے اشاعتی ادارے نیشنل بک ٹرسٹ کے ہاتھوں میں تھی۔ کسی کتاب میلے میں معاون شریکِ کار کے طور پر شرکت کرنے کا، یہ کونسل کا، نیا تجربہ تھا۔ این بی ٹی کے ساتھ معاون کی حیثیت سے گرچہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ڈسٹرک اڈمنسٹریشن، سری نگر اور فیڈریشن آف پبلشرز اینڈ بک سیلرس اسوسی ایشن اِن انڈیا کا اشتراک بھی تھا مگر کتاب میلے میں قومی کونسل کی حیثیت کئی پہلوؤں سے نمایاں رہی۔ کونسل کے پاس اردو کتابوں کا ایک بڑا سرمایہ ہے اور اردو ریاست جموں وکشمیر کی دفتری اور عوامی رابطے کی زبان ہے۔ لہٰذا تعلیمی اداروں کے ساتھ کونسل کا بک اسٹال ہر خاص وعام کی دلچسپی کا محور بنا رہا۔ میلے میں منعقد ہونے والے ثقافتی پروگراموں میں قومی کونسل نے قائدانہ رول ادا کیا اور جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، اے آر آزاد میموریل فاؤنڈیشن، جموں وکشمیر اردو کونسل اور اقبال ہائی اسکول سری نگر کے ساتھ مشترکہ طور پر کئی ثقافتی، ادبی، صحافتی اور اسکولی سطح پر مقابلہ جاتی پروگراموں کا انعقاد کیا۔ اس طرح کونسل نے اپنے کلچرل پروگراموں اور سرگرمیوں کے ذریعے اردو زبان اور اردو تہذیب وثقافت کو نمایاں طور پر فروغ دینے کی کامیاب کوشش کی۔

سری نگر کتاب میلے کے باقاعدہ افتتاح سے قبل 22 اگست 2014 کو امپیریل ہوٹل سری نگر میں نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتھ معاون شریک کار اداروں کے ذمے داروں نے میڈیا اور صحافیوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں کتاب میلے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی، جس میں منتظم ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سکندر، پریس انفارمیشن بیورو، سری نگر کے سربراہ جناب عبید عثمانی اور ریاست جموں و کشمیر کے سرکردہ اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ اس موقعے پر این بی ٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سکندر نے واضح کیا کہ سری نگر میں اس کتاب میلے کی شروعات تقریباً دس سال پہلے چند

مقامی کتب فروشوں اور نیشنل بک ٹرسٹ کی مشترکہ کوششوں سے ہوئی تھی، جس میں صرف چند اسٹال ہی لگائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی مقبولیت بڑھی ہے۔اس بارہمیں قومی کونسل جیسے اردو زبان کے بڑے ادارے کا تعاون حاصل ہے اورہمیں بہترنتائج کی امید ہے۔کتابی میلے سے بھر پوراستفادہ کی بات کرتے ہوئے کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب شہنواز خرم نے وہاں موجودصحافیوں اورعوام سے یہ جاننے کی درخواست کی کہ عوام بتائیں کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔آپ کی تجاویز اور مشورے کیا ہیں۔آپ کو کس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا ادارہ اس جانب متوجہ ہواور ہم بہتر طور پر آپ کی کتابی ضرورتوں کی تکمیل کرسکیں۔

کتاب میلے سے قبل این بی ٹی اور قومی کونسل کے ذمے داروں نے سری نگر کا دورہ کیا اور کتاب میلے سے متعلق دستیاب سہولیات، امکانی مسائل اور دیگر امور کا جائزہ لے کر شہر کے قلب میں واقع اگزبی شن گراؤنڈ، کشمیر ہاٹ کو کتابوں کے مقام نمائش کے طور پر منتخب کیا اور 23 تا 31 اگست کی تاریخوں کا اعلان کیا۔ ان تاریخوں میں سری نگر کا موسم بھی حدِ اعتدال میں تھا۔کتاب میلے کے شروعاتی دنوں میں دھوپ کی تمازت معمول سے قدرے آ گئے تھی، جس کے سبب وقتاً فوقتاً بارش بھی ہوئی مگراس سے میلے کے معمولات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔میلہ گاہ سے متصل ریاستی اسمبلی میں جاری اجلاس کے سبب بک فیئر میں آنے والوں کو پریشانی ضرور ہوئی تاہم کتاب میلے میں شائقین کتب کی دلچسپی برقرار رہی اور بڑی تعداد میں لوگ روزانہ میلے میں شریک ہوتے رہے۔شائقین کے شوق کے مدنظر میلے کے اوقات میں ایک گھنٹے کا اضافہ بھی کیا گیا۔ واضح ہو کہ سری نگر کتاب میلے میں ریسرچ آفیسر جناب شہنواز خرم کی قیادت میں کونسل سے یومیہ رپورٹنگ کے لیے ڈاکٹر امتیاز وحید اور بک اسٹال انچارج محمد ذاکر کے ہمراہ احتشام اور جیلانی کی پانچ رکنی ٹیم موجود تھی۔ میلے میں کل 60 پبلشروں اور کتب فروشوں نے شرکت کی۔

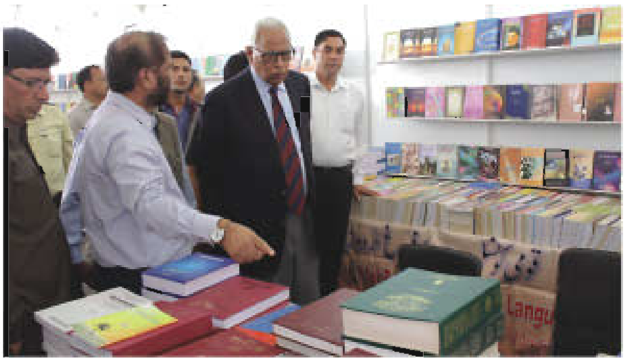

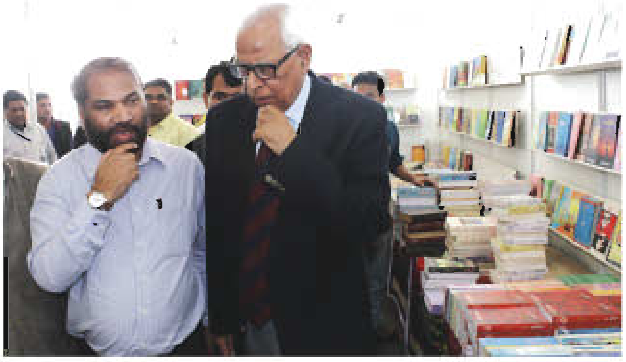

پہلا دن: 23 اگست 2014:

نیشنل بک ٹرسٹ کے زیراہتمام سری نگر کتاب میلے کا افتتاح ریاست کے گورنرعزت مآب جناب این این ووہرا کے ہاتھوں صبح 11:30 بجے کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں جناب طارق حسین غنی، ڈائرکٹر ہینڈی کرافٹ، جناب فاروق شاہ، ڈی سی نگر، اشوک ٹھاکر، سکریٹری ہائر ایجوکیشن آف انڈیا، جناب شفیع شوق، شاعر اور قلم کار، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور فیڈریشن آف بک آف انڈیا کے صدر جناب ایس، سی، سیٹھی صاحبان موجود تھے۔

تقریب کا آغاز اقبال اسکول کی بچیوں کے پرسوز ترانۂ کشمیر کے ساتھ ہوا۔ این بی ٹی کی روایت کے مطابق ڈائرکٹر این بی ٹی نے مہمانانِ ذی وقار کو این بی ٹی کی کتابوں کے سیٹ کا تحفہ پیش کیا۔ این بی ٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سکندر نے تمام شرکا، ریاست کے گورنر عزت مآب جناب این این ووہرا اور جملہ مہمانان کا استقبال کیا۔انھوں نے سری نگر میں 2011 میں این بی ٹی کے ذریعے ایک کتاب میلے کے انعقاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے ایک بڑے کتاب میلے کے انعقاد کا تقاضا کیا گیا تھا،لہٰذا اس وقت ہم نے اردو کے بڑے اداروں اور مقامی پبلشروں کے ساتھ اس کتاب میلے کا انعقاد کیا ہے۔ یہ محض ایک کتاب میلہ نہیں بلکہ کتابوں کا ایک تہوار ہے۔ ہم کتب بینی کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے 1957 میں وجود میں آنے والے حکومتی ادارہ این بی ٹی کے قیام اوراغراض ومقاصد پر بھی روشنی ڈالی۔انھوں نے یہ اطلاع بھی دی کہ ہمارے ادارہ نے حال ہی میں کشمیری زبان میں 16 کتابیں شائع کی ہیں جبکہ سردست 15 کتابیں زیرطبع ہیں۔فیڈریشن آف بک آف انڈیا کے صدر جناب ایس، سی، سیٹھی نے کہا کہ خطۂ کشمیر کو روئے زمین کی جنت کہا جاتا ہے۔ہم تعلیمی اعتبار سے بھی اس خطے کو جنت بنتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہر ماں باپ کم ازکم ایک کتاب اپنے بچے کو خرید کر ضرور دیں۔ یورپ میں تہواروں اور تقریبات کے موقع پر کتابوں کا تحفہ دینے کا کلچر ہے۔

اس کتاب میلے کے ایک اہم معاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کتابوں کی اہمیت اجاگر کی اور کتابوں کو ماضی، حال اور مستقبل کا اشاریہ بتایا۔انھوں نے مزید کہا کہ جب طباعت اور اشاعت کی سہولتیں مہیا نہیں تھیں اس زمانے میں بھی کشمیر علم وآگہی کا مرکز تھا۔قدیم قلمی مخطوطات کا تعلق بجا طور پر خطۂ کشمیر سے رہا ہے۔ ہر مذہب میں کتابوں کی بڑی معنویت ہے، جو آخرت کے نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہے۔لیکن اس دنیا کو تسخیر کرنے کے لیے جو علوم وفنون اور کتابیں درکار ہیں، وہ اس کتاب میلے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔انھوں نے مالیگاؤں کے اپنے تجربات کا ذکر کیا اور خوش گوار حیرت کا اظہار کیا کہ اہالیانِ مالیگاؤں نے 83 لاکھ کی کتب کی خریداری کے ساتھ ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس

موقع پر ڈی سی سری نگر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور این بی ٹی کو مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ تقریب کے اس موقع پر کشمیر کے معروف شاعر اور قلم کار جناب شفیع شوق، جناب طارق، ڈائرکٹر ہینڈی کرافٹ سری نگر حکومت جموں اور کشمیر اور سکریٹری اعلی تعلیم، مرکزی حکومت جناب اشوک ٹھاکر صاحبان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ممکن حکومتی تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

عزت مآب گورنر ریاست جموں کشمیر جناب این این دوہرا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نوع کے کتاب میلے پر آنے والے اخراجات میں کمی کرنے کی بات کہی اور اس بقیہ رقم سے خریداروں کو ممکنہ رعایت دینے کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ تہذیب کی بنیاد علم ہے۔ اس کو نہ صرف ایک تجارت سمجھا جائے بلکہ کتب کی اشاعت اور اس پوری صنعت کو آئندہ نسل کی بنیاد مستحکم کرنے کا ذریعہ خیال کیا جائے۔ کتاب کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ ایک کتاب سے 4 یا 5 نسلیں استفادہ کرسکتی ہیں۔ تقریب کا اختتام جناب ہارون صاحب کے اظہار تشکر پر ہوا۔

دوسرا دن: 24، اگست 2014:

دوسرے دن میلہ وقت مقررہ صبح 10:30 سے شروع ہوا، اسکولی بچوں، اساتذہ اور کتابوں سے محبت کرنے والوں کی خاصی تعداد میلے میں دیکھی گئی۔ نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے اسکولی بچوں اور نوجوانوں کے لیے مصوری اور کہانی لکھنے کے ایک مقابلے کا انعقاد کیا گیا، جس میں مقامی اسکولوں سے تقریباً سو سے زیادہ طالب علموں نے شرکت کی اور اس انعامی مقابلے سے لطف اندوز ہوئے۔

ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر نے مشترکہ طور پر محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا، جس میں پروفیسر نذیر آزاد، پروفیسر شفق سوپوری، جناب عادل اشرف، جناب ساغر سلیم، جناب سلطان الحق شہیدی، جناب رفیق راز، محترمہ سلطانہ جبیں، محترمہ شبنم عشائی، جناب عنایت گل، جناب فاروق نزکی، جناب پرویز مانوس، ڈاکٹر راشد عزیز، جناب ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج، اقبال فہیم، شعیب رضوی، علی شیدا، زاہد مختار، مقبول ویرے، علی احسن اور جناب عزیز ارشاد نے شرکت کی اور اپنے کلام سے نوازا۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر الطاف انجم کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر کی جانب سے تمام شرکا اور شعرائے کرام اور خواتین شاعرات کا محفل مشاعرہ میں پر جوش استقبال کیا اور اسے خوشی اور تاریخی اعتبار سے یادگار لمحہ بتایا۔ اس موقعے پر اے آر آزاد میموریل فاؤنڈیشن کے چیرمین جناب شکیل آزاد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور فاؤنڈیشن کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔

تیسرا دن: 25، اگست 2014:

کتاب میلے کا تیسرا دن سری نگر اور بیرون شہر کے اسکولی بچوں، اساتذہ اور کتابوں سے محبت کرنے والے شرکا کی تعداد کے اعتبار سے حوصلہ افزا رہا۔ ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر نے اردو ادب کی معروف ترین شخصیت پروفیسر جناب غلام نبی خیال اور بزرگ قلم کار جناب نور شاہ صاحبان کی صدارت میں مشترکہ طور پر 'محفل افسانہ' کا اہتمام کیا۔ یہ پروگرام دوپہر 3 بجے شروع ہوا، جس میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر ریاض توحیدی، جناب وحشی سعید، جناب طارق شبنم، جناب راجہ یوسف، ناصر ضمیر،

کونسل کے پیپر معاشی سنٹر کی اشیا کی نمائش

سری نگر کتاب میلہ میں 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی' کے تحت ریاست جموں وکشمیر میں چلنے والے پیپر معاشی کے سیدہ کدل سنٹر نے کونسل کے بک اسٹال کے متوازی پیپر معاشی کے دلکش نمونوں پر مشتمل ایک نمائشی اسٹال لگایا، جو شرکائے میلہ اور شائقین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اسٹال پر سنٹر کے استاد جناب امتیاز علی بذات خود موجود رہے اور اسٹال پر آنے والے ناظرین کو اس صنعت پر سیر حاصل معلومات فراہم کرتے رہے۔ واضح ہو کہ پیپر معاشی تقریباً 7 سو سال قدیم ترین صنعت ہے، جسے میر سید علی ہمدانی اپنے ہمراہ 'ہمدان' ایران سے لائے تھے۔ ابتداً اس کا دائرہ صرف 'قلم دان' بنانے تک محدود تھا، جسے کاغذ کو کوٹ کر بنایا جاتا تھا اور شعرا، ادبا، امرا اور بادشاہوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ وہیں سے اس آرٹ نے فن تعمیر میں اپنا عمل دخل شروع کیا اور تاریخی عمارتوں، خانقاہوں، مساجد اور معابد کے در و دیوار اور چھتوں میں نقش نگار کی صورت میں عیاں ہوا، جس کے واضح نقوش اب بھی پائے جاتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال خطوط لکھنے کے کاغذ کی سجاوٹ، شال بافی، قالین بافی سے ہوتا ہوا اشیائے ظروف پر نقاشی، گہنہ رکھنے کے باکس کی سجاوٹ، منقش فرنیچر، دیواروں پر پوسٹ اور خوبصورت وال پلیٹ کی صورت میں ہونا شروع ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ پیپر معاشی صنعت نے اپنے دائرہ کار کو وسعت دی اور اب عالم کاری کے اس دور میں اس کے جوبن پر مزید نکھار آنا شروع ہوگیا ہے۔ اس کا نہ صرف کینوس وسیع تر ہوتا جارہا، جس کے دامن میں نئے امکانات جنم لے رہے ہیں بلکہ نقش ونگار کی سرحد سے میلوں دور چل کر یہ صنعت مصوری کو بھی اپنے دامن میں سمو رہی ہے، جس میں عہد قدیم کی معاشرت، حکومت، نابغۂ روزگار شخصیات، جنگلات کے مناظر، خطاطی کے نادر نمونے، آیات، اشعار، رنگ برنگے قدرتی پھول، معصوم دلکش پتیاں اور اس جیسی انواع واقسام کی چیزوں کے ساتھ دور جدید کی زندگی میں مستعمل جیومیٹریکل ڈیزائن، مہندی ڈیزائن اور شال ڈیزائن کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اس قدیم ترین صنعت اور اس میں روزگار کے امکانات کا ادراک کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے وادیِ جموں وکشمیر میں اپنے تین مراکز قائم کیے ہیں۔ 'السا آرٹس'، عالم گیری بازار سری نگر اور 'آبرو سوسائٹی، بیمنا'، عالم گیری بازار سری نگر اور 'سیدہ کدل پیپر معاشی سنٹر'، کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ڈائرکٹوریٹ آف لائف لانگ لرننگ (DLL) مصروف کار ہے۔ یہ تمام مراکز کشمیر یونیورسٹی کے DLL شعبہ کے توسط سے کام کررہے ہیں۔ ہر سنٹر میں بیک وقت 40 طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت کی گنجائش ہے، جن کی تعلیم پر فی سنٹر 2 اساتذہ مامور ہیں۔ یہ 6 ماہ کا کورس ہے۔ جس کی تکمیل پر طلبہ اس صنعت میں دستیاب روزگار سے جڑ سکتے ہیں یا اپنا خود کا روزگار قائم کرسکتے ہیں۔ اس صنعت کو از سر نو تازہ دم کرنے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتھ یونیورسٹی آف کشمیر اور شعبہ ہینڈی کرافٹ ریاست جموں وکشمیر نے جو تعاون دیا اور اس کے فروغ کی عملی راہیں پیدا کی ہیں، وہ حوصلہ افزا ہے۔ توقع ہے کہ یہ صنعت مستقبل میں روزگار کے نئے امکانات کی آماجگاہ ثابت ہوگی۔ اس موقع پر قومی کونسل کے پیپر معاشی اسٹال پر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ڈائرکٹوریٹ آف لائف لانگ لرننگ (DLL) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر غلام حسن میر نے بھی پیپر معاشی کے پیشہ پر حوصلہ افزا باتیں کیں اور پہلے مرحلہ میں خطہ جموں کشمیر کو اپنا ہدف بتاتے ہوئے ریاست کے کونے کونے میں اس صنعت کو عام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ ان کے بموجب یہ امکان کا سیکٹر ہے، جہاں نئی نسل کے لیے روزگار کے نئے مواقع دستیاب ہیں۔

کتاب میلے کے موقع پر منعقدہ مختلف پروگراموں کے مناظر

اشرف آثاری اور نکہت نظر نے شرکت کی اور افسانے پڑھے۔ وادی کشمیر کے معروف فکشن نگار جناب راجہ یوسف (محمد یوسف بٹ) نے 'کال بل' کے عنوان سے ایک مختصر افسانہ پیش کیا، جسے سامعین نے پورے انہماک اور توجہ سے سنا اور پسند کیا۔ راجہ یوسف 1980 تا حال ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ 1982 سے ایک ادبی رسالہ نکالتے ہیں۔ تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'چیل اور چنار' ابھی زیر طبع ہے۔ وادیِ کشمیر باندی پورہ سے تعلق رکھنے والے جناب طارق شبنم نے عہد حاضر کے حالات و واقعات پر مشتمل اپنا طبع زاد افسانہ 'یادوں کی اُووٹ' پڑھا، جسے سامعین نے کافی سراہا۔ جناب طارق شبنم کا ادبی سفر تقریباً ڈیڑھ دہائی پر مشتمل ہے۔ یہ اخبارات و رسائل میں برابر چھپتے رہتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'گمشدہ شبنم' ابھی زیر طبع ہے۔ وادی کے باہر کے مسائل کے حوالے سے تحریر کردہ افسانہ 'دھند کے مسافر' جناب ناصر ضمیر نے پڑھ کر سنایا۔ یہ افسانہ شاملی مظفر نگر میں فرقہ وارانہ فساد اور مہاجر کی طرح ٹینٹوں میں رہنے والے لٹے پٹے وہاں کے عوام کے درد و کرب کو عیاں کرتا ہے۔ ناصر ضمیر ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور کثرت سے چھپتے ہیں۔ انھوں نے میراجی، منٹو، حبہ خاتون، مجاز، عمر مجید کی سوانحی زندگی پر افسانے تحریر کیے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'کرب زار' ابھی زیر طبع ہے۔ جناب مشتاق احمد وانی نے اپنا افسانہ 'ماں کی عدالت' پڑھ کر سنایا اور کہا کہ افسانہ میں تحریر کردہ کہانی سے کہیں زیادہ آج کی زندگی کی حقیقتیں کرب انگیز ہیں۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر الطاف انجم نے انجام دیے اور پروگرام کی ابتدا میں اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر کے چیرمین نے جملہ سامعین، شرکا اور صدورِ کرام کا استقبال کیا اور شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے فاؤنڈیشن کے نصب العین کے حوالے سے بتایا کہ فاؤنڈیشن کا مقصد وادی میں فنونِ لطیفہ کو فروغ دینا اور عوام میں بیداری لانا ہے۔ پروگرام کا اختتام صدورِ کرام کے اختتامی کلمات پر ہوا۔

چوتھا دن: 26، اگست 2014:

چوتھے دن کا آغاز معمول کے مطابق شائقین کتب کی کثیر تعداد میں شرکت کے ساتھ ہوا۔ ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر نے مشترکہ طور پر 'محفل مذاکرہ' کا اہتمام کیا، جس میں پروفیسر قدوس جاوید کی صدارت میں 'کشمیر میں اردو صحافت: کل، آج اور کل' کے موضوع پر جناب غلام نبی خیال اور 'کشمیر میں اردو صحافت: مسائل و امکانات' کے موضوع پر انگریزی روزنامہ 'Rising Kashmir' کے مدیر ڈاکٹر شجاعت بخاری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ غلام نبی خیال نے کشمیر میں اردو صحافت کے آغاز پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا آغاز بالواسطہ طور پر انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اس وقت ہوا جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں ملک عدمِ تعاون کی تحریک سے گزر رہا تھا اور کشمیر بھی شخصی حکمرانی کے خلاف تحریکِ حریت کے لیے کوشاں تھا۔ اُن دنوں آزادی کے علمبردار مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور شورش کشمیری صاحبان زمیندار، سیاست، انقلاب، کشمیری میگزین اور چٹان اخبارات کے ذریعے تحریک آزادی کی فضابندی میں مصروف عمل تھے۔ انھوں نے بجا طور پر کشمیر کے درد کو محسوس کیا تھا، جس کی نمایاں ترجمانی ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ صحافتی نقطۂ نظر سے انھوں نے 1931 کے بعد کے عہد کو 'خدمت' اور

کتاب میلے کے موقع پر منعقدہ مختلف پروگراموں کے مناظر

'ہمدرد' اخبارات کا عہد بتایا، جن کی باگ ڈور مولانا محمد سعید مسعودی اور پریم ناتھ بزاز کے ہاتھوں میں تھی جو نہ صرف تعلیم یافتہ تھے بلکہ اردو زبان سے بھی کماحقہ واقف تھے۔

اس پروگرام میں وادی کے معروف صحافیوں، ادب نواز طبقے اور شخصیات نے شرکت کی۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر الطاف انجم نے کی۔ اے۔ آر۔ آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر کے چیرمین جناب شکیل آزاد نے جملہ شرکا، معاونین اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔

پانچواں دن: 27، اگست 2014:

ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جموں وکشمیر اردو کونسل اور اقبال ہائی اسکول کی طرف سے مشترکہ طور پر 'اردو یکجہتی کی زبان' کے موضوع پر ایک روزہ بین اسکولی 'محفلِ مباحثہ' کا اہتمام کیا گیا، جس میں سری نگر کے 21 اسکولی طلبہ اور طالبات نے حصہ لیا۔ جج کے فرائض پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر شجاعت بخاری اور جناب ناصر مرزا صاحبان نے اپنے دو معاونین پروفیسر عاشق اور جناب عبدالمجید صاحب کے ساتھ انجام دیے۔ مباحثہ میں اول انعام گلز ہائی اسکول نوہٹہ کی 'انیسہ اسماعیل' نے حاصل کیا، جبکہ لیجینڈ اسکول کے 'زاہد قریشی' کو دوم اور اقبال میموریل اسکول کے 'ایمن قمری' کو سوم انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

شرکا طلبہ اور طالبات نے ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی موجودہ صورت حال پر بھی گفتگو کی۔ ہمیں نہ صرف اس کی آئینی حیثیت پر اصرار ہے بلکہ ہم بجا طور پر اس کے حقوق کے نفاذ کی توقع رکھتے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر نے اردو زبان کی قابل قدر خدمات انجام دیں ہیں۔

پروگرام کی نظامت اقبال اسکول کے روح رواں جناب اقبال صاحب نے کی اور جموں وکشمیر اردو کونسل کے سربراہ جناب جان محمد آزاد نے تمام شرکا اور مہمانان کا استقبال کیا۔ اس موقع پر انعام یافتہ طلبہ طالبات کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے کتابوں کا سیٹ پیش کیا گیا۔

چھٹا دن: 28 اگست 2014:

خریداریِ کتب کے ساتھ کتاب میلے میں ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ اور جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی جانب سے مشترکہ طور پر 'جموں کشمیر میں اردو افسانہ: مسائل اور امکانات' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت نامور صحافی، قلم کار، شاعر اور محقق پروفیسر غلام نبی خیال نے وادی کے بزرگ افسانہ نگار جناب نور شاہ اور فکشن رائٹر جناب وحشی سعید نے کی۔ پروگرام کا آغاز جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے مدیر اعلیٰ جناب محمد اشرف ٹاک کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوا۔ انھوں نے اکیڈمی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی اور شرکائے سیمینار کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قدوس جاوید نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور ریاست کشمیر میں اردو افسانے کے منظر، پیش منظر، موضوعات اور دیگر پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی۔ انھوں نے افسانے کو جینے کا فن بتایا، جو انسان کے باطن کا اظہاریہ ہے۔

موضوع کے حوالے سے سیمینار میں چار مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر عبدالرشید خان نے 'ریاست کے اردو افسانوں میں عصری موضوعات کی نشاندہی' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عصری موضوعات کی معنویت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ادیبوں کے لیے عصری موضوعات کا علم کس قدر ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر سید نکہت فاروق نظر نے 'جموں وکشمیر میں نسائی افسانوی ادب: ایک جائزہ' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور تفصیل سے بتایا کہ وادی میں خواتین افسانہ نگاروں کا سراغ بیسویں صدی کے آخری عرصے سے ملتا ہے، جن میں واجدہ

کتاب میلے کے موقع پر منعقدہ مختلف پروگراموں کے مناظر

تبسم، ترنم ریاض اور نعیمہ احمد مہجور وغیرہ نے بجا طور پر نسوانی مسائل کو ابھارا اور نسوانی اظہارِ تفکر کو قابل اعتنا بنایا، جس کا سلسلہ جاری ہے تاہم انھوں نے ریاستی نسائی افسانوی ادب کے منظر نامے کو مزید وسعت دینے کی اہمیت پر زور دیا۔ 'کشمیر میں اردو افسانہ' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق حیدر نے کشمیر میں اردو افسانہ کے حالیہ منظر نامہ میں ابھرنے والی نئی نسل کی کوششوں کو مستقبل کے لیے خوش آئند بتایا۔ انھوں نے ایم قمر، راجہ نذر بونیاری، م۔م۔صدیق، ایم نسا، غمگین غلام اور وحشی سعید ساحل کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور یہ شکایت بھی کی کہ ادب میں کشمیری قلم کاروں کی کوششوں کا ذکر کم کم ہی کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے وادی میں افسانوی موضوعات میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کو یہاں کے دو اہم افسانہ نگاروں ... آنند لہر اور خالد حسین کے حوالہ سے اہم موضوعات بتایا۔ انھوں نے گزشتہ دو دہائیوں کے دوران خطے میں لکھے گئے افسانوں میں یہاں کے حالات، بحرانی صورت حال، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور نفسیاتی گھٹن کو واضح افسانوی رجحانات کے بطور پیش کیا۔ یہ پروگرام سیمینار میں پیش کیے گئے مقالوں پر مذاکرہ اور مباحثہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

ساتواں دن: 29، اگست 2014:

کتاب میلے میں ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ اور جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے مشترکہ طور پر 'ہم عصر دانشوروں سے ملیے' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت کلچرل اکیڈمی کے سابق سکریٹری جناب محمد یوسف ٹینگ اور پروفیسر قدوس جاوید نے کی۔ پروگرام کا آغاز جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے سکریٹری جناب ہارون رشید صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوا۔ انھوں نے اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور شرکائے سیمینار کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے این بی ٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اقدام کی ستائش کی اور کتاب میلے کو علم دوستی سے تعبیر کیا۔

اس پروگرام میں وادی کے معروف ماہر لسانیات نذیر احمد کی لسانی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر نذیر آزاد نے 'نذیر احمد ملک کی لسانی خدمات' کے موضوع پر ایک پرمغز مقالہ پیش کیا۔ اس پروگرام کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ پروگرام میں بذات خود نذیر ملک موجود تھے اور انھوں نے بھی سامعین کے سامنے لسانیات سے متعلق اظہار خیال کیا۔ لسانیات کے مختلف نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اردو اور مقامی زبانوں کے لسانی دروبست پر بھی گفتگو کی اور سامعین کے سوالات کا جواب دیا۔ پروگرام کا اختتام صدر مجلس کے اختتامی کلمات پر ہوا۔

آٹھواں دن: 30، اگست 2014:

خریدارِ کتب کے ساتھ ثقافتی پروگرام کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ اور جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے مشترکہ طور پر 'محفلِ غزل' کا انعقاد کیا گیا، جس میں کثیر تعداد میں اردو غزل کے شائقین نے شرکت کی اور اس خوبصورت پروگرام سے محظوظ ہوئے۔ پروگرام میں تین فنکاروں نے حصہ لیا۔ پروگرام کے آغاز میں سری نگر کے مقبول فنکار جناب راجہ بلال نے کشمیری زبان میں صوفیانہ کلام پیش کیا۔ پھر یکے بعد دیگرے سری نگر کی محترمہ زاہدہ ترنم اور جموں سے آئے دھرمیش نرگوترہ نے غزل سرائی کی۔ شرکاء اور عوامی دلچسپی کے حوالے سے غزل سرائی کا یہ پروگرام خاصا کامیاب رہا۔ 31 اگست 2014 کو سری نگر کتاب میلے اختتام کو پہنچا۔ ■

Dr. Imtiyaz Waheed, NCPUL, New Delhi - 110025

علامہ شبلی اور دارالمصنفین

ہنداسلامی تہذیب وثقافت کے ارتقا کی کوئی بھی تاریخ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اوران کے دیرینہ خواب کی تعبیر دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذکراوران کی علمی وتحقیقی خدمات کا حوالہ دیے بغیر مکمل نہیں مانی جاسکتی۔ یہی بات اسلامیات اوراسلامی ادبیات کے تعلق سے بھی کہی جائے گی۔ یہ قدرت کی ایک عجیب مصلحت تھی کہ علامہ شبلی کے انتقال اوران کے خواب کی تعبیر دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قیام کی تاریخوں میں صرف تین دنوں کا فرق رہا۔ ایک طرف وہ فوت ہوئے اور دوسری طرف ان کا دیکھا ہوا خواب حقیقت بن کر زندہ ہوگیا۔ اِس پر ساحرلدھیانوی کی اُس نظم کے مصرعے بے ساختہ یادآجاتے ہیں جوانھوں نے پنڈت جواہرلال نہرو کے انتقال پر کہی تھی:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

18 نومبر 1914 کو شبلی کے جسم نے آخری سانس لی تھی اور 21 نومبر 1914 کو دھڑکنوں کا ارمان دارالمصنفین کی صورت میں دنیا کے سامنے تھا۔ چنانچہ اس سال نومبر میں جہاں ہم شبلی کے یوم وفات کی صدی منائیں گے وہیں اعظم گڑھ کا یہ مہتم بالشان ادارہ اپنے قیام کے شان دار سو سال مکمل ہونے کا جشن منا رہا ہوگا۔ اور یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ یہ دونوں— شبلی بحیثیت ایک عالم کے اور دارالمصنفین بطور ایک ادارے کے— آج بھی بے مثل و بے نظیر نظر آتے ہیں۔ ان سو برسوں میں اردو کو نہ کوئی دوسرا شبلی میسرآیا نہ دارالمصنفین کا کوئی بدل پیدا ہو سکا۔

شبلی اپنی ذات میں بجائے خود اتنا بڑا ادارہ تھے کہ ان کی حیات وخدمات کا ذکر کرنے کے لیے بھی پورا ایک دفتر درکار ہے۔ شعرالعجم، سیرۃ النبیؐ، الفاروق، موازنۂ انیس ودبیر، سفرنامۂ روم ومصروشام جیسی متعدد علمی، تحقیقی اور تنقیدی تصنیفات سے لے کر سیکڑوں نثری مضامین، شعری تخلیقات، نظموں، غزلوں، مثنویوں اور مسدسوں تک پھیلے ہوئے ان کے دائرۂ عمل کو دیکھ کر ذہن چکرا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جب ترسیل کے ذرائع محدود، ناپید اور بے حدسست تھے، ایک شخص کیونکر اتنا کام کرسکا؟ یوں لگتا ہے کہ شبلی کے باطن میں بھی کئی شبلی سرگرم تھے جو شب وروز مصروف عمل رہتے تھے۔ ایسی شخصیت کے کاموں کا جائزہ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ زیر نظر کور اسٹوری کے لیے علامہ شبلی کی شخصیت کے بنیادی پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے ہم نے چند ایسے موضوعات پر مضامین لکھوائے ہیں جنھیں پڑھ کر آج کی اردو نسل اس نابغۂ روزگار ہستی کے فکروعمل اور شخصیت کے بنیادی عناصر ومحرکات سے آشنا ہوسکے۔ دارالمصنفین کے تعلق سے بھی دو مضامین شامل اشاعت ہیں جن سے عام قارئین کو اس ادارے کی تاریخی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوسکے گا۔ اس کے ساتھ مولانا شبلی کے انداز تحریر کے نمونے کے طور پر ان کے سفرنامے کے چند اوراق اور شبلی کے تخلیقی شعور کو محسوس کرانے کے لیے ان کے منتخب کلام کو بھی کور اسٹوری کا حصہ بنایا گیا ہے۔

علامہ شبلی کی برسی اور دارالمصنفین کے یوم تاسیس کی تاریخوں کا حساب ذہن میں رکھا جائے تو یہ کور اسٹوری آئندہ ماہ (نومبر 2014) کے 'اردو دنیا' کا حصہ ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اردو ادب کے بے حد مقبول ومعروف فکشن نگار کرشن چندر کی سوویں سالگرہ کا مہینہ بھی چونکہ نومبر 2014 ہی ہے اس لیے زیر نظر کور اسٹوری ایک ماہ پہلے ہی شائع کی جارہی ہے۔ آئندہ ماہ 'اردو دنیا' میں کرشن چندر کا ہی ذکرِ خاص رہے گا۔ گزشتہ ماہ 'گوشۂ اقبال وٹیگور' کی پذیرائی کرنے والے محترم قارئین کے ہم شکر گزار ہیں۔ امید ہے اس کاوش پر بھی اپنے تاثرات کا بے تکلفی سے اظہار فرمائیں گے۔

نصرت ظہیر

شمس بدایونی

مولانا شبلی کے سیاسی تدبر کی بازیافت

مولانا شبلی نعمانی (1914-1857) کا ملکی سیاست سے براہِ راست تعلق کا ثبوت نہیں ملتا۔ اُن کا اپنے دور میں ملک وقوم سے تعارف تین صورتوں میں ہوا:

اول: سرسید کے رفیقِ کار

دوم: ندوۃ العلما کے معتمد و عالمِ دین

سوم: اردو کے نمائندہ مصنف وشاعر

سیاسی پلیٹ فارم پر اس وقت مسلمانوں میں یا تو کانگریسی رہنما نمایاں تھے یا علی گڑھ تحریک کے ذمے داران۔ سرسید احمد خاں (1898-1817) اپنی زندگی میں بلاشرکتِ غیرے مسلمانوں کے قائد تسلیم کیے گئے۔ جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے:

''اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں ان کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو۔''

حیاتِ جاوید، ص 602

اخبار 'پانیر' نے سرسید کی وفات کا ماتم کرتے ہوئے 29 مارچ 1898 کی اشاعت میں لکھا تھا:

''سرسید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا، اس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید، بارآور اور نہایت زبردست پولیٹیکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر رُبع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا۔

بہ حوالہ حیات جاوید، ص 287

سرسید فی الواقع مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے انگریز دوستی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کی سیاسی فکر کے پس پشت یہ نظریہ کام کر رہا تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کا بندوبست انگریز حکمراں تن تنہا نہیں کر سکیں گے انھیں ہندوستانیوں کے تعاون کی ضرورت پڑے گی اور یہ تعاون دے کر مسلمان اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کا ایک بڑا حصہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور انگریزوں کے معتمد بھی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو مسلمان ہندوؤں کے زیر اقتدار آجائیں گے اور یہ صورت ان کے لیے زیادہ مضرت رساں ہوگی۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے مسلمانوں کو ملکی سیاست سے دور رکھنا ضروری سمجھا اور انڈین نیشنل کانگریس کی علی الاعلان مخالفت کی۔

سرسید کے بعد انھی خطوط پر یہ ذمے داری ان کے جانشینوں، خصوصاً ایم۔ اے۔ او کالج کے سیکریٹریوں نے ادا کی۔ مولانا شبلی کا عہد محسن الملک سید مہدی علی خاں (1907-1837) اور وقار الملک نواب مشتاق حسین خان (1898-1841) کے دور تک محدود رہا۔

رفقائے سرسید سیاسی امور میں بھی سرسید کو اپنا قائد تصور کرتے تھے۔ لیکن مولانا شبلی زمانۂ قیام علی گڑھ (1883 تا 12898) ہی سے تمام تر موانع کے باوجود سیاسی رائے میں آزاد رہے، اور سرسید کے ہم خیال و ہم نوا نہ بن سکے۔ جیسا کہ خود مولانا شبلی نے 23 ستمبر 1912 کو ایک تحریری استفسار کے جواب میں مدیر ادیب الہ آباد، پیارے لال شاکر میرٹھی (ف 1956) کو لکھا:

''رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ سولہ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔''

معارف اعظم گڑھ نومبر 1923، ص 394

اسی طرح کا ایک اور بیان 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ' سلسلۂ مضامین کے تحت ملتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''عورتوں کی تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، سائنس کی تعلیم کے متعلق سرسید کو جو بے اعتنائی تھی، ان چیزوں میں ہم ان کی مخالفت کر کے گنہگار ہو چکے ہیں، ایک پالیٹکس کا گناہ اور سہی:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

مقالات شبلی، ج 8، ص 158

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی سیاست میں سرسید کے مخالف بھلے ہی رہے ہوں لیکن انگریز مخالف کبھی نہیں رہے۔ بلکہ سرسید کی طرح ملت کے مفاد کی خاطر کبھی کبھی حکومت وقت کو وفاداری کا ثبوت بھی دیتے رہے۔ مثلاً 1898 میں یونان اور روم کی جنگ کے موقعے پر 'علی گڑھ میگزین' میں 'خلافت' کے عنوان سے مضمون لکھا، جس میں ترکوں کے دعوائے خلافت کو قابل تسلیم قرار نہیں دیا۔ اسی طرح الندوۃ (لکھنؤ-اگست 1908) میں ''مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے'' لکھ کر مسلانوں کو انگریز حکومت سے وفاداری کی تلقین کی۔ لیکن یہ سب سرسید کی طرح وفاداری بہ شرطِ استواری اصول کے تحت نہیں بلکہ مصلحتِ وقت کے تحت تھا۔ مولانا شبلی بھی سرسید کی طرح یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو جو مراعات حکومتِ وقت سے حاصل ہیں وہ

متاثر و مجروح ہوں۔ اس میں علی گڑھ کالج اور ندوۃ العلما کی مالی امداد و اعانت بھی شامل تھی۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے 'حیات شبلی' (سالِ تصنیف 1943) میں سیاسیات کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ اس باب میں طویل گفتگو کے بعد آخر میں لکھا ہے:

''اُس زمانے میں آزاد سے آزاد آدمی کا حکومتِ وقت سے مطالبہ صرف اصلاحات کا تھا۔ مولانا کی سیاست بھی اس سے آگے نہ تھی اور نہ اس کے آگے کوئی اور راستہ کسی کو معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اِس سیاسی حریت طلبی کے باوجود وہ حکومتِ وقت سے انحراف کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تھے اور ذرا سے دباؤ سے وہ اپنی مسلم وفاداری کا اقرار کرنے لگے۔''

حیاتِ شبلی، ص630

سطور بالا میں سید صاحب نے مولانا شبلی کی سیاسی زندگی پر جو غیر جانبدارانہ تبصرہ کیا ہے وہ واقعات کے لحاظ سے حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اس زمانے میں انگریز حکومت سے نجات اور مکمل آزادی کا تصور کانگریس کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ ان کی سوچ:

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

سے آگے کچھ سوچنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ لیکن مولانا شبلی نے اعلانیہ سرسید سے اختلاف، آل انڈیا مسلم لیگ (قیام دسمبر 1906) کی مخالفت، انڈین نیشنل کانگریس (قیام اگست 1885) کی حمایت میں جو کچھ لکھا ہے اسے محض اصلاحات کے زمرے میں رکھنا کافی ہوگا؟

مولانا شبلی نے بقول سید صاحب، حکومتِ وقت یعنی انگریزوں سے کبھی انحراف نہیں کیا، لیکن مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کے نظریات و خیالات کی تائید، کانگریسی رہنماؤں کی تعریف و توصیف کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ (دیکھیے: طویل مقالہ مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ) کیا یہ ایک مصنف کے اضطراری خیالات ہیں یا یہ ایک مستقل نظریہ رکھنے والے ادیب کے مدبرانہ افکار، جن پر وقت کے جبر نے اصلاحات کا لیبل لگا دیا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے مزید لکھا ہے:

سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے۔ لیکن ان کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات کی وسعت کا ایک جزو تھا... لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پین اسلامی تھے۔ بایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگریس کے مطالبوں پر رجز خوانی اور مسلمانوں کی سیاسی گمرہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس۔ اردو اخباروں میں 'ہندوستانی' لکھنؤ کو جسے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورما نکالتے تھے، بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اس سے اثر لیتے تھے۔

حیاتِ شبلی، ص609

راقم الحروف کا خیال ہے کہ کانگریس کے نظریات سے اثر لینے میں جسٹس بدرالدین طیب جی (1844-1906) کی شخصیت بھی نمونہ فکر و عمل کے طور پر شبلی کے پیش نظر رہی ہوگی۔ یہ لکھنے کی شاید ضرورت نہیں کہ طیب جی سرسید کے سب سے بڑے سیاسی مخالف تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ بمبئی میں قیام کے دوران بدرالدین طیب جی سے بھی ملاقات اور تبادلۂ خیالات کی صورت رہی ہو۔ اگر چہ اس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا۔

> **حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی سیاست میں سرسید کے مخالف بھلے ہی رہے ہوں لیکن انگریز مخالف کبھی نہیں رہے۔ بلکہ سرسید کی طرح ملت کے مفاد کی خاطر کبھی کبھی حکومت وقت کو وفاداری کا ثبوت بھی دیتے رہے۔ مثلاً 1898 میں یونان اور روم کی جنگ کے موقعے پر 'علی گڑھ میگزین' میں 'خلافت' کے عنوان سے مضمون لکھا، جس میں ترکوں کے دعوائے خلافت کو قابل تسلیم قرار نہیں دیا۔**

بدرالدین طیب جی کی قریبی عزیزہ عطیہ بیگم فیضی (1877-1967) علی گڑھ اور اربابِ علی گڑھ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھیں۔ ایک خط میں انھوں نے مولانا شبلی کو لکھا ہے:

''کانفرنس (مراد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) اور مسلم لیگ سخت ڈھکوسلے ہیں بزدل لوگوں کے۔ انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں اُسی قدر یہ بنتے جاتے ہیں۔''

شبلی نامہ، ص208

مذکورہ بالا خط (جو 24 مئی 1909 کا تحریر کردہ ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں:

''مدتوں کے بعد آج ایک ہم خیال ملا۔ کانفرنس وغیرہ کی نسبت سب سے لڑنا پڑتا ہے، کہ یہ کیا ڈھکوسلے ہیں؟ لیکن دنیا پاگل ہو رہی ہے، کس کو سمجھائے (غالباً سمجھایئے) مسلمان پالیٹکس میں آئے تو جس طرح نادان بچہ بات بات پر مچلتا ہے اور طفلانہ حرکتیں کرتا ہے۔

آج کل یاں مسلم لیگ کا اجلاس تھا۔ تمام ہندوستان کے 'لال بجھکڑ' جمع تھے۔ ان کی تجویزوں اور خیالات پر ہنسی آتی ہے۔''

خطوطِ شبلی، ص61,60

ایک اور خط مکتوبہ 12 اپریل 1911 میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

مسلمان جس چیز کو قبلہ حاجات سمجھ رہے ہیں (مراد علی گڑھ) وہ غلامی اور خوشامد کا کارخانہ ہے۔''

خطوطِ شبلی، ص96

مدیر سچ اور صدق مولانا عبدالماجد دریابادی (ف 1977) کے نام ایک خط محررہ 15 نومبر 1913 میں لکھتے ہیں:

پولیٹکل معاملات میں جو طوائف الملوکی پیدا ہوگئی ہے سخت قابلِ نفرت ہے... قوم حقیقت میں سرسید مرحوم کے وقت بھی اندھی تھی اور اب بھی ہے۔

مکاتیب شبلی ج 11، ص292

نجی خطوط میں سرسید اور علی گڑھ کالج کے بارے میں اظہار کردہ مذکورہ بالا خیالات شبلی کی سیاسی تحریروں پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ شبلی نے اپنے سلسلہ مضامین 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ' میں سرسید کے سیاسی حریف بدرالدین طیب جی کا پانچ جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بمبئی محض دوکانداروں کی منڈی ہے۔ مسلمانوں میں وہاں نام کو تعلیم نہیں۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت تک تمام بمبئی میں ایک گریجویٹ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، اور آج بھی دو چار سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس خاک نے بدرالدین طیب جی پیدا کیا جو نیشنل کانگریس کی خطرناک پریسیڈنٹی قبول کرنے سے نہ جھجکا اور جو سرکاری ملازمت یعنی ہائی کورٹ کی ججی کے زمانے میں بھی اپنی آزاد خیالی کو دبا نہ سکتا تھا۔ مقالات شبلی، ج8، ص154

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

بمبئی کے مسلمانوں میں کچھ بھی تعلیم نہیں۔ تاہم بدرالدین طیب جی پیدا ہوتا ہے جو کانگریس کا پریسیڈنٹ ہوسکتا ہے۔ مقالات شبلی ج8، ص169

اس مضمون میں مسلم تعلیم یافتہ افراد میں سید محمود (1850-1903)، مسٹر امیر علی (1849-1928)، مظہر الحق (1866-1930)، سید علی امام (1869-1932)، سید حسن امام (1871-1933)، رحمت اللہ محمد سیانی (1887-1902)، برادر اکبر طیب جی) کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن بدرالدین طیب جی کے ذکر میں اہتمام محسوس ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کی نظر میں ملکی سیاست اور قیادت کا جو تصور ہے اس میں سرسید احمد خاں کی کہیں بھی گنجائش نظر نہیں آتی۔ بلکہ بقول خواجہ غلام الثقلین:

مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔

عصر جدید، 17 دسمبر 1914، بہ حوالہ کسوف الشمسین، ص 31

لیکن بال کرشن گوکھلے (1866-1915) میں شبلی کو وہ تمام اوصاف نظر آتے ہیں جو ایک مثالی رہنما، کامیاب قائد، سچے محب وطن اور مخلص رہبر میں ہونے چاہئیں۔ اپنے مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ' میں انھوں نے گوکھلے کا چار جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ بدرالدین طیب جی، مسٹر امیر علی، رحمت اللہ سیانی، سید علی امام، سید حسن امام مظہر الحق کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بے شبہ ان میں سے کوئی شخص مجموعی حیثیتوں سے گوکھلے نہیں ہے۔ لیکن خود ہندوؤں میں دوسرا گوکھلے کون ہے؟

مقالات شبلی، ج 8، ص 157

ایک اور جگہ گوکھلے کی تعریف میں لکھتے ہیں:

لیڈری کے لیے وہ شخص درکار ہے جو مسٹر گوکھلے کی طرح خطاب، جائیداد، دولت تمام تعلقات سے آزاد ہو۔ پُرجوش اور دلیر ہو، اس کے ساتھ پالیٹکس کا ماہر ہو اور پولیٹکل لٹریچر کا مدتوں مطالعہ کر چکا ہو۔ اگر قوم میں ایسے شخص موجود نہیں ہیں تو لیڈری کے تخت کو اور ابھی چند روز خالی رکھنا اور واقعی تخت نشیں کا انتظار کرنا چاہیے۔

مقالات شبلی ج 8، ص 183

ایک ذاتی خط بنام محمد اسحق (مکتوبہ 14 فروری 1910) میں بھی گوکھلے کا ذکر بہ ایں الفاظ کرتے ہیں:

مسلمان زیادتی تعداد ممبری پرست ہوئے (کونسل کی ممبری مراد ہے) لیکن کرتے کیا ہیں؟ ایک گوکھلے نوشاد و علی محمد بلکہ عزیز مرزا اور آفتاب پر بھاری ہے۔

مکاتیب شبلی ج 1، ص 41

بدرالدین طیب جی اور بال کرشن گوکھلے کے بارے میں شبلی کے سطور بالا میں مذکور خیالات ان کے سیاسی نصب العین کا پتا دیتے ہیں۔

مولانا شبلی کے سیاسی نظریات اور اس میدان میں ان کی بصیرت و بصارت پر درجن بھر سے زائد مضامین سپرد قلم کیے جا چکے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی تحریکات، فکری و اجتماعی تاریخ پر لکھتے وقت بھی مولانا شبلی کے سیاسی تصورات اور سماجی افکار زیر بحث آتے رہے ہیں اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ سرسید احمد خاں کے مقابلے میں شبلی کی سیاسی سوجھ بوجھ اور مستقبل بینی کو سراہا گیا ہے لیکن کیا یہ سب صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو شبلیات کے ماہرین کو حسب ذیل سوالات و تجاویز پر غور و فکر کرنا چاہیے:

* مولانا شبلی کی جملہ سیاسی تحریروں کو، ان کے اپنے عہد کے سیاق و سباق میں مع توضیح و تشریح علیحدہ کتابی صورت میں مدون کیا جائے۔
* ان تحریروں کو بین الاسلامی سیاست اور سیاسیات ہند کے تحت دو شقوں میں تقسیم کیا جائے۔
* نثر و نظم میں ظاہر کردہ خیالات کی تطبیق کرتے ہوئے دونوں کو حسب موقع و ضرورت یکجا کیا جائے۔
* سرسید مسلمانوں کا مفاد اپنے ملک کے حالات کے لحاظ

سے طے کرنے کے حق میں تھے جب کہ شبلی عالم اسلام میں برپا سیاسی تغیر و انتشار کو ذہن میں رکھتے ہوئے عالمی سطح پر مسلمانوں کے مسائل کے حل کے خواہاں تھے اور اسی روشنی میں ملکی مسائل کا بھی حل چاہتے تھے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے شبلی کی سوچ کا یہ زاویہ جمال الدین افغانی (ف 1897) کے نظریہ 'اخوت اسلامی' سے متاثر ہونے کا نتیجہ تو نہیں تھا؟
* مسلم لیگ پر مولانا کی منظومات اور سلسلہ مضامین محض اصلاح کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی تحریریں ہیں یا ان میں تنقیص و تضحیک، طنز و استہزا کے عناصر بھی شامل ہیں؟ اگر ہیں تو ایک سنجیدہ اور پروقار ادیب کو، اپنے قلم کو اس حد تک بے باک و بے مہار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟
* شبلی علمائے دیوبند کے اس تائیدی فتوے کے زیر اثر تو نہیں تھے جو علمائے لدھیانہ کی تحریک پر 1888 میں جاری کیا گیا تھا جس میں مسلمانوں کو سرسید اور انگریزوں کی قائم کردہ United Indian Patriotic Association (یونائیڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قیام: اگست 1888) میں شریک ہونے سے منع کیا گیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس (قیام: اگست 1885) میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی، یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ ان اجازت دینے والوں میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (ف 1880) مولانا شبلی کے استاد محترم مولانا ارشاد حسین مجدّدی رامپوری (ف 1893)، مولانا رشید احمد گنگوہی (ف 1905) اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن (ف 1920) کے نام سرفہرست ہیں۔
* مولانا شبلی اور سرسید کی عمر میں چالیس سال کا تفاوت تھا۔ کیا سرسید اور شبلی کے سیاسی خیالات میں عمر کے تفاوت نے بھی کوئی کردار ادا کیا ہے؟
* شبلی کی عملی زندگی اور سیاسی افکار میں جہاں تہاں تضاد کی کچھ لکیریں نظر آتی ہیں۔ کیا ان افکار کی قدر و قیمت میں یہ لکیریں خلل انداز ہو سکتی ہیں؟

یہ اور اسی قسم کے چند اور سوالات قائم کرتے ہوئے مولانا شبلی کے سیاسی مدبرانہ افکار کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے۔ صرف انھیں سرسید اور مسلم لیگ کا مخالف یا مصلح کے طور پر پیش کرنا کافی نہیں ہے۔ ان کی سیاسی فکر کے اصل ماخذ کو تلاش کرنا چاہیے، جو میرے خیال میں بال کرشن گوکھلے کی تنظیم Servants of Indian Society (سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، قیام: 12 جون 1905 بہ مقام پونا) کے مقاصد اور گوکھلے کے سیاسی فلسفے میں نظر آ سکتے ہیں۔

کتابیات:

- جدید ہندوستان کے سیاسی و سماجی افکار: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ترقی اردو بیورو، دہلی بار اوّل 1985
- حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، دہلی بار سوم، 1990
- حیات شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ اوّل 1943
- حیات محسن: مولوی محمد امین زبیری، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ 1934
- خطوط شبلی: محمد امین زبیری، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور 1936
- شبلی نامہ: شیخ محمد اکرام، صفدر پریس، لکھنؤ، سنہ ندارد
- کسوف الشمسین: نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، 1944
- مقالات شبلی ج 8: نظامی بدایونی، مطبع معارف، اعظم گڑھ دوم 1972
- وقار حیات: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اوّل 1928
- ماہنامہ معارف: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مطبع مسلم یونیورسٹی اعظم گڑھ، نومبر 1923

■

Shams Budauni, 58, New Azad Puram Colony,
P.O.: Izzat Nagar, Bareilly - 243122 (UP)

جوہر جاوید گیاوی

شبلی کی سوانح نگاری

سوانح عمری کے فن نے اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی اور بقامیں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کی اہمیت وافادیت دیگر اصناف ادب کے بمنزلہ زیادہ ہے۔ایک طرف جہاں یہ انسانی طبیعت کے لیے فرحت وانبساط کا باعث ہے، تو دوسری جانب اس سے عظیم المرتبت اشخاص کے احوالِ زندگی، کارہائے نمایاں اور خدمات عالیہ سے واقفیت بھی بہم پہنچتی ہے۔سوانح افراد کی زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہوسکتی ہے،خواہ وہ مذہبی افراد واشخاص ہوں یا سیاسی وسماجی، یا پھر سائنس کے میدان کا کوئی عظیم فرد ہو یا آزادیِ وطن اور حب الوطنی میں مشہور اور شہرت یافتہ۔

سوانح عمری کا فن بے حد نازک اور نہایت دشوار کن باور کیا جاتا ہے۔اس میں سوانح نگار کو متعدد قسم کی نفسیاتی گھاٹیوں کو عبور کرنا ہوتا ہے تبھی وہ سوانح عمری کے فن سے انصاف کر پاتا ہے اور اپنی ذمے داریوں سے بحیثیت سوانح نگار عہدہ برآ بھی۔سوانح نگار کے لیے لابدی ہے کہ وہ صاحب سوانح کے حالات زندگی کے متعلق جملہ امور روشنی میں لائے اور اس کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر گفتگو کرے۔فنی اعتبار سے دیانت داری کا ثبوت دے اور ہمیشہ راہ اعتدال پر قائم رہے۔ خوبیوں کے علاوہ خامیوں پر بھی نظر رکھے اور برملا اس کا اظہار کرے مگر خواہ مخواہ کی عیب جوئی اصولی اعتبار سے سوانح عمری کے فن ومعیار کو مجروح کرسکتی ہے۔

اردو زبان وادب میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں مولانا حالی اور علامہ شبلی کی سوانح عمریاں زیادہ قابل التفات ہیں۔علامہ شبلی نے اردو زبان و ادب کے دامن کو المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبیؐ لکھ کر اس میدان کو نہ صرف وسیع کیا اور اس کی روایت کو مضبوط و مستحکم کیا بلکہ ان عظیم المرتبت ہستیوں کے متعلق اردو زبان میں نہایت ہی معتبر اور مستند مواد فراہم کردیا۔ ان برگزیدہ ہستیوں پر علامہ کی ان سوانح عمریوں سے ماقبل بہت زیادہ مواد نہ تھا اور جو کچھ تھا بھی اس کی حیثیت پس چند بکھرے ہوئے اجزاء سے زیادہ نہ تھی۔علامہ نے ان کے احوال زندگی، تعلیم وتربیت، فقہی بصیرت، جاہ وجلال اور خدمات عالیہ کو تاریخی اعتبار سے مستند و قابل اعتبار حوالوں سے مربوط انداز میں جمع کردیا ہے۔آج علامہ کی یہ سوانح عمریاں صاحبان سوانح کی زندگی کے متعلق واقفیت کے اہم ترین وسائل ہیں۔ یہ سوانح عمریاں علامہ شبلی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔آئندہ سطور میں علامہ کے اختیار کردہ اصول سوانح نگاری و تاریخ نویسی کی روشنی میں ان کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

علامہ شبلی نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے چند نہایت ہی بنیادی اصول وضع کیے ہیں جن کی بازگشت ان کی تمام سوانحی کتابوں میں سنائی دیتی ہے۔علامہ نے ان اصولوں کو نہ صرف اپنی کتابوں میں برتا ہے بلکہ اس پر سختی سے کاربند نظر آتے ہیں۔بعض ناقدین نے علامہ کے اصولوں کی اصول کی حد تک تو تحسین کی ہے مگر علامہ کو اپنی کتابوں کے لیے انحرافِ اصول کا موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔حالانکہ علامہ کی سوانح عمریوں کے مطالعے سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

علامہ نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ بیان کیا ہے کہ سوانح نگار یا مؤرخ جس عہد کے فرد کی سوانح رقم کررہا ہے اس عہد کے تمام حالات وواقعات یعنی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، مذہب، اخلاق و عادات وغیرہ امور شرح وبسط کے ساتھ رقم کرے، تاکہ متعلقہ عہد کی ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس اصول کی روشنی میں اگر علامہ کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے، مثلاً المامون کو لیں، اس کتاب میں علامہ نے نہ صرف مامون کی ولی عہدی، تخت نشینی، فتوحات ملکی وغیرہ ذاتی نوعیت کے امور پر مفصل روشنی ڈالی ہے بلکہ مامون کے عہد کی عام معاشرت، تہذیب وتمدن اور علماء وفضلا، علوم وفنون اور عام اخلاق وعادات وغیرہ امور پر بھی دل کھول کر بحث کی ہے۔اسی طرح سیرۃ النبیؐ کا دوسرا مقدمہ تقریباً اسی اصول کے لیے وقف نظر آتا ہے، جس میں آپ نے عرب کی وجہ تسمیہ، عرب کا جغرافیہ، عرب کی قدیم تاریخ کے ماخذ، عرب کی قدیم حکومتیں، تہذیب وتمدن، عرب کے مذاہب، سلسلۂ اسماعیلی اور مکہ معظمہ وغیرہ امور پر شاندار

بحث کی ہے۔ سیرۃ النعمان بھی علامہ کے اس اصول پر کھری اترتی ہے ''زوطی غلام نہ تھے'' کے عنوان سے انھوں نے اس دور کے مزاج وفکر کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف عناوین سے اس دور کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ سوانح مولانا روم میں سلاطین روم اور مولانا کے معاصرین، ارباب صحبت، مولانا کی ولادت کے زیر عنوان اس زمانے کے متعلق کافی اہم معلومات بہم پہنچائی ہے۔ اس زمانے کے دمشق کے متعلق علامہ رقم طراز ہیں: ''اس زمانے میں دمشق اور حلب علوم و فنون کے مرکز تھے، ابن جبیر نے 578 میں جب دمشق کا سفر کیا تو خاص شہر میں 20 بڑے بڑے دارالعلوم موجود تھے۔ حلب میں سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے قاضی ابوالمحاسن کی تحریک سے 591 میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کیے چنانچہ اس زمانے سے حلب بھی دمشق کی طرح دینۃ العلوم بن گیا۔''[1]

اس اعتبار سے بعض ناقدین نے سوانح مولانا روم پر تنقیدیں بھی کی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے محض سوانح عمری کی حیثیت سے علامہ شبلی کی ناقص ترین کتاب کہا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جس طرح مولانا (روم) کے قدیم سوانح نگار سپہ سالار نے ان کی لائف سے انصاف نہیں کیا اسی طرح جدید محققین کے سپہ سالار علامہ شبلی نے بھی ان کی سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کیا۔[2] ڈاکٹر صاحب کی طرح اس کا اعتراف سب کو ہے کہ معلومات کی عدم دستیابی کے باعث سوانح مولانا روم میں مولانا روم کی زندگی کے متعلق بہت زیادہ تفصیلات نہیں آسکی ہیں۔ مولانا کے اخلاق و عادات بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی بھی اس کا نالہ کرتے نظر آتے ہیں۔'' مولانا کے اخلاق و عادات اس تفصیل سے تذکرہ نویسوں نے نہیں لکھے کہ ترتیب سے الگ الگ عنوان قائم کیے جائیں، اس لیے جستہ جستہ جن باتوں کا پتہ چلا ہے، ہم بلاترتیب لکھتے ہیں۔''[3]

مندرجہ بالا اصول 'الغزالی' میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔ امام غزالی کے عہد کے تعلیمی طریقے، نیشاپور کی علمی حالت، سلطان وقت کے دربار میں، خاندان سلجوقیہ، ملک شاہ کی وسعت وسلطنت اور ملک کا امن و امان، اس عہد کی ملکی حالت، اور نظام الملک کے زمانے میں مصارف تعلیم وغیرہ عناوین کے تحت جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر امام غزالی کے عہد کے خراسان کی قاری کی نظر میں ایک تصویر کھنچ جاتی ہے، جغرافیائی حالات سے لے کر تعلیمی امور اور ملک کے نظم ونسق تمام چیزوں کو قلمبند کیا ہے۔ امام غزالی کے عہد کی ملکی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں ''سلطنت عباسیہ کے کمزور ہونے پر ملک میں ہر طرف خودمختاری کی ہوا چل گئی، حکومت وسلطنت کے بہت سے دعوے دار نکل آئے، ان سب میں ترکوں کا قدم سب سے آگے تھا'' اور دیکھتے دیکھتے وہ تمام دنیا پر چھا گئے۔ چنانچہ اس وقت سے دنیائے اسلام کا بڑا حصہ ان ہی کے قبضہ اقتدار میں رہا، اور آج بھی ہے، سلطانِ حال ترک ہیں، خدیو مصر ترک ہیں، کج کلاہ ایران ترک ہیں۔''[4]

اردو زبان و ادب میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں مولانا حالی اور علامہ شبلی کی سوانح عمریاں زیادہ قابل التفات ہیں۔ علامہ شبلی نے اردو زبان و ادب کے دامن کو المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی لکھ کر اس میدان کو نہ صرف وسیع کیا اور اس کی روایت کو مضبوط و مستحکم کیا بلکہ ان عظیم المرتبت ہستیوں کے متعلق اردو زبان میں نہایت ہی معتبر اور مستند مواد فراہم کر دیا۔

علامہ کے بیان کردہ اصولوں میں سے دوسرا اصول یہ ہے کہ واقعہ کی صداقت کے لیے واقعہ کی تحقیق روایت و درایت دونوں اصولوں پر ہونی چاہیے۔ علامہ نے اپنی سوانح عمریوں میں جن اصولوں پر سختی سے عمل کیا ہے اور کسی مقام پر بھی اس سے لمحہ بھر کے لیے بھی سمجھوتہ کرتے نظر نہیں آتے وہ یہی اصول ہے۔ علامہ شبلی میدان تحقیق و تدقیق کے شہسوار تھے۔ وہ کسی بھی واقعے کو روایت ودرایت کے غربال میں خوب اچھی طرح چھان لینے کے بعد ہی قبول فرماتے ہیں۔ ورنہ واقعہ اور روایت کا معروف ومتداول ہونا ان کے نزدیک بہت زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ سیرۃ النبی میں قصہ غرانیق[5] اور ہجرت کے باب میں بعض مشہور روایتوں پر علامہ کی تنقید اس کی مثالیں ہیں۔ غار ثور میں دشمنوں کے نبی اکرمؐ سے نہایت ہی قریب آجانے کے باوجود آپ کو نہ دیکھ پانے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''مشہور ہے کہ کفار قریب آگئے تو خدا نے حکم دیا، دفعتہً ببول کا ایک درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر (آنحضرتؐ کو چھپالیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے حرم کے کبوتر ان ہی کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ نے تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزار وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔''[6] نبی اکرمؐ کے سایہ کے متعلق فرماتے ہیں ''عام طور پر مشہور ہے کہ آپؐ کے سایہ نہ تھا لیکن اس کی کوئی سند نہیں۔''[7]

الفاروق میں بھی علامہ نے اس اصول کو نہایت خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی الفاروق کے اس وصف کی مدح کی ہے اور لکھا ہے کہ ''اصول صداقت کے معاملے میں شبلی نے جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں رکھی۔''[8] مہدی حسن آفادی بھی الفاروق کو عمروں کی کمائی قرار دیتے ہوئے اس کے اس وصف خاص کو سراہتے نظر آتے ہیں ''مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لیے ممالک غیر یعنی ترکی، مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کیے۔ سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھی اصل ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔''[9]

حضرت عمر فاروق کے اپنے بیٹے ابوشحمہ پر حد شرعی نافذ کرنے والا واقعہ آج جس تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور اس میں جو آمیزش کردی گئی ہے ان تمام تفصیلات کو آپ نے رد کردیا ہے اور تاریخی اعتبار سے صرف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ابوشحمہ کو شرعی سزا دی تھی جس کے صدمے سے ان کا انتقال ہوگیا تھا، بقیہ وہ تمام تفاصیل جو آج ہماری قوالیوں کی زینت ہے اسے بے سروپا قرار دیا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں ''ابوشحمہ کے قصے میں واعظوں نے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ لیکن اس قدر صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو شرعی سزا دی اور اسی صدمہ سے انھوں نے انتقال کیا۔[10]

تحقیق واقعہ کے اعتبار سے النعمان کا مقام بھی بہت بلند نظر آتا ہے۔ امام ابوحنیفہ سے سوانح نگار کی عقیدت ومحبت جگ ظاہر ہے اسی بنیاد پر مولانا فاروق چڑیا کوٹی نے آپ کو نعمانی کے لقب سے ملقب کیا تھا۔ مگر عقیدت وشیفتگی کبھی بھی اصول کے آڑے آتی نہیں دیکھی۔ پوری کتاب اصول روایت ودرایت پر کھری اترتی ہے۔ امام صاحب کے بعض عقیدت مند سوانح نگاروں اور مؤرخین نے آپ کی جانب ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی مثلاً چالیس سال تک آپ کا عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرنا وغیرہ اس طرح کے تمام واقعات کا آپ نے سختی کے ساتھ ابطال کیا ہے۔ امام صاحب کی ذہانت وطباعی کے عنوان کے تحت علامہ نے خود یہ بات لکھ دی ہے کہ ''میں صرف ان واقعات کو قلم انداز کروں گا اور ان ہی روایتوں پر اکتفا کروں گا جو بظن غالب صحیح اور ثابت ہیں۔''[11] درج ذیل سطور میں اپنے اس اصول پر کس سختی کا اظہار فرماتے ہیں ''اس مقام پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ سے مناظرات اور نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے ہیں، اور طرہ یہ ہے کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق و تنقید کے ان کو اپنی تالیفات میں نقل کردیا ہے جس سے عوام کو

اپنے غلط خیالات کے لیے ایک دستاویز ہاتھ آگئی ہے۔"[12]

سوانح مولانا روم میں بھی علامہ نے کوئی واقعہ مولانا روم کے حالات میں بلا سند بیان نہیں کیا ہے اور جہاں قصوں اور واقعات پر نقد کی ضرورت محسوس کی ہے وہاں زوردار انداز میں اس پر تنقید کی ہے۔ مولانا روم کی شمس تبریز سے ملاقات جوان کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے — کے زیر عنوان چند واقعات بیان کیے ہیں اس کے اختتام پر علامہ کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو "جو روایتیں نقل ہوئیں ان میں بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں (مثلاً جواہر مضیہ) بعض اور تذکروں میں منقول ہے۔ بعض زبانی متواتر روایتیں ہیں، لیکن ایک بھی صحیح نہیں، نہ صرف اس وجہ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لیے کہ صحیح روایت کے خلاف ہے، اس سے تم قیاس کر سکتے ہو کہ صوفیہ کبار کے حالات میں کس قدر دور از کار روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور وہی کتابوں میں درج ہو کر سلسلہ بہ سلسلہ پھیلتی جاتی ہیں۔"[13]

المامون اور الغزالی بھی اس اصول پر عمدہ کتابیں ہیں، المامون میں امین کے قتل کے واقعہ کو امین کے غلام احمد ابن سلام سے نقل کیا ہے جو بنفس نفیس امین کے قتل کے وقت وہاں حاضر تھا، اسی طرح مامون کے خراج وغیرہ کی تفاصیل مامون کے سرکاری کاغذات پر منحصر ہیں، اس لیے مقدمہ ابن خلدون سے انھیں نقل کیا ہے کیونکہ علامہ ابن خلدون نے ان کاغذات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔[14] اسی طرح الغزالی میں علامہ غزالی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے احیاء العلوم میں سیکڑوں اور ہزاروں روایتیں موضوع اور ضعیف نقل کر دی ہیں جن کا کتب احادیث میں کہیں پتہ نہیں۔[15]

علامہ نے تیسرا اصول یہ بیان کیا ہے کہ سوانح نگار اور مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ حوالے واستناد، مآخذ ومراجع کی لازماً نشاندہی کرے۔ یہ اصول بھی مندرجہ بالا اصول کا ایک جز ہے، اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تحقیق وتدقیق اور تفحص و جستجو علامہ کا وطیرۂ خاص ہے۔ اس اعتبار سے علامہ کی سوانح عمریاں مقام بلند پر فائز ہیں علامہ کی کسی بھی سوانح کو لیں اس کا ہر صفحہ مآخذ ومراجع کے حوالے سے پر نظر آئے گا۔ خصوصاً سیرۃ النبی، المامون، النعمان اور الفاروق۔ الفاروق کی تالیف کا ارادہ کر لیا تھا اور اس کے کچھ اجزا لکھ بھی چکے تھے مگر عمر فاروق کے حالات زندگی اور کارنامے کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے علامہ کی نظر میں ہندوستانی کتب خانے کفایت نہ کرتے تھے اور بعض اہم بنیادی مراجع مثلاً تاریخ طبری وغیرہ یورپ میں چھپ رہے تھے، لہٰذا علامہ نے الفاروق کی تالیف مؤخر کر دی، علامہ نے روم وایران، مصر و شام وغیرہ بلاد اسلامیہ کے اسفار کیے، اس کا مقصد بھی معتبر حوالوں اور مآخذ ومراجع کی حصولیابی ہی تھا۔ ان تمام باتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ مآخذ ومراجع اور حوالے واستناد کی نشاندہی کو کس قدر اہم تصور کرتے تھے۔ بعض اہم کتابیں مثلاً ابن کثیر کی بدایہ والنہایہ آپ کو دستیاب نہ ہو سکی جس کا آپ کو آخر عمر تک ملال رہا اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی نے ہی اس اصول کو برصغیر میں اول اول نہایت سختی سے برتا اور حوالے ومراجع کی نشاندہی کی بنیاد ڈالی ورنہ علامہ کے دور اور اس سے قبل کے زمانے میں حوالوں اور مراجع کا اس قدر اہتمام نہیں ملتا جس قدر علامہ نے اپنی سوانح عمریوں میں اس کا التزام کیا ہے۔ المامون کی اسی خوبی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرسید احمد خاں ان کی ان الفاظ میں مدح کرتے ہیں، "مصنف نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی

'النعمان' حصہ دوم میں فقہ حنفی کی حسن مقبولیت اور امام صاحب کی فقیہانہ بصیرت نیز مسائل ہمہ میں ان کے مذہب کو اقرب الی النصوص ہونے کی لمبی بحث کے اختتام پر علامہ نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ "اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم امام ابو حنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں، امام ابو حنیفہ مجتہد تھے، پیغمبر نہ تھے۔ اس لیے ان کے ان مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے

جس کا حوالہ معبر مآخذ سے نہ دیا ہو، ہر ایک جزوی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے، حوالہ دیا ہے۔"[16]

اس عام کلیہ سے سوانح مولانا روم ذرا مختلف واقع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا روم کے حالات وواقعات بہت کم دستیاب ہیں اور جس زمانے کی علامہ کی یہ تالیف ہے اس زمانے میں اور بھی کم کتابیں مولانا روم کی سیرت پر دستیاب تھیں اسی وجہ سے خاص مولانا روم کے حالات و واقعات میں مراجع کی حیثیت سے صرف دو کتابیں علامہ کے پیش نظر تھیں۔ انھیں پر حالات وواقعات کا مدار ہے البتہ مثنوی مولانا روم پر مفصل گفتگو سے اس تشنگی کو بجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ علامہ شبلی مقدمہ میں رقم طراز ہیں "مولانا کے حالات واقعات، عام تذکروں میں مختصر ملتے ہیں، سپہ سالار ایک بزرگ، مولانا کے مدیر خاص تھے اور مدت تک فیض صحبت اٹھایا تھا، انھوں نے مولانا کی سوانح عمری لکھی ہے، مناقب العارفین میں بھی ان کا مفصل تذکرہ ہے میں نے زیادہ تر انھیں دونوں کتابوں کو مآخذ قرار دیا ہے۔[17] البتہ دیگر لوگوں کے تذکروں میں جن کا ذکر کتاب میں کسی حوالے سے بھی آیا ہے۔ علامہ نے تاریخ وسیر کی معتبر ترین کتابوں کے حوالے سوانح مولانا روم میں بھی جا بجا دیے ہیں۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ سوانح نگار کو صاحب سوانح کی کمزوریوں اور عیوب سے پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے، اور نہ ہی اس کی تاویل کرنی چاہیے، خوبیوں کے بیان میں وہ جس قدر غیر جانب دار ہوتا ہے اسی طرح خامیوں کے بیان میں بھی اسے ہونا چاہیے، نیز یہ کہ بڑی ہستیوں کو سوانح نگاری میں اس طرح ظاہر نہ کیا جائے کہ وہ فرشتے معلوم ہوں، بلکہ بشری صفات وکمال جو ہو سکتے ہیں انہی کو بیان کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کے اندر سوانح عمری کو پڑھ کر صاحب سوانح کی صفات و خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ سوانح نگاری میں عقیدت ومحبت کا دخل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ سوانح جوش عقیدت ومحبت کی ایک داستان بن کر رہ جائے گی۔

امام ابو حنیفہ سے علامہ شبلی کو جو عقیدت ومحبت تھی وہ اظہر من الشمس ہے، باوجود اس کے 'النعمان' میں وہ محبت وعقیدت کی اس قربان گاہ پر اپنے اصول سوانح نگاری کو قربان کرتے کبھی نظر نہیں آتے۔ 'النعمان' حصہ دوم میں فقہ حنفی کی حسن مقبولیت اور امام صاحب کی فقیہانہ بصیرت نیز مسائل ہمہ میں ان کے مذہب کو اقرب الی النصوص ہونے کی لمبی بحث کے اختتام پر علامہ نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ "اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم امام ابو حنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں، امام ابو حنیفہ مجتہد تھے، پیغمبر نہ تھے۔ اس لیے ان کے ان مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے، نہ صرف امکان بلکہ ہم وقوع کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔"[18]

اس کے علاوہ امام صاحب کی بشری کمزوریوں اور مناظرات میں ادعا اور جوشِ مقابلہ کے اثر کا ذکر بھی کیا ہے اور اسے امام موصوف کی تواضع اور بے نفسی کے خلاف قرار دیا ہے اور ان بشری کمزوریوں کی بابت کھلے لفظوں میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی بری نہیں ہو سکتا۔ علامہ نے لکھا ہے "سچ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگو ں کے حالات میں مذکور نہ ہوتیں تو ہم کو شبہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے ان بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں دکھائی ہے بلکہ خوش اعتقادیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔[19]

النعمان کی انھیں خوبیوں کے باعث الطاف فاطمہ نے لکھا ہے کہ "اس میں حقیقت زیادہ اور خوش اعتقادی کم ہے۔"[20]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سیرۃ النعمان کو اس موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا ہے اور اسے علامہ کے شعور فن کا عمدہ

مظاہرہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''سیرۃ النعمان اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ اس میں شبلی نے محبت وعقیدت کے باوجود امام ابوحنیفہ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔''[21]

'الغزالی' میں بھی اس اصول کو برتا ہے کتاب کے خاتمہ پر علامہ غزالی کی تصنیف احیاء العلوم پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور امام غزالی کی بابت لکھا ہے کہ انھوں نے بزرگان سلف کے جو واقعات لکھے ہیں اکثر دور از کار اور بعید از عقل ہیں اور جز عوام کے کوئی شخص ان پر یقین نہیں کرسکتا۔[22] 'المامون' میں چند مقامات پر خلیفہ مامون کی بے اعتدالیوں کا ذکر کیا ہے، اس کے مذہبی جنون کو تمام خوبیوں کو غارت کردینے والا لکھا ہے، نیز اس کے غیر معتدل رحم کو اس کی شان کے خلاف قرار دیا ہے۔ مختلف پہلوؤں سے مامون کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ علامہ رقمطراز ہیں ''تمام خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں بعض ایسی بے اعتدالیاں بھی اس سے سرزد ہوئیں ہیں جن کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔''[23]

علامہ شبلی نے پانچواں اصول یہ بیان کیا ہے کہ سوانح نگار کو اس فن سے اچھی واقفیت حاصل ہونی چاہیے، جس فن سے صاحب سوانح کا تعلق ہے، ورنہ سوانح نگار کی نظر واقعہ پر سطحی پڑے گی اور وہ واقعات وحوادث کی روح تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ شبلی ایک جامع الکمالات مصنف تھے۔ تاریخ، فلسفہ، تصوف، فقہ وغیرہ تمام علوم وفنون پر علامہ کو عبور حاصل تھا، نیز آپ متعدد زبانوں پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ یہ بھی وجہ ہے کہ وہ اپنی سوانح عمریوں میں واقعات کی تہہ اور اس کی روح تک بآسانی پہنچتے نظر آتے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے متعلق ضیاء الرحمن فاروقی نے سچ لکھا ہے ''اس میں مصنف نے اپنی علمیت، ذہانت، گہرے مطالعہ، تنقید کی صلاحیت اور مؤرخانہ ژرف نگاہی سے ثابت کردیا ہے کہ سیرت نبویؐ پر قلم اٹھانے کا حق انھی کو تھا۔''[24] یہی بات علامہ کی دیگر سوانح عمریوں کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے۔

واقعات کے اسباب وعلل کی تحقیق وتدقیق اور اس کی روشنی میں مفید تاریخی نتائج مستنبط کرنا علامہ کا چھٹا اصول ہے۔ علامہ نے اس کو تاریخ وسیر نگاری کی روح قرار دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ المامون، الفاروق اور سیرۃ النبیؐ اس کی عمدہ مثالیں ہوسکتی ہیں۔ سیرۃ النبیؐ میں علامہ کے اس اصول پر کاربند ہونے کے متعلق ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی علامہ کی بلند نگاہی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''سب سے اہم اور قابل ذکر چیز واقعات سیرت کے بیان میں مؤرخانہ اسباب وعلل کی تلاش ہے، مولانا نے اس طرف خاص توجہ دی ہے، اور سیرۃ النبیؐ میں جابجا مستقل عنوانات قائم کرکے بعض اہم واقعات اور ان کے اسباب سے متعلق عمدہ بحثیں کی ہے جن کی مثالیں عام کتب سیرت میں نہیں ملتیں۔''[25]

علامہ شبلی نے ساتواں اصول یہ بیان کیا ہے کہ سوانح نگاری وتاریخ نویسی اور انشا پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں۔ لہٰذا سوانح عمری رقم کرتے ہوئے سوانح نگار کو اپنی طرز نگارش پر خاص توجہ رکھنی چاہیے، اور انشا پردازی سے احتراز کرنا چاہیے۔ علامہ کی تمام سوانح عمریاں اس بات پر بین دلیل ہیں کہ انھوں نے اس اصول پر حتی المقدور عمل کیا ہے۔ علامہ کو رنگین عبارت لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی مگر ان کی سوانح عمریوں میں سیرۃ النبیؐ کا ظہور قدسی والے عنوان کے بجز تمام کتابیں سوانح نگاری کی طرز نگارش کی عمدہ اور بے نظیر مثالیں ہیں۔ المامون کی فنی حیثیت اور علامہ کے باوجود انشا پرداز اور مزاجاً شاعر ہونے کے اس کتاب میں انشا پردازی سے کامل احتراز کا اعتراف کرتے ہوئے اختر وقار عظیم نے لکھا ہے ''فنی لحاظ سے المامون کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شبلی نے ایک بڑے انشا پرداز اور مزاجاً شاعر ہونے کے باوجود ہمیں بھی بلاضرورت رنگین بیانی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔[26]

چونکہ علامہ کی حیثیتیں کثیر الجہات تھیں اور بعض صاحب سوانح کی حیثیت بھی ایک سے زیادہ، لہٰذا بعض کتابوں میں طرز تحریر بیک وقت مؤرخانہ، مجتہدانہ اور فقیہانہ ضرور ہوگیا ہے، مثلاً النعمان میں، کیونکہ امام ابوحنیفہ کی مجتہد اور فقیہ کی حیثیت بہت ابھری ہوئی ہے۔ اس لیے امام صاحب کی فقہی ومجتہدانہ بصیرت پر گفتگو کرتے وقت علامہ کا قلم بھی اسی رنگ میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس لکھتے ہیں ''چونکہ صاحب سوانح امام اعظم کی متعدد حیثیتیں تھیں اور ان کا تعلق مختلف فنون سے تھا، اس لیے جو بات جس فن کے مناسب تھی وہاں اس فن سے اصول وضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیرۃ النعمان میں علامہ شبلی کا طرز تحریر کہیں مورخانہ، کہیں فقیہانہ، کہیں محدثانہ اور کہیں مجتہدانہ ہوگیا ہے۔[27] یہی بات الفاروق اور سوانح مولانا روم کے دوسرے حصوں پر بھی صادق آتی ہے۔ حضرت عمر فاروق کی سوانح کا حق ادا نہ ہوتا اگر ان کی مدبرانہ، مجتہدانہ، اور انتظامی امور میں ان کی بے نظیر بصیرت کا احاطہ نہ کیا جاتا، ان امور پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ کا اسلوب نگارش عین موضوع کے مطابق ہوگیا ہے۔ سوانح مولانا روم اور الغزالی کا دوسرا حصہ مثنوی اور احیاء العلوم کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے، چنانچہ موضوع کے اقتضاء کے مطابق طرز تحریر میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ بڑی دیانت داری کے ساتھ اس اصول پر اول تا آخر اپنی کتابوں میں کاربند نظر آتے ہیں اور ایک سوانح نگار اور مؤرخ کی طرح صاف ستھری نثر لکھی ہے۔

مصادر ومراجع

1. سوانح مولانا روم، ایڈیشن 2003، دار المصنّفین شبلی اکادمی، ص 5
2. سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص 147، بحوالہ آثار شبلی، ص 197
3. سوانح مولانا روم، ص 26
4. الغزالی، دار المصنّفین شبلی اکادمی، ایڈیشن طبع جدید 1997، ص 8
5. سیرۃ النبیؐ، مکتبہ مدینہ، اردو بازار، لاہور، ص 146، جلد اوّل، تاریخ طباعت، صفر المظفر 1408ھ
6. سیرۃ النبیؐ، ص 163
7. سیرۃ النبیؐ، ص 121، جلد دوم
8. سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص..... بحوالہ آثار شبلی، ص 147
9. افادات مہدی، ص 45، بحوالہ آثار شبلی، ص 141
10. الفاروق، مطبوعہ، لاہوتی فائن آرٹ پریس، حصہ دوم، ص 189 (حاشیہ)
11. لنعمان، جدید ایڈیشن 1998، مطبع معارف پریس شبلی اکادمی، ص 79
12. النعمان، ص 78
13. سوانح مولانا روم، ص 9
14. المامون، ص 3-4
15. الغزالی، ص 250
16. دیباچہ المامون، ص 3
17. سوانح مولانا روم، ص 4
18. النعمان، ص 254
19. النعمان، ص 87
20. اردو میں فن سوانح نگاری، ص 124، بحوالہ آثار شبلی، 101
21. سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص 144، بحوالہ آثار شبلی، 104
22. الغزالی، ص 250
23. المامون، حصہ دوم، ص 128
24. اشخاص وافکار، ضیاء الرحمن فاروقی، ص 114، بحوالہ آثار شبلی، ص 325
25. مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، ص 111، بحوالہ آثار شبلی 343
26. شبلی بحیثیت مورخ، وقار عظیم، ص 94، بحوالہ آثار شبلی، ص 76
27. آثار شبلی، دار المصنّفین شبلی اکادمی، طبع اوّل، جنوری 2013، ص 101

■

Jauhar Javed Gayavi, Sondiha, Bhadeya, Distt. Gaya - (Bihar)

مسعود الحسن ندوی

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں شبلی لیکن
حال دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے

شبلی کی اردو شاعری اور ملی دردمندی

علامہ شبلی نعمانی کوئی روایتی شاعر نہ تھے، نہ ہی عام شعرا کی طرح انھوں نے شعر گوئی کو اپنا میدان عمل بنایا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کوچے میں بھی فکر وخیال کی جولانیاں دکھائیں وہ ''اپنی شاعری کو تفریح طبع سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کے ذکر کے بغیر ان کی شخصیت کا ایوان سجانا بھی مشکل ہے۔''[1]

گو کہ اہل نظر کے خیال میں شبلی تفریح طبع کے لیے شاعری کرتے تھے یا ''منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے''[2] اور ''بذات خود کبھی اس کو اپنا قابل فخر کارنامہ قرار نہیں دیا''[3] لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائے زمانہ سے ہی ان کے اندر شعری ذوق موجود تھا'' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ذوق شعری فطری اور خداداد تھا تو غلط نہ ہوگا''[4] چنانچہ بچپن میں ہی فی البدیہہ کہے گئے اشعار بطور مثال موجود ہیں (دیکھیے کلیات شبلی 2) حالات نے بھی موافقت کی اور ان کے شعری ذوق کو جلا ملتی رہی بایں طور کہ اپنے وطن اعظم گڑھ میں بھی شعر وسخن کی مجلسیں آراستہ کرتے رہے اور یگانۂ روزگار علامہ فاروق چریاکوٹی (م 1909) کی خاص صحبت نے آبیاری کی تو 1874 میں غازی پور میں قیام کے دوران اردو کے مشہور اور صاحب دیوان شاعر مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی ثم غازی پوری کی قربت نے بھی جلا بخشی اور ابتداء میں تسنیم تخلص کرتے ہوئے بعد میں اپنے نام کو ہی تخلص قرار دے کر مجلس شعر وسخن کو زینت بخشتے رہے۔

پروفیسر مسعود الرحمن خاں ندوی کے بقول:

''ان کے گرد وپیش کے حالات وواقعات، ملک وقوم کے احوال وکوائف اور سیاست وسماج کی ناہمواریاں اور بو العجبیاں کبھی کبھی ان کے جذبات وخیالات کو شعری لے میں ابھار دیتی تھیں وہ حساس قلب اور نازک دماغ کے مالک تھے اور اپنی قوم وملک سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اس لیے ان کو ان کی کامیابیاں اور رعنائیاں جہاں فرط مسرت سے وجد میں لاتی تھیں وہاں ان کی نامرادیاں اور پستیاں ان کی حساسیت کو مہمیز کر کے ان کے دل کے پھپھولوں کو شعری شراروں میں ڈھال دیتی تھیں وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ کبھی کبھی شعر وسخن کی کاٹ اتنی گہری اور اتنی کارگر ہوتی ہے کہ وہ ہزارہا نثری سخن سازیوں پر بھاری ہوتی ہے۔''[5]

ان کے شاگرد وجانشین علامہ سید سلیمان ندویؒ کا بھی قول ہے کہ ''وہ فطری شاعر تھے، اکثر اردو فارسی میں اور گاہے گاہے عربی میں شعر موزوں فرماتے تھے۔''[6]

شبلی شناسی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لینے والے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی یہ تحقیقی تحریر قابل مطالعہ ہے۔ جس میں انھوں نے شبلی کی قدرت کلامی، اصناف سخن، شعری سرمایہ کی وقعت، مورخانہ بصیرت کے ساتھ اردو شاعری میں منفرد مقام ومرتبے کا تذکرہ کیا ہے۔

''علامہ شبلی اردو و فارسی کے خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے''... ''اردو شاعری میں علامہ شبلی کا وہ مقام نہیں جو نثری ادب میں ہے۔ تاہم ان کا شعری سرمایہ بہت اہم اور وقیع ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظموں کا آغاز کیا۔ اور مورخانہ شعور وآگہی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر سیاسی نظموں کو بانگ درا اور ضرب کلیم بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے علامہ شبلی کی نظموں کو اردو شاعری میں ایک نئی چیز سے تعبیر کیا ہے۔[7]

''ان کے اردو کلام کے کئی ناقص مجموعے شائع ہوئے ان میں کلیات شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے''... ''کلیات شبلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے متعدد اصناف شاعری میں داد سخن دی۔ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مسدس، غزل، رباعی، اور قطعہ وغیرہ اصناف میں انھوں نے جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے یا جو دست بُرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے وہ اپنی عظمت اور فکر وفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے بالخصوص ان کی مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔''[8]

یہی وجہ ہے کہ ''مولانا کی زندگی میں ان کی شاعری کی دھوم رہی جیسا کہ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے''

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی[9]

شبلی نے اگر نثر کے ذریعے علم وادب، تاریخ وتذکرہ اور کلام وعقائد کا خزانہ چھوڑا اور علم وفن کے مختلف میدانوں میں اپنی گراں قدر خدمات کی بنا پر شہ نشین رہے تو اپنی شاعری کے ذریعے انھوں نے سماجی، سیاسی اور مذہبی اصلاح و درستگی کا فریضہ بھی انجام دیا، ان کی نظمیں بے حد مقبول ہوئیں علی گڑھ

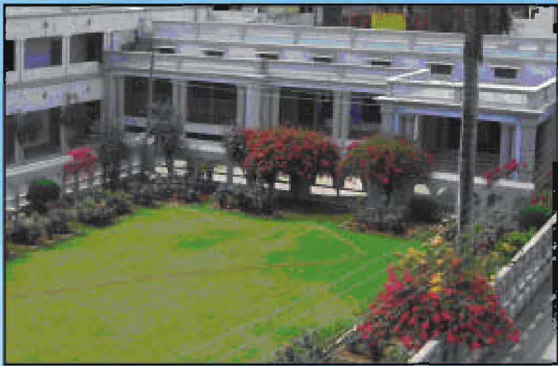

کالج، علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے جلسوں میں وہ بڑی دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے، سننے والے سر دھنتے، آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے"[10] انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ کی دردمندی اور غم گساری کی، ملت کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی اور اس کی شیرازہ بندی کے لیے کوششیں کیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں جب ملت اسلامیہ انقلابات کی زد پر تھی اور عالم اسلام حادثات وسانحات سے زیروزبر تھا تو "اُس دور پر آشوب میں اگر کوئی شاعر تھا تو وہ شبلی تھے۔"

"جس شان سے انھوں نے قومی نظمیں کہی ہیں وہ بہت ہی موثر اور نشتر سے زیادہ تیز ہیں مسلم لیگ اور بعض سیاسی لیڈروں پر جو اشعار کہے، وہ طنز کے لحاظ سے اردو شاعری کے لیے بالکل نئی چیز تھی، تاریخی اور اخلاقی نظموں کو لکھنے میں تو کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکا... جرأت وصداقت اور اسلام کے تنزل کا صلی سبب وغیرہ کے عنوانات سے جو تاریخی اور اخلاقی نظمیں لکھ دی ہیں وہ اردو شاعری کا رأس المال ہیں، ان میں اسلامی غیرت وحمیت، اسلامی انصاف پسندی، جرأت وصداقت اور حریت کی یاد تازہ کر کے رجز خواں بھی بن گئے ہیں۔"[11]

اشعار ملاحظہ ہوں:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے اب امر صریح
کہ زمانہ میں کہیں عزت اسلام نہیں
آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل
اس میں تخصیص عراق و عرب و شام نہیں
یہ بھی ظاہر ہے کہ ہیں مختلف الحال یہ لوگ
کوئی چیز ان میں جو ہو مشترک عام نہیں
ایشیائی ہے اگر یہ تو وہ ہے افریقی
اور کوئی رابطۂ نامہ و پیغام نہیں
اس قدر فرق وتفاوت پہ بھی ہے عام یہ بات
قوم کا دفتر عزت میں کہیں نام نہیں
پس اگر غور سے دیکھو تو بجز مذہب و دین
ہم مسلمانوں میں کوئی صفت عام نہیں
نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندی عہد
دل ہیں ناصاف زبانوں میں جو دشنام نہیں
آیت فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر
علماء کو خبر گردش ایام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستی قوم
ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں

ان اشعار میں ملت اسلامیہ کی زبوں حالی، ذلت وپستی، افراد قوم کی نام نہاد اسلامیت، آپسی ناچاقی، اخوت و ہمدردی اور باہمی ربط وتعلق کا فقدان، من وتُو کا فرق، قربانی وجاں فشانی سے فرار، دین ومذہب سے بیزاری، علم وادب سے روگردانی، صداقت و شجاعت سے دستبرداری، عبرت وموعظت سے بے پروائی، جیسے مہلک امراض کو وہ اسلام کے حق میں اسباب تنزل گردانتے ہیں اور ان کا اظہار مذکورہ اشعار میں انھوں نے کیا ہے۔

اردو شاعری میں علامہ شبلی کی سیاسی نظمیں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں بلکہ اردو شاعری میں نئے باب کا آغاز کہنا چاہیے۔ اگرچہ علامہ شبلی کی شخصیت خالص علمی تھی، عمر عزیز کا بیشتر حصہ علم وتحقیق اور درس وتدریس میں صرف ہوا لیکن وہ حالات زمانہ سے بیگانہ نہیں تھے، ملکی اور بین الاقوامی حالات اور نشیب وفراز پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور ملی دردمندی سے ان کا قلب معمور تھا، سیاسی بصیرت بھی ان میں موجود تھی "ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ان کی سیاسی شاعری سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ اردو میں بقول سردار جعفری ایجی ٹیشنل پوئٹری کے پیش رو تھے۔ ان کی مشہور نظم 'شہر آشوب اسلام' ایک تاریخی اہمیت کی نظم ہے اور آزادی کے متوالوں کے لیے ایک چھوٹے رزمیہ (MINI EPIC) کا درجہ رکھتی ہے۔"[12]

شبلی شناسی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لینے والے ڈاکٹر محمدالیاس الاعظمی کی یہ تحقیقی تحریر قابل مطالعہ ہے۔ جس میں انھوں نے شبلی کی قدرت کلامی، اصناف سخن، شعری سرمایہ کی وقعت، مورخانہ بصیرت کے ساتھ اردو شاعری میں منفرد مقام ومرتبے کا تذکرہ کیا ہے۔

ملی دردمندی کے جذبے سے سرشاری ہی تھی کہ جب جب ملت پر کوئی افتاد پڑی تو ان کا دردمند دل پارہ پارہ ہوا اور پارۂ دل لیے ہوئے جب سخن آرا ہوئے اور نوائے درد نظم کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آئی تو لوگ بلک پڑے۔ چنانچہ مسلم لیگ کا ہنگامہ ہو یا کان پور کی مسجد کا خونی منظر یا طرابلس اور بلقان کی جنگیں، ہر موقع پر وہ گویا ہوئے اور درد وسوز میں ڈوبے ہوئے نالوں سے سننے والوں کا چین رخصت ہو گیا۔ ان کی نظموں میں سب سے زیادہ قابل ذکر 'شہر آشوب اسلام' کے نام سے لکھی ہوئی نظم ہے جو جنگ بلقان کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہونگے زرفشاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
زوال دولت عثماں، زوال شرع و ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد وقیرواں کب تک

"واقعہ یہ ہے کہ یہ نظم اس قدر پراثر ہے اور جذبات میں تلاطم پیدا کرتی ہے کہ آج بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں"[13] یہ نظم پڑھتے جایئے اور دیکھتے جایئے اس یگانۂ روزگار خامہ فرسا کے اندرون میں کس بلا کا درد وکرب مستور تھا، کیسی چنگاریاں دبی تھیں جو شعلہ فشاں ہوا ٹھی ہیں کہ کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر

نہ رو سکے، جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے۔ خفتہ روح مسلم کو بیدار کرنے اور حرارت ایمانی کو جلا بخشنے والے طاقت ور اور پر شور الفاظ کا روانی اور برجستگی کے ساتھ استعمال ہے، صلیبیوں سے جو بزبان خود تہذیب وتمدن کے علم بردار ہیں ان سے دوٹوک انداز میں خطاب ہے، اسلامی سلطنتوں کے زوال اور بربادی پر صدمہ وافسوس اور نوحہ وماتم بھی اور فکر فردا بھی ہے۔ ممالک اسلامیہ کے افق پر صلیبی جنگوں کے امنڈتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر جوش انتقام سے بھری ہوئی صلیبی طاقتوں سے کہتے ہیں کہ تم اپنی شمع بزم کی لو کب تک ہمارے لہو سے تیز کرتے رہوگے؟ ہمارے گرم لہو سے تمھارے دل کی آگ کب سرد ہوگی؟ وہ کہتے ہیں کہ اگر ظلم وجور کے یہی انداز اور قوم مسلم کی پسپائی کی یہی رفتار رہی، باد کفر کی سمیت نے ماحول اور فضا کو زہر آلود کر دیا، غبار کفر سے افق عالم آلودہ ہوتا رہا، امن عالم پامال ہوتا رہا، صدائے تکبیر پر شور ناقوس غالب ہوتا رہا، ان کی چیرہ دستیوں سے مرکز توحید بھی محفوظ نہ رہ سکا تو پھر توحید پرستوں کے لیے کون سی جائے پناہ رہ پائے گی۔

مشہور مجاہد آزادی اور قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری جو یوسف پور ضلع غازی پور کے باشندے تھے جن کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ "اس یوسف کا کنعان وہ محدود مقام نہ تھا جس کو یوسف پور کہتے ہیں بلکہ پورا ہندوستان تھا"[14] وہ جب 1912 میں بلقان کی جنگ میں طبی وفد لے کر ترکی جا رہے تھے اور لکھنؤ سے گزرے تو الوداع کہنے کے لیے علامہ شبلی اور دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ "شبلی کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگا یئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی 'حیات شبلی' میں لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی اور ڈاکٹر انصاری کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت جوان تھے اور مولانا بوڑھے۔ اس پر یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ ہو کر دلی جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے الوداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعتہ اُس ہمہ تن جوش، علامۂ وقت کا سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہ جھکا تھا، دفعتہ ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا، آنسوؤں نے اس کے گرد وغبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی حمیت کے اُن گہر ہائے گرانمایہ کو لے کر آگے بڑھی۔ وفد کی واپسی پر شبلی نے اسی طرح "اسلامی غیرت وحمیت" کا ایک بار پھر مظاہرہ کرنا چاہا مگر ڈاکٹر انصاری نے انھیں روک دیا۔ ان اقتباسات سے شبلی کے دل میں ترک بھائیوں کے ساتھ جو قلبی لگاؤ تھا اس کا پتہ چلتا ہے۔"[15]

واقعتہً کیسا دلگداز رہا ہوگا وہ منظر جب اپنی عمر سے آدھی عمر کے جوان کے بوٹ پر "غزالی زماں" بے ساختہ جھک پڑا، یقیناً یہ کارفرمائی تھی سوز دروں کی۔

جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری طبی وفد واپس لے کر آئے تو اس وقت علامہ شبلی بمبئی میں مقیم تھے، خیر مقدمی جلسے کے لیے اثر میں ڈوبی ہوئی استقبالیہ نظم لکھی۔ چند اشعار درج ذیل ہیں جن میں شکر باری تعالی کے بعد ڈاکٹر صاحب کو بے حد وقیع اور بلند الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں، سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے ترکی بھائیوں کے لیے ان کے برادرانہ جذبہ ایثار وتعاون کو سلام کرتے ہیں کہ انھوں نے فرض کفایہ ادا کیا ہے، اس نظم میں وہاں کے دل خراش واقعات کی تصویر کشی ہے اور آخر میں مومنانہ جذبات سے سرشار شاعر مایوسی کی

شبلی کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگا یئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی 'حیات شبلی' میں لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی اور ڈاکٹر انصاری کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت جوان تھے اور مولانا بوڑھے۔ اس پر یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ ہو کر دلی جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے الوداعی سلام کر رہے ہیں۔

مہیب تاریکیوں کے خلاف امید کی شمع فروزاں رکھ رہا ہے اور یہ پیغام دے رہا ہے کہ حالات کی نامساعدت سے دل گرفتگی ہمارا شیوہ نہیں، بلکہ ہمارا قوی ایمان ہے کہ حالات بدلیں گے، تاریخ نئی کروٹ لے گی، ظلم کو پسپائی اور حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔

اشعار ملاحظہ ہوں:

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
تمھیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھوگے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خونخواری
نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمھارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی
تمھارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روزافزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنان بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
تمھیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدان وطن کے جامۂ پر خوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مسلم لیگ جس نے روز قیام سے ہی حکومت وقت، سرکار برطانیہ کی اطاعت ووفاداری کا طوق گلے میں ڈال رکھا تھا، حکومت کے ہر حکم کی بجا آوری جس کا شیوہ تھا، اس کی پالیسیاں بھی بیزار کن تھیں، ظاہر ہے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے حالات میں یہ سلسلہ تادیر جاری رہنے والا نہ تھا، چنانچہ برطانوی حکومت کے خلاف جب مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا اور اس کا اثر لیگ پر بھی (حکومت برطانیہ کے ساتھ جذبۂ خیر خواہی کے نتیجہ میں) پڑا۔ ان حالات میں لیگ کے خلاف ماحول سازی میں علامہ شبلی کی نظموں کا بڑا حصہ ہے "وہ مسلم لیگ کی سیاست سے خاص کر اس کی بے عملی، برطانیہ پرستی اور مسلم دشمنی کے افکار اور پالیسیوں سے سخت بیزار تھے"[16] "مسلم لیگ پر شبلی کی نظمیں پڑھ کر یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ شبلی کو مسلم لیگ کی اس دور کی سیاست سے اس کی آئندہ علیحدگی پسند اور فرقہ وارانہ روش کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ مسلم لیگ کے مخالف تھے اور مسلم لیگ کی سیاست کو ملک کے مفاد کے منافی سمجھتے تھے"[17] اپنی ایک نظم میں لیگ کے تن آسان عہدیداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

پھر اس کو حکومت کا وفادار قرار دے کر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کی عادی ہے:

مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

پھر ایک نظم میں کہتے ہیں:

آزادی خیال پہ تم کو ہے گر غرور
تو لیگ کو بھی شان غلامی پہ ناز ہے

ان طنزیہ نظموں سے مسلم لیگ پر بڑی ضرب پڑتی رہی، مولوی سید طفیل احمد نے اپنی کتاب "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں جن لوگوں نے خاص کام کیا، ان میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے۔[18]

مچھلی بازار مسجد کان پور کی انہدامی کارروائی کے خونی موقع

پر جب خالی ہاتھ مسلمانوں نے ایک جلسہ عام کے بعد جلوس کی شکل میں وہاں پہونچ کر مسجد کے منہدم شدہ حصے کو ازسرِ نو تعمیر کرنا چاہا اور مسلح فوج نے نہتے مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں برسا کر "مشہدِ اکبر" برپا کردیا تو اس موقع پر شبلی کا حساس اور دردمند دل تڑپ اٹھا، نالہ ہائے دل زبان سے نکلے اور دل دوز نظموں کی شکل میں ظاہر ہوئے، ان نظموں میں سے "کشتگان معرکہ کان پور" پوری نقل کی جارہی ہے جس کا ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پر جوش شاعر میدان جنگ میں بے گور و کفن زخموں سے چور لاشوں کے درمیان ہے اور ایک ایک لاش کے پاس جا کر پرسش احوال کررہا ہے، بے قصوروں سے ان کا "جرم" دریافت کررہا ہے، باپ کی انگلی پکڑ کر سیر کو نکلنے والا خورد سال بچہ جو شدت طلب میں اس وقت باپ سے ہم آغوش ہے، مگر مردہ۔ بے ترتیب لاشوں کے ڈھیر میں اور جوان اولاد جس کو باپ کی سرپرستی کی ضرورت تھی وہ پر نور مگر خاک وخوں میں لتھڑی ہوئی بوڑھے باپ کی لاش کے قدموں میں پڑی منتظرِ حکم ہے۔ مگر کسی کو نہ سوال کی گنجائش ہے نہ جواب کا موقع، یہاں تو سب کے سب جام شہادت پی کر مست پڑے ہوئے ہیں اور گویا سانس روک کر صور پھونکے جانے کے منتظر ہیں، حشر برپا ہونے کے منتظر ہیں جب رب ذوالجلال کے دربار میں ان کا مقدمہ پیش ہوگا اور وہ مظلومانہ شہادت کا انعام پائیں گے۔ ہاں اُن شہدا نے ہمارے شاعر کا زیادہ امتحان نہ لیا اور اتنا ضرور کہہ دیا کہ "ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں"۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ تو ہیں مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے، منتظرِ نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
"ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں"

ان کے علاوہ متعدد نظمیں ہیں جو ان کے حساس دل کی ترجمان ہیں، ان کو پڑھنے سے واضح طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اسلام کی عظمت و فوقیت، اس کی برتری و سربلندی، اور عروج و کامرانی کے دلی خواہش مند اور اسی فکر کے علمبردار تھے۔ اسی دردمندی نے ان کو پوری عمر بے قرار رکھا، اسی بے قراری اور جوش و جذبہ کو لے کر وہ تا زندگی ساعی و کوشاں رہے، اسی درد و بے قراری کو عام کرنے کی فکر میں سرگرم سفر رہے۔ "تحریک ندوۃ العلماء کی سرگرم اور کامیاب نمائندگی ہو، یا دارالمصنّفین کی تجویز کا خاکہ، ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کا مطمح نظر یہی رہا کہ مسلمانوں کے قومی، ملکی، سیاسی، تمدنی اور علمی فتوحات کے بیان کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کا نام سربلند اور دشمنان اسلام کی تدلیسات اور تلبیسات کا پردہ

> **تحریک ندوۃالعلما. کی سرگرم اور کامیاب نمائندگی ہو،یا دارالمصنّفین کی تجویز کا خاکہ،ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کا مطمح نظر یہی رہا کہ مسلمانوں کے قومی، ملکی، سیاسی، تمدنی اور علمی فتوحات کے بیان کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کا نام سربلند اور دشمنان اسلام کی تدلیسات اور تلبیسات کا پردہ چاک کر دیا جائے" 19 اور یہی دردمندی اور یہی جذبہ وہ اپنی نسل میں پیدا کرنے کے آرزومند تھے**

چاک کردیا جائے"[19] اور یہی دردمندی اور یہی جذبہ وہ اپنی نسل میں پیدا کرنے کے آرزومند تھے اسی لیے طلبائے ندوۃ العلماء سے خطاب میں انھوں نے کہا تھا:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

اپنی اس تحریر کو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے اس تبصرے پر ختم کرتا ہوں۔

"علامہ شبلی کی اردو شاعری کے اس مختصر جائزہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر انھوں نے اس کی طرف توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے معاصرین میں سب پر فائق ہوتے باوجود اس کے ان کی اردو شاعری اور خاص طور سے تاریخی، قومی اور سیاسی نظمیں کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی۔"[20]

حواشی

(1) متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص 109، طبع اول 2008، اعظم گڑھ
(2) شبلی کی شاعری کے اصلاحی پہلو، مسعود الرحمن خاں ندوی، سہ ماہی کاروان ادب، ص 101، جنوری تا مارچ 1996، مقام اشاعت: ندوۃ العلما لکھنؤ
(3) کلیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دیباچہ طبع اول، ص 1، ناشر دار المصنفین، اعظم گڑھ
(4) متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص 109، طبع اول 2008، اعظم گڑھ
(5) شبلی کی شاعری کے اصلاحی پہلو، مسعود الرحمن خاں ندوی، سہ ماہی کاروان ادب، ص 101، جنوری تا مارچ 1996، مقام اشاعت: ندوۃ العلما لکھنؤ
(6) یادرفتگاں، علامہ سید سلیمان ندوی، ص 23
(7) علامہ شبلی کا علمی و فکری سرمایہ، از: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، سہ ماہی مطالعات، ص 56، ج 7، ش 4، اکتوبر تا دسمبر 2012، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی 25
(8) متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص 110، طبع اول 2008، اعظم گڑھ
(9) مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص 136، ایڈیشن دسمبر 1999، ناشر دار المصنفین، اعظم گڑھ
(10) کلیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دیباچہ طبع اول، ص 1، ناشر دار المصنفین، اعظم گڑھ
(11) مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص 137,138، ایڈیشن دسمبر 1999، ناشر دار المصنفین، اعظم گڑھ
(12) شبلی اور جدید ذہن، از: علی حماد عباسی، ماہ نامہ صبح ادب، ص 47، اپریل مئی 1976، ش 19-18، مقام اشاعت: محمود منزل گوئن روڈ لکھنؤ
(13) شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص 191، طبع اول 2012، ادبی دائرہ اعظم گڑھ
(14) یادرفتگاں، علامہ سید سلیمان ندوی، ص 166
(15) شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، سید شہاب الدین دسنوی، ص 25، اشاعت 1987، بہ اہتمام ایم حبیب خاں، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند)
(16) شبلی کی شاعری کے اصلاحی پہلو، مسعود الرحمن خاں ندوی، سہ ماہی کاروان ادب، ص 107، جنوری تا مارچ 1996، مقام اشاعت: ندوۃ العلماء لکھنؤ
(17) شبلی اور جدید ذہن، از: علی حماد عباسی، ماہ نامہ صبح ادب، ص 47، اپریل مئی 1976، ش 19-18، مقام اشاعت: محمود منزل گوئن روڈ لکھنؤ
(18) مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص 120، ایڈیشن دسمبر 1999، ناشر دار المصنفین، اعظم گڑھ
(19) علامہ شبلی کی شخصیت اسلام اور ادب کا بہترین امتزاج، از: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، سہ ماہی کاروان ادب، ص 195، جنوری تا مارچ 1995، مقام اشاعت: ندوۃ العلما لکھنؤ
(20) متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص 120، طبع اول 2008، اعظم گڑھ

Saudul Hasan Nadvi, Madarsa Deniya, Zere Qila, Gazhipur- 233001 (UP)

شاہنواز فیاض

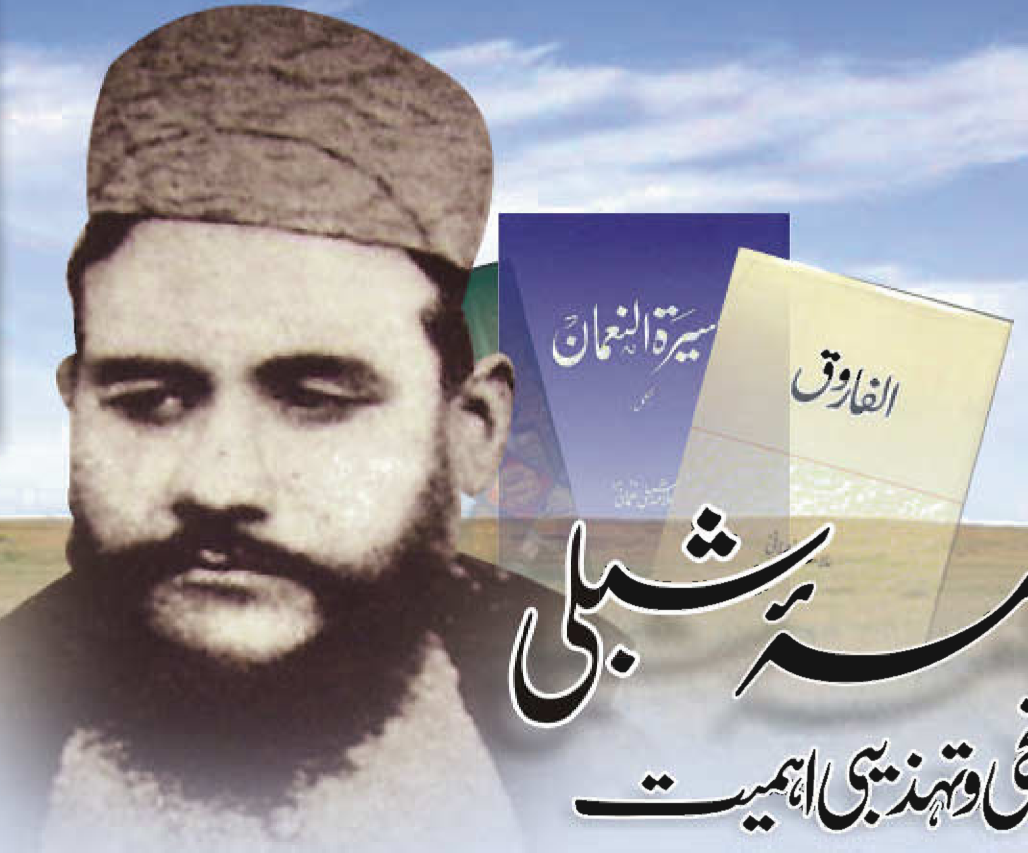

سفرنامۂ شبلی
کی تاریخی وتہذیبی اہمیت

شمس العلما شبلی نعمانی (1857-1914) کی تحقیق ہو یا تنقید، شاعری ہو یا سیرت نگاری، سفر نامہ ہو یا مکتوب نگاری، سب پر ایک عرصے سے لکھا جا رہا ہے اور ان کی فکر وتحقیق کی داد دی جا رہی ہے۔ اسی تناظر میں شبلی کا سفرنامہ 'سفرنامۂ روم ومصر وشام' بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی دیگر تصنیفات کے مقابلے میں اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی حالانکہ فنی اعتبار سے اس کا مرتبہ بلند ہے ایک طرف جہاں یہ سفرنامے کے فنی آداب کا شاہ کار ہے وہیں بعض لوگوں نے اسے تعلیمی رپورٹ کے طور پر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ نیز یہ سفرنامہ شبلی کی ملی دردمندی کا بھی آئینہ دار ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس سفرنامے کو تہذیبی اور تاریخی سیاق میں بھی دیکھا گیا ہے البتہ اس حوالے سے لوگوں کی توجہ ذرا کم رہی ہے۔

ان کے ذہن میں قدیم وجدید تعلیم کا فرق بالکل واضح تھا۔ اس سفر کا بنیادی سبب مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک اور مقصد تھا جو ان کو سفر کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ وہ تھا مسلمانوں کی تعلیم اور گرتے ہوئے معیار کا جائزہ اور مستقبل کی پیش بندی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون سے عوامل ہیں، جن کی وجہ سے مسلمان تعلیم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کا یہ سفر/26 اپریل 1892 کو علی گڑھ سے شروع ہوا۔ یہاں سے وہ ممبئی پہنچے، وہاں پہنچ کر ضروری سامانِ سفر لیا۔ اگلے دن جہاز جب ممبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تو اس وقت ذرہ برابر بھی کسی چیز کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن جہاز جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، لوگوں کی حالت غیر ہونے لگی، جیسا کی پانی کے سفر میں عام طور پر ہوتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی سفرنامہ لکھنے کا مطلق ارادہ نہیں رکھتے تھے اور اسی لیے دوران سفر جو کچھ دیکھا، یا جو چیزیں ذہن نشیں رہیں، اور وہ خطوط جو انھوں نے وہاں سے مختلف لوگوں کو لکھے تھے، انھی سب کے پیش نظر یہ تاریخی سفرنامہ 'سفرنامۂ روم ومصر وشام' لکھا۔ وہ سوچتے تھے کہ مسلمانوں کی خوشحالی اور ان کے جاہ وجلال کو دیکھ کر تسلی ہوگی، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے خود اپنے والد کو ایک خط میں لکھا ہے:

"اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی وقوت کی نسبت بالکل برباد ہوگئی ہیں، کیونکہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں، تاہم سفر بے شبہ ضروری تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزاروں کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔"

مکاتیب شبلی، حصہ دوم، مرتب سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکادمی، اعظم گڑھ، یوپی، سنہ 2010 ص 23

علامہ شبلی نعمانی کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے کس طرح کے جذبات تھے۔ سفرنامے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نعمانی کے دل میں مسلمانوں کی تعلیم کے تئیں کس طرح کے خیالات اور تاثرات تھے۔ وہ مسلمانوں کی ترقی وترویج کے لیے کوشاں رہے۔ مولانا جدید وقدیم نصاب تعلیم کی دوری کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ سفرنامے میں مسجد، مدرسہ اور مسلمانوں کی پسماندگی اور ان کی تعلیم سے دوری کا مسئلہ ہی مرکزی حیثیت کا ہے۔ کیونکہ ان کے سفر کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا، تو یہاں کی طرزِ تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہو سکا کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔"

سفرنامۂ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، یوپی، فروری/1999 ص 43

علامہ شبلی نعمانی مسلمانوں کی تعلیم اور اس کے نتائج سے حد درجہ رنجیدہ تھے۔ قسطنطنیہ کے ایک کالج میں اعلی کلاسوں میں زیر تعلیم طلبا کی اکثریت عیسائیت کی علمبردار تھی۔ جبکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو تھے ان کے نتائج بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھے۔ اس سلسلے میں مولانا کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"حقیقت یہ ہے کہ وسعت عمارت، فراہمی آلات علمی، وسعت تعلیم اورخوبیِ انتظام کے لحاظ سے تمام قسطنطنیہ میں اس سے عمدہ تر کوئی کالج نہیں ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ اس کی اعلیٰ کلاسوں میں تعلیم پانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، شیخ عبدالفتاح آفندی نے مجھ کو سال رواں کی رپورٹ نتیجہ امتحانہ عنایت کی تھی، اس میں جس قدر اعلیٰ درجے کے امتحانات پاس کرنے والے ہیں، اکثر عیسائی ہیں، مجھ کو خدانخواستہ عیسائیوں کی ترقی پر حسد نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے تنزل کا رنج ضرور ہے۔"

سفر نامۂ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ، یوپی، 1999، ص64

حقیقت یہ ہے کہ سفر شام و روم نے علامہ شبلی نعمانی کے ذہن کو یکسر بدل دیا۔ جن چیزوں کے بارے میں علامہ نے پڑھا یا سنا تھا، اب ان سب چیزوں کو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مغربی ممالک نے مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا، وہ یقیناً بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا شبلی کو بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے ترکوں کے علمی نصاب کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر یہی نصاب اور طریقۂ تعلیم رہا تو مسلم قوم کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ علامہ شبلی نے اس سفر میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتیجہ اخذ کیا اس کی عملی شکل 'ندوۃ العلما' میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ مولانا تعلیم میں دوئی کے قائل نہیں تھے۔ قدیم وجدید تعلیم کو الگ کرنے کے نہیں بلکہ نصاب کو اس طرح تیار کرنے کے حق میں تھے کہ دونوں تعلیم کو ایک ساتھ لے کر چلا جائے۔ کیونکہ جدید تعلیم کے نصاب ایسے نہیں تھے جس سے عربی یا اسلامی تعلیم کو مکمل طور پر حاصل کیا جا سکے اور انھیں یہ اندیشہ تھا کہ جدید تعلیم سے کہیں ہماری مذہبی حیثیت کا شیرازہ ہی نہ بکھر جائے۔ اس لیے وہ قدیم وجدید تعلیم کو الگ کر کے نہیں بلکہ ایک ساتھ لے کر چلنے کے حق میں تھے۔

آج ہندوستان کے بیشتر مدارس کا نصاب اسی اصول کے حق میں ہے اور بہت حد تک اسی پر گامزن بھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کو ترکی کے کالجوں کی جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی، وہ وہاں کے کالجوں کا بورڈنگ سسٹم تھا۔ اس طرح کا سسٹم کہیں اور نہیں تھا، جس میں طالب علم صرف طالب علم رہے۔ اس کی شناخت امیری اور غریبی نہ بنے۔ وہاں بورڈنگ اور خوراک کی فیس کے ساتھ ساتھ کپڑوں کے لیے بھی طلبہ سے پیسے لیے جاتے تھے اور طلبہ کے کپڑے کا انتظام خود کالج کے ذمے تھا۔ ان کے کھانے کی بھی ایک ہی جگہ تھی۔ جہاں سب لوگ ایک ساتھ بڑے اہتمام اور مہذب طریقے سے کھاتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ صفائی وغیرہ کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ ترکی کی سب سے زیادہ قابلِ فخر بات ان کی فیاضی تھی۔ کیونکہ زیادہ فیس ہونے کے باوجود وہاں کے غریب طلبہ بھی اچھی خاصی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سفر شام و روم نے علامہ شبلی نعمانی کے ذہن کو یکسر بدل دیا۔ جن چیزوں کے بارے میں علامہ نے پڑھایا سنا تھا، اب ان سب چیزوں کو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مغربی ممالک نے مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا، وہ یقینا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا شبلی کو بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے ترکوں کے علمی نصاب کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر یہی نصاب اور طریقۂ تعلیم رہا تو مسلم قوم کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

کالج کے احاطے میں سارے طالب علم یکساں تھے۔ لباس کا ایسا معیار رکھا گیا تھا کہ اس سے کسی طالب علم کی شناخت مشکل تھی۔ یہ یقیناً بڑا احسن قدم تھا۔ ترکوں کا ایک اور قابل فخر کارنامہ یہ بھی تھا کہ نصاب تعلیم کی تمام کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ موجود تھا۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"...فرنچ زبان کی تاریخیں، ڈرامے، ناول، سفر نامے، کتب انشاء وبلاغت، اس کثرت سے ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں کہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ فرانس کا پورا علم ادب ترکی زبان میں آگیا ہے، علوم وفنون جدیدہ کی بھی سیکڑوں کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں اور اسی کا اثر ہے کہ ترکی کے تمام کالجوں میں، بجز مکتبِ سلطانیہ کے ان علوم وفنون کی تعلیم ترکی ہی زبان میں ہوتی ہے اور اعلیٰ درجے پر ہوتی ہے۔"

سفر نامۂ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ، یوپی، 1999، ص70

کسی بھی ملک کی ترقی تبھی ممکن ہے، جب وہ اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت کرے۔ زبان کی حفاظت کا سب سے آسان طریقہ مادری زبان میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ اس اعتبار سے اہلِ ترکی نے اپنی مادری زبان سے خود کو بہت حد تک جوڑے رکھا۔ اسی وجہ سے بہت ساری اہم کتابوں کا

ترجمہ بھی کیا گیا۔لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ ترکی میں پورا زور فنِ ترجمہ پر تھا۔نہیں بلکہ یہاں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی کثرت سے جاری تھا۔اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ کالجز اور اسکولوں کے نصاب تعلیم میں شامل بیشتر کتابیں یہیں کے لوگوں نے تحریر کی ہیں۔

اس زمانے میں ترکی میں خانقاہیں کثرت سے تھیں۔ لیکن ہندوستان کی خانقاہوں کا ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں دیکھ کر ترکوں کی فیاضی پر رشک آتا ہے۔ترکی کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہر ملک اور فرقے کے لیے الگ الگ خانقاہیں تھیں۔اس ملک یا فرقے کا کوئی بھی شخص اگر ادھر آگیا تو وہ بغیر کسی دقت کے اس خانقاہ میں رک سکتا تھا اور اس کی مہمان نوازی وہاں کے لوگ کرتے تھے۔کھانے اور چائے کا انتظام مفت ہوتا تھا اور مدت قیام کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ حسب منشا قیام کیا جاسکتا تھا اور لوگ کرتے بھی تھے۔لیکن اس طرح کی آسانی اور سہولتوں کا لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔کچھ لوگ تو ان خانقاہوں میں کئی کئی سال تک قیام کرتے تھے۔یہ خانقاہیں ان کی تن آسانی کا اڈہ بن گئی تھیں۔علامہ شبلی نعمانی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو سیر وسیاحت، جغرافیانہ تحقیقات، تحصیل علم کا مذاق تو جاتا رہا، اس لیے اب یہ طریقہ کاہلی، مفت خوری، دریوزہ گری کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے اور قومی زندگی کو نہایت نقصان پہنچا رہا ہے۔ میں نے اکثر خانقاہوں میں جا کر خود دیکھا ہے، کئی کئی برسوں کے آئے ہوئے مسافر پڑے ہیں، نہ کسی قسم کا شغل ہے نہ کچھ کام ہے۔''

سفر نامۂ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ، یوپی، 1999، ص 86

قسطنطنیہ میں دیکھنے کے قابل وہاں کی جامع مسجدیں ہیں۔ کیونکہ وہاں جامع مسجدوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود، جس طرح کی شان وشوکت سے مزین ہیں، شاید اس وقت پوری دنیا میں اس طرح کی دوسری کوئی مثال نہیں تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہاں جتنے بھی فرماں روا گزرے تھے، تقریباً سب کی اپنی الگ جامع مسجد تھی۔جس چیز کی تعمیر فرماں روا کی نگرانی میں ہو، اس کا عالیشان ہونا فطری امر تھا۔ شبلی نے ترکی کی مسجدوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان کی مسجدوں سے موازنہ بھی کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ان مسجدوں کی وضع ہمارے یہاں کی مساجد سے بالکل الگ ہے، نہ دالان، نہ محرابیں، نہ صحن، صرف ایک گنبد ہوتا ہے، لیکن اس قدر وسیع کہ کئی ہزار آدمی اس میں آسکتے ہیں، اگرچہ ہندوستان کے مذاق کے لحاظ سے ان مسجدوں کو خوبصورت اور موزوں نہیں کہہ سکتے ، تاہم گنبد کی بے انتہا وسعت اور عمارت کا ارتفاع انسان کو دفعتاً متحیر بلکہ مرعوب اور حیرت زدہ کر دیتا ہے۔'' ایضاً، ص 87

علامہ شبلی نے سفر نامہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے۔ اسپین میں جب اسلامی حکومت برباد ہوگئی اور عیسائیوں کی بادشاہت قائم ہوئی تو مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کے لیے مجبور ہونا پڑا۔عیسائی حکمرانوں کا فرمان نہ ماننے والوں کو سخت اذیت سہنی پڑتی تھی۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ مولانا شبلی نے سفر نامے میں بیان کیا ہے۔مولانا کا کسی مقام سے گزر ہو رہا تھا، کہ اچانک انھوں نے دیکھا ایک الگ کمرے میں چند عورتیں ہیں ان میں کسی کو شکنجے سے دبایا جارہا ہے، تو کسی کی پیٹھ پر جلتے ہوئے لوہے کی پٹری رکھ دی گئی اور دیگر لوگوں کو بھی اسی طرح کی غیر انسانی اذیت دی جارہی تھی۔

ترکوں کی معاشرت میں ایک ایسی چیز جو پسندیدگی کے لائق تھی، وہ وہاں کی سادگی تھی۔ باوجود نفاست پسندی اور اعلیٰ دماغی کے، فضول شان وشوکت کا نام نہیں۔ کیونکہ بڑے بڑے امرا اور وزرا باہر نکلتے تھے تو بڑی سادگی سے نکلتے تھے۔ مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی تھی۔ترکوں کی تہذیب وترقی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل تقلید تھی وہ عورتوں کی تعلیم وتربیت وطریقۂ معاشرت تھی۔وہاں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرکاری اور خانگی مدرسے کثرت سے تھے۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پردہ اور حفاظت کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ کسی کو بھی اپنی بچیوں کو بھیجنے میں کوئی تامل نہیں تھا اور یقیناً کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے تعلیم ہی ضروری ہے۔ کیونکہ تعلیم کے ذریعے ہی ایک اچھے سماج کی تشکیل ممکن ہے۔

شبلی نعمانی کا یہ سفر نامہ دور حاضر کے لیے ان جگھوں کی قدیم تاریخ اور تہذیب کا ایک ایسا اثاثہ ہے کہ ماضی کا پورا معاشرہ ہماری نظروں میں آجاتا ہے۔ تہذیب بھی تاریخ کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے مولانا کے اس سفر نامے کو وہاں کی تاریخی اور تہذیبی حیثیت سے ایک مکمل دستاویز کہنا بے جا نہ ہوگا۔یہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں عام معلومات کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ شبلی کا یہ سفر کسی خاص وجہ سے تھا۔

ممالک اسلامیہ میں جو مقامات اس وقت تک تعلیم کے مرکز خیال کیے جاتے رہے، وہ قسطنطنیہ اور قاہرہ تھے۔ اسی غرض سے علامہ شبلی نعمانی نے ان دونوں ملکوں کے بیک وقت سفر کا ارادہ کیا۔قاہرہ پہنچ کر مولانا نے تعلیمی اداروں کے اعلیٰ عہدے داروں سے ملاقاتیں کی، سالانہ رپورٹیں پڑھیں، کالجوں کے پروگرام میں شریک ہوئے، اور اساتذہ کے درس دینے کا طریقہ دیکھا۔لیکن مولانا کو جو وسعت قسطنطنیہ میں تعلیم کے حوالے سے دیکھنے کو ملی تھی قاہرہ میں نہیں تھی۔مصر میں فرنچ زبان کا بول بالا رہا ہے۔

جامعہ ازہر کی ابتدائی تاریخ علامہ شبلی نے مختصراً بیان کی ہے۔لیکن کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جو چھوٹ گیا ہو۔ وہاں کے بورڈنگ کے مطبخ کا ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ ''معمولی کھانا خود ازہر سے ملتا ہے'' اس معمولی کھانے میں صرف روٹیاں ہی ہوتی تھیں باقی چیزیں باہر سے لینی پڑتی تھیں۔لیکن روٹیوں کے دینے کا طریقہ نہایت ہی غیر اخلاقی تھا۔ اس سے وہاں کی معاشرت اور لوگوں کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔طلبہ کو روٹی دینے کے وقت ایک سائل کی طرح کھڑا کر دیا جاتا تھا۔اس سے متعلق علامہ شبلی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''روٹیوں کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ وقت معین پر طلبہ کا ایک گروہ بازار میں (خود مسجد کے سامنے) دورویہ صف باندھ کر کھڑا ہوجاتا ہے اور روٹیاں تقسیم ہونی شروع ہوجاتی ہیں۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے، اور یہ سلسلہ کئی گھنٹہ قائم رہتا ہے، طالب علموں کے ہاتھ میں کوئی تولیہ یا رومال نہیں ہوتا، جس طرح بھیک منگے جو کچھ ملتا ہے ہاتھ پھیلا کر لے لیتے ہیں ان طالب علموں کا بھی یہی حال ہے۔'' ایضاً، ص 174

شبلی نعمانی کا یہ سفر نامہ دور حاضر کے لیے ان جگھوں کی قدیم تاریخ اور تہذیب کا ایک ایسا اثاثہ ہے کہ ماضی کا پورا معاشرہ ہماری نظروں میں آجاتا ہے۔تہذیب بھی تاریخ کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے مولانا کے اس سفر نامے کو وہاں کی تاریخی اور تہذیبی حیثیت سے ایک مکمل دستاویز کہنا بے جا نہ ہوگا۔یہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں عام معلومات کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ شبلی کا یہ سفر کسی خاص وجہ سے تھا۔ وہ وہاں کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینا چاہتے تھے اور اس سے متعلق معلومات اور دلچسپی دونوں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

■

Shah Nawaz Fayyaz, Research Scholar, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

خالد ندیم

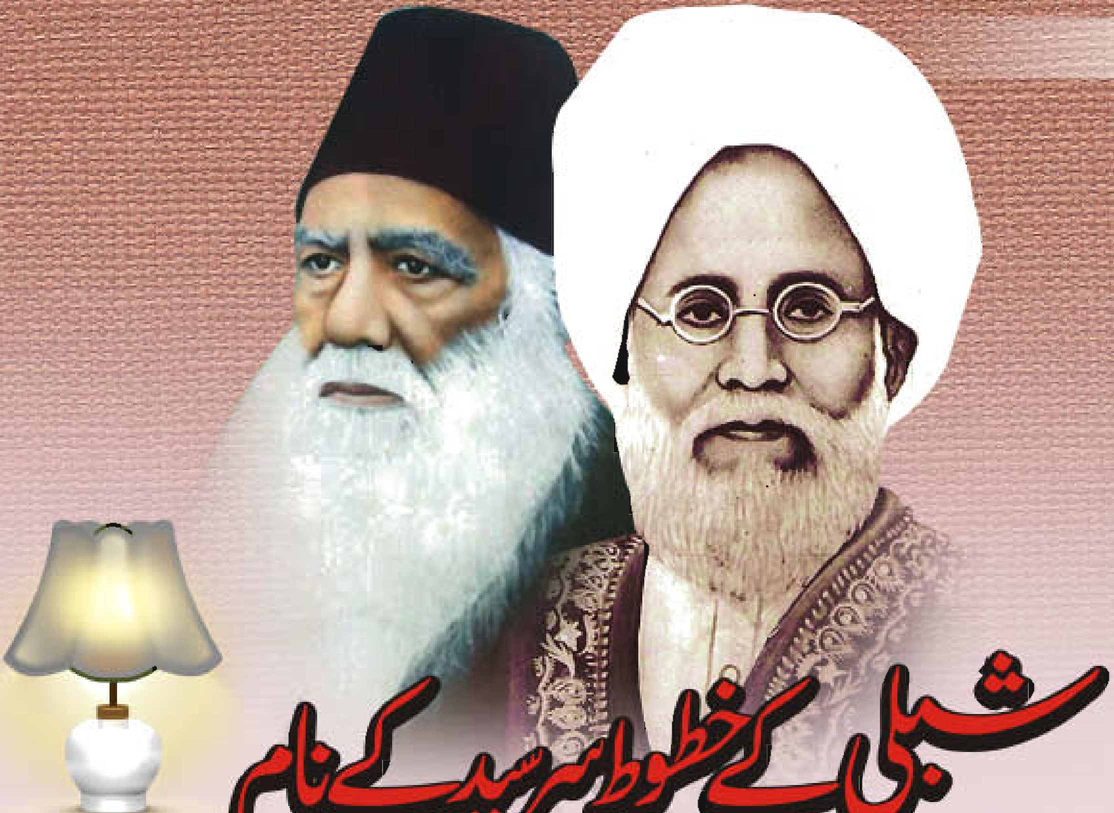

شبلی کے خطوط سرسید کے نام

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ 98 مکتوب الیہم کے نام ان کے 1059 مکاتیب میں سے سرسید کے نام محض سولہ دستیاب خطوط کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان سے شبلی کے نظریات یا اسلوب پر بحیثیت مجموعی بات ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ شبلی و سرسید اپنے وقت کے دو عبقری تھے، اس لیے ان کی خط کتابت سے اُس عہد کے خیالات، موضوعات اور اندازِ فکر و نظر پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔

شبلی 1857 میں پیدا ہوئے، جب جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سرسید آئینِ اکبری کی تدوین سے اسبابِ بغاوتِ ہند کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور پھر جب شبلی نے پچیس برس کی عمر میں علی گڑھ میں قدم رکھا تو ہندوستانی دانش سرسید کی جلائی ہوئی مشعل کی روشنی میں اپنا سفر طے کرنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ 1883 سے علی گڑھ میں دونوں بظاہر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ذہنی و نظریاتی طور پر بتدریج دُور ہوتے گئے اور اختلافات کی خلیج بڑھتی رہی، حتیٰ کہ شبلی کو سرسید پر براہِ راست تنقید کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سرسید احمد خاں کے نام علامہ شبلی کے سولہ دستیاب خطوں میں سے پہلا خط بغیر تاریخ کے ہے، لیکن اس پر سرسید احمد خاں نے 4 جنوری 1879 کو ایک نوٹ لکھا تھا، جب کہ آخری معلومہ خط 12 ستمبر 1895 کا تحریر کردہ ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 4 جنوری 1879 کو لکھا گیا شبلی کا خط سرسید کے نام اوّلین خط نہیں ہے، کیونکہ اس میں شبلی نے کچھ روز پہلے لکھے گئے ایک خط کا ذکر کیا ہے۔[1] بہر حال دستیاب خطوں کے مطابق اس خط کتابت کا دورانیہ جنوری 1879 سے 12 ستمبر 1895 تک، یعنی کم و بیش سترہ برسوں پر محیط ہے۔ ذیل میں ان دستیاب خطوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے، ساتھ ہی ان خطوں کے ماٰخذ بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ جن خطوں میں مقام تحریر درج نہیں وہاں 'م ن'، یعنی مقام ندارد لکھ دیا گیا ہے، البتہ جن مکتوبات سے اندرونی شہادت ملی، وہاں مقامِ تحریر کے بعد سوالیہ نشان دے دیا گیا ہے:

الٰہ آباد، ت ن، مکتوباتِ شبلی
م ن، 4 مئی 1883، مکتوباتِ شبلی
م ن، 19 دسمبر 1883، مکتوباتِ شبلی
م ن، 15 جون 1884، مکتوباتِ شبلی
م ن، 8 اگست 1884، مکتوباتِ شبلی
م ن، 24 اپریل 1885، مکتوباتِ شبلی
م ن، 14 جون 1886، مکتوباتِ شبلی
اعظم گڑھ؟، یکم جون 1890، مکتوباتِ شبلی
م ن، 2 دسمبر 1891، مکتوباتِ شبلی
عدن؟، روز شنبہ 8 مئی 1892، مکتوباتِ شبلی
قسطنطنیہ، 25 مئی 1892، مکاتیبِ شبلی اوّل
بابِ عالی، 15 جون 1892، مکاتیبِ شبلی اوّل
م ن، 5 محرم الحرام 1310ھ، مکتوباتِ شبلی
م ن، 20 جنوری 1895، مکتوباتِ شبلی
م ن، 22 جنوری 1895، مکتوباتِ شبلی
اعظم گڑھ، 12 ستمبر 1895، مکاتیبِ شبلی اوّل

علامہ شبلی نے سرسید احمد خاں کو ہمیشہ نہایت ادب و احترام سے مخاطب کیا، مثلاً 'حضرت بندہ'، 'بحضورِ اقدس'، 'بحضرتِ اقدس'، 'حضرتِ اقدس'، 'حضرت سید اقدس'، 'سیدی و سیدے'، 'سیدی'، 'جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب'، 'قبلہ ام'، 'سیدنا و مولانا'، 'سیدی و مولائی'، 'مطاعی'۔ سلام و آداب کا بالخصوص التزام نہیں کرتے، البتہ کسی کسی خط میں 'تسلیم'، ''ادام اللہ بقاءہ''، 'دام فضلکم'، 'القابکم اللہ' جیسے الفاظ مل جاتے ہیں۔

شبلی خطوں کا اختتامیہ مختلف انداز میں کرتے ہیں۔ بالعموم تو وہ اپنا نام 'شبلی نعمانی' لکھتے تھے؛ لیکن کبھی 'محمد شبلی'، کبھی 'محمد شبلی نعمانی' اور بعض اوقات صرف 'شبلی' لکھتے تھے، البتہ ایک خط میں نام سے پہلے 'خادم' اور ایک دوسرے خط میں 'خادم قدیم' کے الفاظ بڑھائے۔ سرسید کے نام اوّلین خط میں شبلی نے اپنا پورا پتا 'از الٰہ آباد، محلہ کرنیل گنج، مکان بابو ہری موہن داس صاحب' درج کیا۔ اسی طرح 25 مئی 1892 کے ایک خط پر بھی انھوں نے اپنا پورا پتا تحریر کیا۔

شبلی تاریخ تحریر یا مقامِ تحریر کا التزام باقاعدگی سے نہیں کرتے۔ زمانۂ تحریر اکثر درج کرتے ہیں، جس کی

ترتیب تاریخ، ماہ اور سال ہوتی ہے۔ کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو 'یکم' کے بجائے '1' سے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً '1 جون 1890'۔ ایک خط پر دن بھی تحریر کیا ہے، یعنی 'روز شنبہ 8 مئی 1892'۔ تاریخ تحریر کے سلسلے میں ایک خط میں انھوں نے ہجری تقویم سے بھی کام لیا ہے، یعنی '5 محرم 1310'۔ مقامِ تحریر کے حوالے سے وہ اکثر تساہل سے کام لیتے ہیں، چنانچہ سرسید کے نام بارہ خطوں میں اس سے اغماض برتا گیا ہے۔

سرسید کے نام شبلی کے محض تین خط مفصل کہلا سکتے ہیں، باقی تمام خطوط مختصر تحریریں، یعنی رقعات کی ذیل میں آتے ہیں، حتیٰ کہ چند مکاتیب میں تو مکتوب نگار نے فقط دو تین جملوں پر اکتفا کیا ہے۔

پہلا خط ایک بائیس سالہ نوجوان کا ایک معروف شخصیت سے تخاطب ظاہر کرتا ہے۔ یہ خط ایک ضرورت کے پیشِ نظر لکھا گیا، اس لیے اس کے اسلوب میں تعلقِ خاطر کی جگہ ایک اجنبیت پائی جاتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

اس سے کچھ روز پہلے ایک خط بغرضِ دریافت قیمت تہذیب الاخلاق ارسال کیا تھا، لیکن اب تک جواب سے مشرف نہ ہوا۔ غالباً وہ خط بھی نہیں پہنچا، ورنہ منفرداً ومشترکاً سے بہت جلد مطلع فرمائیے گا۔ خطباتِ احمدیہ کی کیا قیمت ہوگی اور آیا آپ غریب طالب علموں کے لیے کچھ کمی ہے یا نہیں۔ اردو خطباتِ احمدیہ (اگر جداگانہ مطبوع ہوئی ہو) کی بھی قیمت سے بھی آگاہ فرمائیے گا۔ سنینِ اسلام کی دوسری جلد ہو تو مطلع کیجیے۔ ٹکٹ آدھ آنہ کا ارسال ہے۔ امید کہ جلد تر جواب لکھیں گے۔

جنوری 1883 کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں مشرقی زبانوں کے معلم کی ضرورت ہوئی تو اسسٹنٹ عربک پروفیسر کی حیثیت سے شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔ سرسید پر شبلی کی صلاحیتیں ظاہر ہو گئی تھیں، چنانچہ وہ کئی معاملات میں شبلی کی رائے کو اہمیت دینے لگے تھے۔ پروفیسر اصغر عباس نے اپنے ایک مضمون 'بعض مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط' میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ '1883 میں مدرسۃ العلوم کے بیرونی دروازے پر کتبہ لگانا تجویز ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جو اشعار کندہ ہونے تجویز ہوئے تھے، انھیں سرسید نے شبلی کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجا تھا'۔ شبلی موصولہ اشعار کے بارے میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو خدمت مرحمت ہوئی، وہ میری وقعت کے حد سے زیادہ ہے، مگر امتثالاً للامر عرض ہے، اشعار مرسلہ غالباً بحر ہزج مسدس میں لکھے گئے ہیں اور اس میں صرف دو زحاف قصر و حذف واقع ہوتے ہیں، مگر تین پہلے مصرعوں کا وزن درست نہیں یا شاید مجھی کو غلطی ہوئی ہے۔ جو تغیر اس میں کیا گیا ہے، وہ اس وجہ سے ضروری تھا کہ صنعت اقتباس محفوظ رہے اور اس لحاظ سے ایک شعر اور مزید [کذا] کہا گیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ میں اپنی خدمت کو پوری طرح سے ادا نہیں کر سکا، مگر میری وسعت میں اسی قدر تھا۔

سرسید نے علامہ عنایت رسول چریا کوٹی سے عبرانی زبان کا درس لیا تھا، جب کہ شبلی علامہ عنایت رسول کے بھائی مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے فیض یافتہ تھے۔ سرسید، شبلی کے استاد مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے علم وفضل کے پیشِ نظر انھیں علی گڑھ لانے کے متمنی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو شبلی نے لکھا:

مولوی صاحب موصوف وہاں کے قیام کو پسند فرماتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ اس پایے کا شخص اس قلیل مشاہرہ پر بمشکل ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر ارشاد ہو تو میں ان کو ساتھ لے آؤں۔

اگرچہ شبلی نے 'قلیل مشاہرہ' کو ان کے علی گڑھ آنے میں رکاوٹ قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید کے نظریات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علی گڑھ سے اختلافات

جنوری 1883 کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں مشرقی زبانوں کے معلم کی ضرورت ہوئی تو اسسٹنٹ عربک پروفیسر کی حیثیت سے شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔ سرسید پر شبلی کی صلاحیتیں ظاہر ہو گئی تھیں، چنانچہ وہ کئی معاملات میں شبلی کی رائے کو اہمیت دینے لگے تھے۔

میں وہ اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ مسدسِ حالی کے جواب میں مسدسِ عوالی لکھ ڈالا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے خیال میں، شبلی انھیں علی گڑھ کالج سے وابستہ کرنے کے خواہش مند تھے، مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

الفاروق لکھنے کے لیے شبلی کو جن کتابوں کی ضرورت تھی، وہ ہندوستان میں بالعموم دستیاب نہ تھیں، چنانچہ شبلی مطلوبہ کتب کے لیے بے چین رہتے اور مصر وروم وشام کے کتب خانوں سے استفادے کی تدبیریں سوچتے رہتے۔ بالآخر انھیں 1892 میں اس سیاحت کا موقع ملا۔ 26 مئی کو وہ علی گڑھ سے چل پڑے اور براستہ بمبئی بحری جہاز کے ذریعے اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ بمبئی سے انھوں نے سرسید کے نام ایک خط لکھا، جو دستیاب نہیں ہوسکا، البتہ 8 مئی کو عدن سے لکھا گیا خط علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے کی وجہ سے محفوظ رہ گیا۔ اس میں شبلی نے اپنی ناسازیِ صحت اور سفر کی صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

جہاز کی حرکت اور دوران دردِ سر کی وجہ سے مفصل حالات کے لکھنے سے معذوری ہے۔ یہ خط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو دن تک سخت تکلیف رہی، میں نیم مردہ پڑا رہا۔ اب اچھا ہوں، لیکن جہاز کے تعفن اور جنبش سے کسی وقت طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ کھانا نہایت عمدہ ملتا ہے۔ اٹالین ڈش نہایت خوش مزہ ہوتے ہیں۔ کیا لکھوں، لکھا نہیں جاتا۔

22 مئی 1892 کو شبلی قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ یہ سیاحت خالصتاً کتب بینی کے لیے تھی، چنانچہ شبلی کی پہلی ترجیح کتب خانوں کا دورہ اور دستیاب کتب سے استفادہ رہی۔ اس حوالے سے وہ خطوں کے ذریعے سرسید کو مسلسل مطلع کرتے رہے:

کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں۔ امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ خیر، جو ممکن ہوگا، کیا جائے گا۔...... یہاں آج کل عینی کی شرح بخاری چھپ رہی ہے، 9 جلدیں چھپ چکی ہیں۔ بہت بڑی کتاب ہے۔...... بیروت کے علما نے تمام نصارائے عرب، خواہ وہ جاہلیت کے ہوں، خواہ اسلام کے، ان سب کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار کر کے چھاپنا شروع کیا ہے۔ ایک جلد چھپ چکی ہے، اسی میں اخطل کا دیوان بھی ہے، لیکن وہ مستقل تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ یہ آج تک کہیں نہیں مل سکا تھا، یورپ میں بھی اس کی تلاش تھی۔

قلمی کتابیں یہاں [برائے فروخت] نہیں ملیں، مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، اس لیے صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی متعدبہ ہے۔......

ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں، لیکن کیا حاصل؟ کتابت کی شرح 4 روپے جز سے کسی حال میں کم نہیں۔...... عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔

واضح رہے کہ 25 مئی اور 15 جون کے خطوں میں شبلی نے اس بات کا بالخصوص ذکر کیا ہے کہ یہاں معتزلہ کے بارے میں کتب دستیاب نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک 'نعمانی' کو معتزلہ سے متعلق کتب کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ سرسید کی خواہش پر ان کی تلاش میں سرگرداں تھے یا خود انھیں اس نظریے سے دلچسپی ہوگئی تھی؟ اتنا ضرور ہے کہ بعد میں شبلی نے '**المعتزلہ والاعتزال**' کے نام سے ایک مضمون ضرور لکھا، جو تہذیب الاخلاق کے شمارے جولائی

1895 شائع ہوا، البتہ اتنی احتیاط کی کہ اس پر 'شبلی نعمانی' کے بجائے 'اسدی الاعظمی' کا قلمی نام اختیار کیا۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید انھیں یہ مضمون اپنی مرضی کے برخلاف یا کسی [سرسید؟] کے اصرار پر لکھنا پڑا اور پھر یہ کہ اس نامکمل مضمون کی طرف انھوں نے کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس مضمون میں شبلی نے معتزلہ کے لیے توصیفی انداز اپنایا تھا، اس لیے سید عبدالحیٔ حسنی نے علامہ شبلی کو معتزلی قرار دے دیا۔ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے ہاں عقل و نقل کی تطبیق کو سرسید کی صحبت کا اثر قرار دیتے ہوئے اس بات کی پُرزور تردید کی کہ شبلی معتزلی بن گئے تھے؛ چنانچہ اغلب یہی ہے کہ وہ سرسید کی خواہش کے احترام میں ان کتب کے متلاشی ہوئے، ورنہ سرسید کے نام خطوط میں ان کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

قسطنطنیہ میں انھیں زبان کی اجنبیت کی وجہ سے بہت دِقت ہوئی، چنانچہ انھوں نے مطلع کیا کہ 'مَیں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور ان شاءاللہ کچھ نہ کچھ بقدرِ ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا'۔ دوسری مشکل، جو انھیں درپیش تھی، وہ یہ کہ 'ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے۔ بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دُور دُور ہیں'۔

اس سفر میں شبلی کی تخلیقی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ سرسید کو مطلع کرتے ہیں کہ 'حالاتِ سفر میں ایک قصیدہ موزوں ہو گیا ہے، وہ خط کے ساتھ شامل ہے، مطبع مفید عام میں چھاپ کر علی گڑھ گزٹ کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو مناسب ہو گا'۔ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ 'مَیں نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جو ناتمام رہ گئی؛ ستر بہتر شعر تک نوبت پہنچی تھی، پھر طبیعت رُک گئی'۔ ساتھ ہی ساتھ وہ علی گڑھ کالج کو بھی نہیں بھولے۔ شبلی نے وہاں کے ایک فارسی اخبار اختر، جو دو ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا، سرسید کے نام جاری کرا دیا اور انھیں لکھا:

اس اخبار میں ہمارے کالج کے حالات چھپتے رہیں اور وہ ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ دیں گے۔ یہاں اکثر لوگ ہندوستان کے نام سے بھی واقف نہیں، ورنہ اگر مسلمانوں کے تمام حالات اور ضرورتیں معلوم ہوں تو کالج کو مدد ملنا یقیناً مشکل نہیں۔ ہزاروں میل تک یہاں کے اوقاف کا فائدہ پہنچتا ہے۔

یہاں کا ٹائپ بے انتہا عمدہ ہے۔ تمام دنیا میں اس کی نظیر نہیں۔ علی گڑھ گزٹ کے لیے یا مستقل مطبع کے لیے ضرور خریدنا چاہیے۔ بیروت و ہالینڈ کے حروف میں بھی یہ نوک پلک نہیں۔

مَیں نے کالج کا نتیجہ اکمل الاخبار میں دیکھا اور بے انتہا خوش ہوا، بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی عالم میں خط لکھنے بیٹھ گیا، ورنہ معمولی باتیں تو روز روز کیا لکھوں۔

مَیں چاہتا ہوں کہ کالج کے لیے چند ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خریدی جائیں، جن سے یہاں کی علمی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا۔

ان خطوں سے شبلی کے بعض گھریلو حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ یکم جون 1890 کے خط میں شبلی نے اپنی اہلیہ کی ناسازیِ طبیعت کے تسلسل کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنے دادا حسن علی کی رحلت سے مطلع کیا۔ لکھتے ہیں:

افسوس کہ جناب جدِ امجد نے بیاسی برس کی عمر میں، تین چار دِن ہوئے، انتقال کیا۔ اگرچہ ان کی عمر پوری ہو چکی تھی، لیکن چونکہ ان کی موت ناگہانی طور پر ایک صدمے سے ہوئی، اس لیے لوگوں کو نہایت رنج ہوا۔ ان کے تمام قویٰ درست تھے۔ مَیں نے رسالہ حسن [حیدرآباد] ان کو دیا تھا تو بغیر عینک کے پڑھ گئے۔ خدا مغفرت کرے۔

علاوہ ازیں وہ اپنے والد اور افرادِ خاندان کو بھی یاد کرتے رہے۔ 25 مئی کو لکھا کہ 'یہ خط والد قبلہ کو بھیج دیا جائے یا اس کی

شبلی کی سیاحت محض کتب بینی تک محدود نہ رہی، بلکہ انھوں نے اس ملک کو کھلی آنکھ سے دیکھا۔ شبلی سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں دیگر سماجی و سیاسی اداروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام کی ابتری کی اصل وجہ انگریز سامراج کی حکومت ہے، لیکن ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے دَوران، جہاں خود مسلم حکومتیں قائم تھیں، ہندوستان کی ایسی صورتِ حال نظر نہ آئی تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ ایک خط میں اپنی اس ذہنی و روحانی اذیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

نقل۔ متعدد خطوط لکھنے کی فرصت نہیں'؛ 15 جون کو تحریر کرتے ہیں کہ 'یہ خط والد قبلہ کے پاس بھیج دیا جائے، میاں حمید کو تاکید فرمائیے کہ مجھ کو نہایت مفصل خط لکھیں اور عزیزوں کے امتحانات کے نتیجے بھی لکھیں' اور ایک 5 محرم کے خط میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ 'مَیں نے والد قبلہ کو دو خط لکھے، لیکن وہاں سے کوئی تحریر نہیں آئی، تردّد ہے۔ آپ نے بھی کچھ تذکرہ نہیں فرمایا، خدا سے امید ہے کہ سب طرح سے خیریت ہو گی'۔ اسی خط میں انھوں نے اپنی دو متضاد کیفیات کا ذکر کیا:

مَیں جانتا ہوں کہ میرے احباب مجھ کو بھول گئے ہیں، لیکن محبی خوشی محمد ناظر کے ایک ضمنی تذکرے نے میرے دل میں ایک عجیب رِقت انگیز اثر پیدا کیا۔ آپ ان کو بُلا کر ضرور میری طرف سے ممنونیت اور محبت کا اظہار فرمائیں۔

ہاں، مَیں نادم اور سخت نادم ہوں کہ مَیں نے کسی تحریر میں محبی و مخلصی مولوی سید ممتاز علی صاحب کے حالات نہیں پوچھے۔ حقیقت میں اس سے زیادہ بدعہدی اور بے وفائی نہیں ہو سکتی۔ آپ ضرور ان کی خیریت، مزاج و شغلِ موجودہ سے مجھ کو مطلع فرمائیں۔ اگر مصر میں کوئی کتاب ڈھب کی مل گئی تو ان کو ہدیہ دینے کے لیے ان شاءاللہ ساتھ لاؤں گا، یہی اس گناہ کا کفارہ ہو گا۔

یہ بھی ہے کہ وہ پردیس میں بیٹھے دوستوں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کا ذکر کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ 5 محرم کے خط سے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

مَیں نے اکمل الاخبار میں پڑھا کہ مولوی زین العابدین صاحب 'خان بہادر' ہوئے۔ اگرچہ اخبار میں زائد تصریح نہ تھی، مگر مَیں نے یقین کر لیا کہ ہمارے، ہی مولوی زین العابدین خاں صاحب مراد ہیں۔ اگر ایسا ہے (اور ضرور ایسا ہے) تو میری طرف سے لمبی چوڑی عرض کی جائے [کذا]۔

آپ اس خبر کو سن کر خوش ہوں گے کہ مجھ کو پیش گاہِ سلطانی سے درجۂ چہارم کا تمغۂ مجیدی عطا ہوا۔

لیکن ساتھ ہی شبلی نے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا، جس سے حیرت ہوتی ہے۔ نام و نمود کی ایسی خواہش کی بظاہر شبلی سے توقع نہیں کی جا سکتی، بہرحال انھوں نے لکھا کہ 'اب تو امید ہے کہ وہاں [ہندوستان] پہنچ کر مجھ کو آپ 'شمس العلمائی' کا خطاب ضرور ہی دلوائیں گے'، اور شاید اس خدشے کے پیشِ نظر کہ سرسید اسے محض خوش طبعی خیال نہ کریں، یہ بھی لکھ گئے کہ 'ورنہ گستاخی معاف، وہی مثل صادق آئے گی کہ چراغ تلے اندھیرا'۔ پھر یوں ہوا کہ سرسید کے یہ لکھنے پر کہ 'مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ 'تمغۂ مجیدی' عطا فرمائے اور انگریزی حکومت، بڑے افسوس کی بات ہے، اس فرض سے غافل رہے'، شبلی کو جنوری 1894 میں 'شمس العلمائی' کا خطاب مل گیا؛ لیکن دوسری جانب انگریز حکومت یہ گمان کرنے لگی تھی کہ شبلی شاید سلطان عبدالحمید کا سفیر بن کر ہندوستان پلٹے ہیں، چنانچہ حکومت کی یہ بدگمانی شبلی کا تعاقب کرتی رہی، حتیٰ کہ 1911 کے بعد کسی موقع پر وہ نشانِ محبت، یعنی 'تمغۂ مجیدی' چوری ہو گیا۔

شبلی کی سیاحت محض کتب بینی تک محدود نہ رہی، بلکہ انھوں نے اس ملک کو کھلی آنکھ سے دیکھا۔ شبلی سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں دیگر سماجی و سیاسی اداروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام کی ابتری کی اصل وجہ انگریز سامراج کی حکومت ہے، لیکن ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے دَوران، جہاں خود مسلم حکومتیں قائم تھیں، ہندوستان کی ایسی صورتِ حال نظر نہ آئی تو وہ

بہت مایوس ہوئے۔ ایک خط میں اپنی اس ذہنی و روحانی اذیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا، اس میں یورپ کا ذرا بھی پرتَو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے، اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے۔

شبلی دیگر امور کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات سے ہونے والی ملاقاتوں کا احوال بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

پرسوں مَیں عثمان پاشا سے ملا۔ نہایت اخلاق سے ملے، عربی سمجھ لیتے ہیں اور دو چار معمولی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مَیں نے ان کے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہا، لیکن راضی نہ ہوئے، بلکہ الٹے خود میری تقلید کرنی چاہی۔ رخصت کے وقت فرمایا کہ آپ جب چاہیں، تشریف لائیں، بہت خوشی سے ملوں گا، تمام اَور بڑے بڑے پاشاؤں سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔

آج مَیں حسین حبیب آفندی سے، جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس جنرل ہیں، ملا۔ بے انتہا مہربانی کی۔ گھر کے تمام کمرے دِکھائے، دعوت کی اور بہت سی مہربانیاں کیں۔ وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔ آپ فوراً سیرۃ النعمان کا ایک نسخہ، جو وہاں مَیں دیکھ آیا ہوں اور اس پر کالج کی مہر نہیں لگی ہے، بھیج دیجیے۔ ضرور مَیں ان کو ہدیہ دوں گا، وہ اسی مذاق کے آدمی ہیں۔

کہنے کو تو علی گڑھ کالج سے شبلی کا تعلق سرسید کی وفات (27 مارچ 1898) کے بعد (مئی 1898) تک قائم رہا، لیکن بہت دِن پہلے سے دونوں کے مابین اختلافات رونما ہو چکے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے قیصر باغ لکھنؤ میں 27 دسمبر 1897 کو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھے گئے ایک مقالے 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' کے بعض اندراجات کو دونوں کے اختلافات کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے، لیکن سرسید کے نام شبلی کے اس سے بہت پہلے کے خطوط میں موجود تلخی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں اکابر میں 'سب ٹھیک نہیں' تھا۔ کالج میں درس و تدریس کے حوالے سے 20 جنوری 1895 کو شبلی نے ایک تجویز پیش کی:

مولانا عبداللہ صاحب انصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت بابرکت شخص ہیں۔ اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ، جو کہ خاکسار کالج کلاس کے طلبہ کو پڑھاتا ہے، وہ مولانا صاحب ممدوح کے تعلق کر دیا جائے۔ علاوہ عمدہ تعلیم پانے کے طلبہ کو ان کی برکت سے روزانہ مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔

اس کے جواب میں سرسید نے کیا لکھا، معلوم نہیں، لیکن شبلی کے اگلے خط سے اتنا علم ضرور ہوتا ہے کہ وہ شبلی سے متفق نہ تھے۔ ان کے لب و لہجے یا اسلوب کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسے پڑھ کے شبلی کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس بیان کے ثبوت میں شبلی کا خط پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں آہنگ اور تلخی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ شبلی لکھتے ہیں:

اگر جناب کو کچھ خرابی کا احتمال ہو تو مولوی عبداللہ صاحب کے تعلق یہ کام صرف ایک دو مہینے کے لیے کر دیا جائے۔ میری یہ استدعا ایک معمولی بات تھی، لیکن بعض وقت بدقسمتی سے چھوٹی سی بات بھی ایک امرِ مہم بن جاتا ہے۔ جب مولوی صاحب ہر ہفتہ نہایت تفصیل و توضیح کا موقع پا کر وعظ میں محتاط ہو گئے ہیں تو ترجمہ میں کیوں نہ احتیاط کریں گے۔ مَیں پہلے روز ان کو قرآن کے گھنٹہ میں بلا کر دِکھا دوں گا کہ مَیں اس طرح پڑھاتا ہوں اور آپ کو بھی یونہی پڑھانا چاہیے۔ ورنہ وہ ضرور اُسی طرح پڑھائیں گے۔ کالج کا، بخدا، اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ جو شخص خاص دینیات کے لیے ایک معقول مشاہرہ پاتا ہو، کالج کی انتظامی حیثیت سے یہ کام اس کے تعلق ہونا بہتر ہے۔ میری ذاتی غرض صرف اس قدر ہے کہ مجھ کو لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکل آئے گا، ورنہ چونکہ جاڑوں میں مدرسہ 9 بجے سے ہوتا ہے اور صبح ۷ ربجے ہوتی ہے، اس لیے ضروریات سے فارغ ہو کر ذرا دیر کے، بعد کھانا کھانے کے، مدرسہ جانے کی پڑ جاتی ہے۔ اگر میری استدعا کو میرے جی چرانے اور کسی قسم کی خودغرضی پر محمول کیا جائے تو میری کمال بدقسمتی۔ اس باب میں میرے یہ آخری کلمات ہیں۔

ان خطوں سے سرسید کے دل میں شبلی کی اهمیت، سرسید سے مخاطب هوتے هوئے شبلی کا انکسار، اهل خانه اور افرادِ خاندان سے متعلق معلومات، ترکی کے کتب خانوں کا کسی قدر احوال، کتب کی دستیابی، معتزله سے ان کی دلچسپی، قسطنطنیه میں مشاهیر سے ملاقاتوں، ترک تعلیمی اداروں کی صورتِ حال، وطن میں عزیزوں اور دوستوں سے ان کے قلبی تعلق، تمغه ملنے پر اظهارِ مسرت اور امتیاز حاصل کرنے کی خواهش اور سرسید سے تعلقات میں در آنے والی خلیج کا اظهار هوتاهے۔

سرسید کے نام شبلی کا آخری خط 12 ستمبر 1895 کو لکھا گیا، جس میں انھوں نے علی گڑھ کالج میں ہونے والے مبینہ غبن کے بارے میں سرسید کو آگاہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ 'غبن کا معاملہ، خدا خیر کے، بخیر انجام ہو۔ ہم لوگ بایمان و یقین جانتے ہیں کہ اَور صیغوں میں بھی نہایت ابتری ہے، مگر جرأتِ اظہار نہ تھی۔ کم از کم سال میں [ایک بار] قاعدے کے موافق جانچ تو ہونی چاہیے'۔ اس خط کے جواب میں سرسید نے محض دو جملے لکھ کر بھیجے، یعنی 'جن صیغوں میں آپ کے نزدیک، ابتری ہے، ان کے نام بتانے ضروری ہیں۔ امید ہے کہ اس سے مطلع فرماویں گے'۔

اوّل اوّل جب شبلی کے خطوط جمع کرنے کے حوالے سے شیخ رشید الدین انصاری نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو جواب میں شبلی نے لکھا کہ 'میرے خطوط بالکل بے مزہ ہوتے ہیں۔ ان کو کیا جمع کرتے ہو۔ جب مجھ کو خود مزہ نہیں آتا تو اَوروں کو کیا آئے گا'، لیکن شبلی کے بعض خطوں میں ایسی شگفتگی پائی جاتی ہے کہ اگر شبلی اس طرف توجہ کرتے تو ان کے خط ایسے 'بے مزہ' نہ رہتے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

قسطنطنیہ کی آب و ہوا کی عمدگی اس قابل ہے کہ انسان اپنی عمر کا ایک حصہ ضرور اس کی نذر کرے۔ اگر مَیں پرہیز کر سکتا تو موسم کی عمدگی سے بہت فائدہ اٹھاتا اور خوب موٹا تازہ ہو کر آتا، لیکن یہاں کے لذیذ میوے، جو لذت کے ساتھ کم بخت نہایت ارزاں بھی ہیں، کسی طرح مجھ جیسے شخص کو اعتدال کی حد پر نہیں رہنے دیتے۔

درج بالا گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے نام شبلی کے تمام خطوط دستیاب نہیں ہو سکے۔ ان خطوں سے اگرچہ سرسید اور شبلی کے تعلقات کے تمام نشیب و فراز نمایاں نہیں ہوتے، تاہم لب و لہجے کے تغیرات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان خطوں سے سرسید کے دل میں شبلی کی اہمیت، سرسید سے مخاطب ہوتے ہوئے شبلی کا انکسار، اہل خانہ اور افرادِ خاندان سے متعلق معلومات، ترکی کے کتب خانوں کا کسی قدر احوال، کتب کی دستیابی، معتزلہ سے ان کی دلچسپی، قسطنطنیہ میں مشاہیر سے ملاقاتوں، ترک تعلیمی اداروں کی صورتِ حال، وطن میں عزیزوں اور دوستوں سے ان کے قلبی تعلق، تمغہ ملنے پر اظہارِ مسرت اور امتیاز حاصل کرنے کی خواہش اور سرسید سے تعلقات میں در آنے والی خلیج کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر کبھی گم شدہ خطوط دریافت ہو سکے تو شاید ان دونوں عظیم شخصیات کے درمیان اشتراکات و اختلافات کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جا سکے۔

■

Khalid Nadeem, Dept of Urdu, Jamia Sargodha, (Pakistan)

کلیم صفات اصلاحی

دارالمصنّفین: ماضی وحال

دارالمصنّفین علامہ شبلی نعمانیؒ کی سب سے آخری اور مہتم بالشان یادگار ہے اور ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، اپنی علمی شناخت اور منفرد طرز و انداز کے سبب یہ ملک وملت کے مایہ ناز علمی و تحقیقی ادارے کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر پاک وہند میں مشہور ومعروف ہے بلکہ اپنی بلند پایہ علمی وادبی خدمات کی وجہ سے اس کی شہرت و ناموری کا دائرہ دنیائے مغرب کے بیشتر ممالک تک وسیع ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جنوبی افریقہ، اسکاٹ لینڈ، آسٹریلیا، ترکی وغیرہ جیسے ممالک میں بھی اس ادارے سے بخوبی واقف ہونے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

دارالمصنّفین کے ابتدائی تخیل، پس منظر اور اس کے قیام کے متعلق معلومات پر طویل گفتگو تحصیل حاصل ہے۔ اس کے لیے حیات شبلی، حیات سلیمان، دارالمصنّفین کی خدمات پر لکھی جانے والی کتابوں اور ہندوستان و پاکستان کے معیاری رسالوں میں تحریر کیے جانے والے مضامین کو دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کے متعلق بعض بنیادی اور ضروری باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

دارالمصنّفین کی تجویز علامہ شبلی کے ذہن میں 1910 میں آئی، انھوں نے لکھا کہ قومی اور مذہبی ضروریات کے لیے جس طرح مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمانوں کے علوم ومذہب اور تاریخ کو زندہ رکھنے کے لیے ایک ایسے کتب خانہ کی ضرورت ہے جس میں مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم وفنون کا سرمایہ ہو اور مسلمان اہلِ قلم اس سے استفادہ کرسکیں۔

الندوہ سہ سالہ رپورٹ، ندوۃ العلما لکھنو، مارچ 1010

پھر اگست 1910 میں اس وقت دارالمصنّفین کے قیام پر زور دیا جب نواب مزمل اللہ خان نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں تصانیف شبلی کی یادگار میں ندوہ میں ایک کمرہ بنوانا چاہا۔ مولانا نے لکھا کہ ''ہماری تصنیفات کی کیا وقعت ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنّفین کے نام سے تعمیر ہو۔

حیات شبلی، ص530

ابھی یہ منصوبے عملی شکل میں ظاہر نہیں ہوئے تھے کہ 1913 میں ندوہ سے مولانا نے استعفادے دیا اور سیرت کی تالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئے، پھر 11 فروری 1914 کے 'الہلال' میں احباب اور شاگردوں کے مشورے سے دارالمصنّفین کی تجویز شائع کرائی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولانا مسعود علی ندوی سے مرکز دارالمصنّفین کے سلسلے میں مراسلت کرکے اعظم گڑھ میں اس کی داغ بیل ڈالی۔ ادارے کا پورا تعلیمی وعلمی خاکہ مرتب کیا۔ اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کیا، اعزا سے اس کی خاطر زمین وقف کرائیں۔ اپنی اور احباب کی 6,7 الماریوں پر مشتمل کتابیں مہیا کرائیں۔ دارالضیوف تعمیر کرایا، زیر تربیت طلبہ کے لیے کرایہ پر شہر میں بنگلہ لیا اور مولوی ابوالحسنات ندوی کا انتخاب خود کیا۔

حیات شبلی 535-536

ادارہ کے نظم وضبط اور اصول وقواعد کی ترتیب اور 'سیرۃ النبی' کی تسوید وتکمیل کی فکر میں تھے کہ خرابی صحت کے باعث ان منصوبوں کی عدم تکمیل کا احساس شدید ہونے لگا چنانچہ مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کو خط اور تار کے ذریعے بلایا اور نامکمل کاموں کی تکمیل کی وصیت کرکے 18 نومبر 1914 کو اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔ وفات کے تیسرے روز 21 نومبر 1914 کو ایک عارضی مجلس اخوان الصفا بنائی گئی جس کے صدر مولانا فراہی، ناظم سید صاحب اور مہتمم مولانا مسعود علی ندوی ہوئے اور ارکان میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا شبلی متکلم کو منتخب کیا گیا۔ 24 نومبر کو اعیان شہر کی مجلس بلائی گئی اور بقیہ وقف کے مراحل طے کیے گئے۔ مولانا فراہی کے چھوٹے بھائی شیخ رشیدالدین صاحب نے اس سلسلے میں نمایاں خدمت انجام دی۔ احباب سلیمان، ص85-84۔

29 نومبر کو مولانا فراہی اور سید صاحب علامہ شبلی کے ماہانہ وظیفہ 'سیرۃ النبی' کو ادارہ کے نام منتقل کرنے کی درخواست لے کر نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی خدمت میں تشریف لے گئے جو منظور ہوئی۔ مولانا مسعود علی ندوی نے اعظم گڑھ میں قیام منظور کیا اور یہاں کاغذی کارروائیوں میں مصروف ہوگئے، سید صاحب نے ادارے کے قواعد وضوابط اور اغراض ومقاصد لکھ کر منتخب افراد کے معائنہ کے لیے بھیجا اور اخبارات میں مضامین لکھ کر اس کے قیام کی اطلاع شائع کرائی۔ 25 مئی 1915 کو دارالمصنّفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے نام سے ادارہ کو باقاعدہ رجسٹر کرالیا گیا اور حضور نظام حیدرآباد نے مولانا شبلی کے منصب سہ صد ماہوار کو درالمصنّفین کے نام منتقل کیا۔ دارالمصنّفین ایک تعارف، ص19-18۔

رجسٹری کے بعد ایک مختصر اسٹاف جس میں چار آدمی اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔ تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا گیا۔ قیام دارالمصنّفین کے بعد دو سال کی مسلسل جدوجہد سے اس کے الگ الگ شعبے، صیغہ سیرت نبوی، صیغہ دارالتالیف، دارالطباعت، دارالاشاعت، رسالہ معارف دارالکتب اور صیغۂ تعمیرات تقسیم کار کے لحاظ سے قائم کیے گئے۔ ان ضروری اور اہم شعبوں کے علاوہ حسب وقت وضرورت نئے شعبے قائم ہوئے اور اس کا ہر شعبہ صد سالہ ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آج جس منزل پر پہنچ گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

صیغۂ تصنیف سے اب تک جو مصنّفین وابستہ ہوئے ان میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سعید انصاری، مولانا حاجی معین الدین ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، مولانا سید نجیب اشرف ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ڈاکٹر محمد عزیز، مولانا سید ابوظفر ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا محمد یوسف کوکن، مولانا محمد اویس ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مولانا عمیر الصدیق ندوی، مولانا شاہ نصر، مولانا محمد منصور، ومولانا عبیداللہ کوٹی ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری، کلیم صفات اصلاحی، مولانا ڈاکٹر توقیر احمد ندوی ہیں۔ اس مختصر جماعت نے دارالمصنّفین کی علم پرور فضاؤں میں رہ کر مختلف موضوعات پر تقریباً 200 کتابیں تصنیف کیں۔

دارالمصنّفین کی علمی وادبی خدمات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس نے مولانا شبلی کے پیش نظر مقاصد کو سامنے رکھ کر اپنی منزلیں طے کیں، اس نے اپنی کتابوں اور ترجموں میں ذہن و دنیا دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی، مشرقی زبانوں سے آگاہ طبقے کے لیے جدید علوم اور جدید خیالات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ جدید تعلیم یافتہ حلقوں کے سامنے دور حاضر کے جدید اصول کی ترتیب وتہذیب کے ساتھ اسلامی علوم و ادب پیش کیے۔ ان دونوں ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دونوں قسم کے تالیفات وتراجم شائع کیے جن کو توقع کے مطابق ملک و بیرون ملک پذیرائی اور حسن قبول حاصل ہوا۔ ملک کے اہل علم نے ان کو قابل تقلید تصور کیا اور الہ آباد، دہلی اور اتر پردیش کی اکادمیوں نے یہاں کی مطبوعات کو حوصلہ افزا انعامات دیے۔ یہاں کی کتابیں بنگالی، گجراتی، ملیباری، پشتو، عربی اور انگریزی میں ترجمہ کی گئیں۔ الفاروق، سیرت عائشہ اور خلفائے راشدین وغیرہ کا ترکی میں ترجمہ ہوا، سیرۃ النبی اور ارض القرآن وغیرہ کے ترجمے بھی ہوئے۔ دمشق، قسطنطنیہ، فرانس وغیرہ میں دارالمصنّفین اور اس کے رفقا کے حالات پر مضامین لکھے گئے، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر نکلسن اور موسیولوی ماسنان اور پروفیسر آرنلڈ نے اس کی علمی سرگرمیوں سے دلچسپی لی اس کے ساتھ ملک میں جب بھی کوئی مخالفانہ لٹریچر شائع ہوا تو دارالمصنّفین نے اس کا معقول جواب بھی دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند نے اس کی خصوصیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ وسیر تاریخ ہند اور تاریخ وتنقید ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خصوصیت میں نفس مضمون مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان وبیان کی سلاست کے علاوہ ان سے بھی زیادہ نمایاں قلب ونظر کی وسعت ہے، اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور قصۂ سکندر و دارا سنانے پر حکایت مہر ووفا بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔''

خطبہ صدارت جشن طلائی دارالمصنّفین، 2 فروری 1965، ص 4-3

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک میں علمی وتحقیقی اکادمیوں کی جو بہار اس وقت نظر آرہی ہے اس کے پس پردہ دارالمصنّفین کا قابل قدر لٹریچر اور اس کا قابل تقلید نمونہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی دارالمصنّفین مخلصانہ علمی خدمات کے سبب ملک کی دیگر اکادمیوں میں منفرد ہے اور ملک وملت کی ذہنی وفکری ضرورت کی تکمیل اور استفادے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اور سیاسی وملکی اور قومی مسائل میں سنجیدہ، متین حلقوں کی نظر آج بھی اسی مرکز کی جانب اٹھتی ہے اور کیوں نہ اٹھے، جب ملک جنگ آزادی کی لڑائی میں مصروف تھا، اس وقت دارالمصنّفین سیاسی قائدین کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانے کے قریب قریب تمام مشاہیر رہنما اس کے مہمان ہوئے اور اس کے ذمے داروں سے ذہنی وفکری مشورے کیے۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، ڈاکٹر سید محمود، خواجہ عبدالمجید، رفیع احمد قدوائی، چودھری خلیق الزماں، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محفوظ الرحمن سیوہاروی کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سمپورنا نند، اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، ونوبا بھاوے جی، لال بہادر شاستری، سی بی گپتا، اشوک مہتہ، رام بابو سکسینہ وغیرہ جیسے بے شمار مجاہدین آزادی یہاں آئے اور ادارے کے کاموں اور سرگرمیوں کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ بعد کے لوگوں میں مسز اندرا گاندھی، چودھری چرن سنگھ، کیلاش پرکاش، ریوتی رمن سنگھ، مالک رام، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، وی پی سنگھ، رام ولاس پاسوان، ملائم سنگھ، امر سنگھ، مفتی محمد سعید، سی کے جعفر شریف، چندر جیت یادو، دگ وجے سنگھ، اور راہل گاندھی بھی دارالمصنّفین آئے اور اس سے اظہار عقیدت کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو تو اس کے بانی رکن تھے۔

دارالمصنّفین کو یہ افتخار بھی حاصل ہے کہ اس ادارے کے اب تک دو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر فخرالدین علی احمد ایکزیکیوٹیو رکن منتخب ہوئے اور انھوں نے اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ادارے کے اب تک مجلس انتظامیہ کے 4 صدر نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود ریاستی وزیر بہار، نواب معظم جاہ بہادر، (موجودہ صدر)، مجلس عاملہ کے 4 صدر مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ظفرالاسلام خاں (موجودہ صدر مدیر ملی گزٹ)، 6 نظما مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن، سید شہاب الدین دسنوی، مولانا ضیاءالدین اصلاحی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، (موجودہ ڈائریکٹر)...... مہتمم مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، جناب عبدالمنان ہلالی (موجودہ مہتمم) اور ہندوستان کے مختلف حصوں کے سربرآوردہ اہل قلم وصاحب اثر ورسوخ شخصیات رکن اور مدیر اعزازی رفقا مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلی مودودی، قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، پروفیسر نذیر احمد، شانتی سروپ سنگھ، ڈاکٹر جاوید علی خان اور ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی منتخب ہوئے۔ ادارے کے ممتاز محسنین میں نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال، حضور سرکار نظام حیدرآباد نواب سر مزمل اللہ خاں پاکستان کے مشہور صحافی اور سابق وزیر مولانا کوثر نیازی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

ادارے کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے 2008 میں اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی سرگرمیوں میں گویا جان ڈال دی، اس قدر کم مدت میں انھوں نے ادارے کے تقریباً تمام شعبوں کو ترقی سے ہمکنار کیا، اس کی توسیع تعارف میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، کتب خانہ میں عربی مآخذ ومصادر کے جدید ایڈیشن کا اضافہ کیا، اکبرنامہ، مونس الارواح کے عکسی ایڈیشن اور مخطوطات دارالمصنّفین کی فہرست میں شائع کی، علامہ شبلی پر آثار شبلی، کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، شبلی کی ادبی وفکری جہات، ڈاکٹر شمس بدایونی کے نام سے جدید کتابیں اور ماہنامہ معارف کا اشاریہ ڈاکٹر جمشید ندوی، مطبوعات دارالمصنّفین کے جدید خوبصورت ایڈیشن شائع کیے۔ ملازمین کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت ڈائننگ ہال تعمیر کیا، قدیم دارالضیوف کو جدید طرز وانداز سے تعمیر کرایا۔

اس وقت پورے ہندوستان میں غلغلہ بلند ہے کہ دارالمصنّفین اپنی زندگی کے سو سال پورے کررہا ہے۔ اس کے بانی علامہ شبلی کی وفات کو بھی سو سال 18 نومبر 1014 کو ہوجائیں گے۔ اس لیے اس سال کو شبلی صدی کے طور پر منانا چاہیے۔

مرکزی حکومت اور ریاستوں کو بھی ملک کے اس سپوت کی یاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔

■

Kaleem Sefaat Ilahi, Daarul Musannefin Shibli Academy, Post Box No: 10, Shibli Road, Azamgar - 276001 (UP)

محمد عبدالحفیظ صدیقی

دارالمصنّفین کی گولڈن جوبلی اور ایک یادگار مشاعرہ

مارچ 1964 میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی گولڈن جوبلی منائے جانے کی ذمے داری صباح الدین عبدالرحمن صاحب کو دی گئی۔ مولوی مسعود علی ندوی کی ضعیف العمری کی وجہ سے انھیں رفیق ہونے کے ساتھ انتظامی امور کی نگرانی بھی سپرد کردی گئی تھی۔ بحیثیت رفیق ان کی ادبی اور تاریخی کتابیں مثلاً 'بزم تیموریہ' اور 'بزم مملوکیہ' کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ وہ مولانا سلیمان ندوی کے ہم وطن تھے۔ بہار کے قصبہ دسنہ سے انھی کی ایما پر اعظم گڑھ آگئے تھے۔ نگران کی انتظامی صلاحیت گولڈن جوبلی کی بدولت آشکار ہوئی۔ انھوں نے اپنے حسنِ انتظام سے اعظم گڑھ میں ایک بین الاقوامی سطح کا جلسہ منعقد کیا جس سے دارالمصنفین کی شہرت میں بڑا اضافہ ہوا اور بعد میں اس کی مالی امداد میں بھی۔ وہ بنارس گئے اور وہاں کے ٹھیکیداروں سے رابطہ قائم کیا جو کمبھ کے میلے کے لیے بڑے شامیانے اور قبہ وغیرہ فراہم کرتے تھے۔ دارالمصنفین سے متصل شبلی کالج کے وسیع و عریض پلے گراؤنڈ پر بہت سے شامیانے اور قبے لگا دیے گئے۔ درمیان میں ایک بڑا شامیانہ صدر محفل کے لیے لگایا گیا۔ اس وقت کے صوبہ بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صدر محفل تھے۔ دوسرے قدرے چھوٹے شامیانے عرب دنیا کے نمائندوں کے لیے مختص کیے گئے۔ اس طرح ایک چھوٹا سا شہر آباد کر دیا گیا تھا۔ دوسرے معززین اور شعراء کا شبلی کالج کی عمارت اور کچھ حضرات کے گھروں میں بھی قیام کا انتظام کیا گیا جن میں مزمل صاحب وائس پرنسپل شبلی کالج اور رئیس اعظم گڑھ کی بلڈنگیں شامل تھیں۔ پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر ڈاکٹر افضل اقبال، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر مجیب، پروفیسر عابد حسین

انھی کی کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر یوسف حسین اور شعبۂ تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کے دارالمصنفین کے مہمان خانے میں مقیم ہوئے۔ ذاکر صاحب نے حسب معمول نہایت عمدہ خطبۂ صدارت پڑھا جس پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تبصرہ کیا تھا کہ ''یہ خطبوں کا تاج محل ہے۔'' ڈاکٹر افضل اقبال صاحب نے ''آنحضور کی حیات پاکیزہ'' کے عنوان پر انگریزی میں مضمون پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنا مضمون پڑھا جس پر سامعین عش عش کرنے لگے۔ راقم الحروف نے بھی انھیں مضمون پڑھتے ہوئے پہلی دفعہ سنا اور ذہن پر دھاک بیٹھ گئی کہ وہ صرف قلم کے ہی بادشاہ نہیں ہیں بلکہ تقریر میں بھی لاثانی ہیں۔

ایک تقریب کی صدارت مسز سُچیتا کرپلانی نے کی جو اس وقت اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں اور اپنی تقریر میں دارالمصنفین کی بہت تعریف کی۔

آخری تقریب محفل مشاعرہ تھی جس کے صدر جسٹس آنند نرائن ملا تھے۔ شرکا میں روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد،

بھوپال سے عبدالقوی دسنوی، شفیق جونپوری وغیرہ تھے۔ جگر مرادآبادی جو شریک ہونے والے تھے عین وقت پر ناسازیِ صحت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ بعد میں ان کا ایک جذباتی معذرت نامہ موصول ہوا۔ جگر صاحب کی غزل گوئی پر علمی تبصرہ سب سے پہلے رسالہ معارف میں شائع ہوا تھا اور ان کی غزل گوئی کو ایک طرح کی سند سی حاصل ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے وہ دارالمصنفین سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ جگر صاحب کی اعظم گڑھ (دارالمصنفین) سے وابستگی کا قصہ کافی دلچسپ ہے۔ وہ ابتدا میں عینک فروخت کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر جایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں وہ شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اعظم گڑھ کے ایک معمولی شراب خانے میں وہ شراب پینے کے بعد غزلیں گا رہے تھے۔ ایک دن وہاں کی ایک ممتاز شخصیت سلطان احمد خاں (کلکٹر) کا ملازم شراب خانے کی طرف سے گزرا اور جگر صاحب کو اچھے ترنم سے گاتے ہوئے سنا تو گھر جا کر تذکرہ کیا کہ ایک شخص مدہوشی کے عالم میں بڑی عمدہ آواز میں غزلیں گا رہا ہے۔ سلطان خاں صاحب کے چھوٹے بھائی احسان خاں صاحب وکیل تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے ملازم سے کہا کہ اس شخص کو یہاں بلا لاؤ۔ چنانچہ جگر صاحب آئے اور ان سے غزلیں سنانے کی فرمائش کی گئی۔

گھر کے سب لوگوں کو ان کی غزلیں اور اندازِ ترنم بے حد پسند آیا۔ احسان خاں صاحب جگر صاحب کو ساتھ لے کر دارالمصنفین گئے اور مولانا سلیمان ندوی سے تعارف کرایا اور انھیں بھی جگر صاحب سے غزلیں سنوائیں اور درخواست کی کہ آپ ان کی شاعری پر تبصرہ کر دیجیے۔ مولانا سلیمان ندوی نے احسان صاحب سے کہا کہ آپ ان کی شاعری کے بارے میں مزید حالات جمع کر کے تبصرہ کیجیے۔ ان شاء اللہ معارف میں شائع کروں گا اور اس طرح جگر صاحب ادبی دنیا میں متعارف ہوئے اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ جگر صاحب اس وجہ سے دارالمصنفین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں 1952 میں جگر صاحب کے اعزاز میں خصوصی جلسہ اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا (اس وقت کینڈی ہال تعمیر نہیں ہوا تھا) جس میں انھوں نے تازہ غزل سنائی:

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اور:

تو مرے حال پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

راقم الحروف نے جگر صاحب کو اپنے مخصوص ترنم میں پہلی دفعہ سنا تھا مگر اس کا تاثر آج تک ذہن پر ہے۔

اُس زمانے میں مشاعروں میں جگر صاحب سے پہلے روش صدیقی صاحب کو زحمتِ سخن دی جاتی تھی۔ شبلی کالج کے گراؤنڈ پر ایک پختہ ڈائس بنایا گیا۔ ان دنوں بغیر تار کے مائیکروفون (Cordless Mike) کا رواج نہیں تھا اور مجمع پانچ ہزار سے زیادہ کا تھا۔ شبلی کالج کے علاوہ شہر کے دوسرے کالجوں کے طلبا بھی سامعین میں موجود تھے اور رقابت کا عنصر بھی شاملِ حال تھا۔ جب روش صدیقی صاحب کو مدعو کیا گیا تو ان کا پیر مائیکروفون کے تار میں الجھ گیا اور وہ قدرے لڑکھڑا گئے۔ طلبا سمجھے کہ وہ نشہ میں ہیں اور ایک زوردار قہقہہ اور شور و غل مچنے لگا۔ روش صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے بڑے جلالی انداز میں کہا کہ آپ کے سامنے ہندوستان کا کتنا بڑا شاعر موجود ہے۔ تب شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی کالج نے نظامت کی ذمے داری راقم الحروف کو سپرد کی کہ کسی طرح مجمع کو قابو میں رکھا جائے تو راقم الحروف نے کہا کہ جناب روش صاحب! اس ہنگامہ اور شور و غل کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس مستقل فرمائش آرہی تھی کہ روش صاحب کو بلائیے جب آپ کو مدعو کیا گیا تو سامعین کو اپنی خواہش کی تکمیل نظر آئی اور یہ اسی خوشی اور کامیابی کا جوش ہے جو شور و غل معلوم ہو رہا ہے۔ ورنہ اعظم گڑھ کے طلبا اپنی اردو ادب نوازی کے لیے مشہور ہیں۔ روش صدیقی صاحب مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں غزل سنائی۔ ایک اور غزل کی فرمائش کی اور اس طرح انھوں نے دو غزلیں سنائی اور ان کا موڈ بھی ٹھیک ہوگیا۔ پھر جگن ناتھ آزاد صاحب کو مدعو کیا گیا اور دوسرے شعرا کو بھی زحمتِ سخن دی گئی۔ آخر میں جسٹس آنند نرائن ملا صاحب کی غزل کے بعد مشاعرہ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

دوسرے دن مزمل صاحب کی کوٹھی پر گیا جہاں پروفیسر مجیب، پروفیسر عابد حسین اور ڈاکٹر افضل اقبال ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ یقین کرنا تھا کہ انھیں ناشتہ اور چائے وقت سے مل گئی تھی یا نہیں۔ پروفیسر مجیب اور پروفیسر عابد حسین نے راقم الحروف کی بڑی پذیرائی کی اور کہا کہ وقت پر صحیح الفاظ ادا ہوجائیں تو یہ بڑی کامیابی کی بات ہے۔ بعد میں پروفیسر نظامی نے پروفیسر یوسف حسین، پرو وائس چانسلر اے ایم یو سے تعارف کراتے ہوئے کہا دارالمصنفین کی جوبلی کامیابی میں علی گڑھ اسپرٹ کارفرما ہے۔

■

Dr. M.A.H. Siddiqi, 603, E4, Oxford Elegance, Wanowric, Pune - 411040 (MS)

قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ اور مختصر حالات

علامہ شبلی

قبل اس کے کہ میں یہاں کے تفصیلی حالات جدا جدا عنوان سے بیان کروں ضرور ہے کہ نہایت مختصر طور پر اس کی قدیم تاریخ اور اس کے ساتھ اس کی عام موجودہ حالت اجمال کے ساتھ بیان کروں۔ اِس شہر کی ابتدائی تاریخ یعنی جب وہ برنطاین کے نام سے پکارا جاتا تھا) نہایت قدیم ہے۔ جس زمانے سے اس کا نام قسطنطنیہ ہے اس کو بھی کچھ کم عرصہ نہیں گزرا۔ 476 میں قسطنطین اعظم نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس وقت سے محمد فاتح کے زمانے تک 'قیصران روم' کا پایہ تخت رہا۔ انگریزی اور حال کے اسلامی جغرافیوں میں اُس کے حالات نہایت تفصیل سے ملتے ہیں۔ قدیم اسلامی جغرافیوں میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن ابن بطوطہ کے سوا مجھ کو کوئی اسلامی مصنف معلوم نہیں جس نے اس زمانے کے واقعات چشم دید لکھے ہوں۔ ابن بطوطہ نے 715 میں اس شہر کو دیکھا اس وقت یہاں عیسائی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے اور ایک نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے ایک حصہ جو شہر کے مشرقی کنارے پر ہے استنبول کہلاتا ہے اور قیصر روم اور ارکانِ دولت و امرا اسی حصے میں رہتے ہیں۔ دوسرا حصہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے۔ اِس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں۔ جن کو قیصر بزور اپنی اطاعت میں رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعت تجارت کی تعریف اور ان کے غچلے پن کی وجہ ہجو کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "جب میں اِس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ قریباً سو بڑے بڑے جہاز موجود تھے لیکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔"

مسلمانوں نے قرن اوّل ہی میں اس کو تحیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ سب سے اوّل جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر تلوار ماری وہ عبداللہ بن المطلب۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار تھا اس کے بعد اور خلفا و سلاطین نے بھی اس پر حملے کیے لیکن قیصران روم کا خاتمہ محمد فاتح کے ہاتھ سے ہونے والا تھا جس نے 857 میں اس عظیم الشان دارالسلطنت پر صلیب کے بجائے علم اسلام بلند کیا۔ اِس حیرت انگیز معرکہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا کی طرف سے روک رکھا تھا۔ ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے اس پر پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیے اور جہازوں کو جن میں پہیے لگائے تھے، اُس پر چلا کر تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اُتار دیں۔ اس وقت اس نامور فاتح کی عمر کل 23 برس کی تھی۔ اس فتح کا مادہ تاریخ 'بلدہ طیبہ' ہے۔

موجودہ حالت

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ جو دور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اس کے دو کناروں پر آباد ہے اور اس وجہ سے اس کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حصہ استنبول کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے، سلاطین کے مقبرے اسی حصے میں ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔ دوسرا حصہ پیرہ سے شروع ہوتا ہے اور اس کے انتہائی جانب پر بشکطاش وغیرہ واقع ہیں جہاں سلطان کا ایوانِ شاہی اور قصر عدالت ہے پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں اس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

موقع و منظر کی خوبی

کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کے برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظر کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوشنما ہونا خیال میں بھی نظر نہیں آتا۔ اسی لحاظ سے اس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی شارح زریں کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے آگے جو زمین ہے وہ نہایت ہموار اور صاف ہے اس کی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے اور وہاں عجیب خوشنما منظر پیدا ہوگیا ہے۔

وسعت و تمدن

شہر کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانچ سو جامع مسجدیں 171 حمام، 324 سرائیں، 164 مدارس قدیم، 500 مدارس جدید، 12 کالج، 45 کتب خانے، 305 خانقاہیں، 48 چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں، بارہ دخانی جہاز، زمین کے اندر کی ریل، معمولی ریلیں (جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں) ہر وقت چلتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پل ہے اس پر سے گزرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے اس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار

روپے سے کم نہیں ہے۔

قہوہ خانے

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے وقہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں جن کے لیے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں تو تعجب سے کہتے تھے بائیش، ینسلون یعنی وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں ان ملکوں میں دوستوں کے ملنے جلنے اور گرمی صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقے میں دو بڑے نقص ہیں۔ اولاً تو تفریح کے جلسے پر فضا مقامات میں ہونے چاہئیں کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کو فائدہ پہنچے۔ دوسرے سخت خرابی یہ ہے کہ چونکہ یہ جلسے پرائیویٹ جلسے ہوتے ہیں اس لیے ان میں غیبت شکایت اور اس قسم کی لغویات کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمع عام کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی اس قسم کے تذکرے نہیں سنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

یورپین اور ایشیائی تمدن کے نمونے

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو تو یہاں دیکھ سکتا ہے۔ کتب فروشوں کی دکانوں کی سیر کرو تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے۔ سنگ رخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں کتابیں جس قدر ہیں مجلد ہیں جلدیں بھی معمولی نہیں بلکہ عموماً مطلاً و مذہب۔ مالک دکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم سن خوش لباس لڑکے ادھر اُدھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دکان میں قدم رکھا ایک لڑکے نے کرسی لاکر سامنے رکھ دی اور کتابوں کی فہرست حوالے کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے اور اُس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ قیمت چکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے۔

اسی طرح ہر پیشہ وصنعت کی دکانیں۔ دونوں نمونہ کی موجود ہیں۔ عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔ غلطہ کو دیکھو تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دکانیں بلند اور آراستہ سڑکیں وسیع اور ہموار۔ کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اس کے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں

کی آبادی ہے اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل۔

اختلاف حالت کی وجہ

اس شہر میں آکر ایک سیاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا وہ یہ ہوگا کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے دو حصوں میں اس قدر اختلاف حالت کیوں ہے۔ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ بحث وتفتیش کی باشندوں کے اختلاف حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کر لیا یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا تمول۔ لیکن سڑکوں اور گزرگاہوں کی ناہمواری وغلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پا سکتا تھا اس لیے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنی حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری مینوسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں۔ لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس لیے مینوسپلٹی اُن رقموں کو فیاضی سے صرف کر سکتی ہے مجھے خیال ہوا کہ یہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے یا اب ان کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے کہ اس کے لیے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے۔

عمارتوں کی وضع

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ چو منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے امرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔

آتش زدگی

اور یہی سبب ہے کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہ ہوں اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہوجاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لیے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے کہ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں۔ ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں فوراً خبر کریں۔ اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوئے ہیں جس وقت کہیں آگ لگتی ہے فوراً توپیں سر ہوتی ہیں اور شہر کے ہر حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں ان کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا ان کی جھپٹ میں آکر پھنس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔

آب و ہوا

آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا اس قدر خوش گوار ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امرا شملہ اور نینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے۔ پانی پہاڑ سے آتا ہے اور نہایت ہاضم اور خوشگوار ہے۔

میوہ جات

ہر قسم کے میوے کثرت سے ہیں اور خصوصاً انگور اور خربزہ بے مثل ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے خربزے لطافت میں تو شاید بڑھ کر ہوں لیکن شیرینی میں یہاں کے خربزوں کی برابری

نہیں کر سکتے۔ امرود جن کو اہل عرب انجاس کہتے ہیں عجیب مخروطی شکل کے ہوتے ہیں۔ رنگ میں تو نہیں لیکن صورت میں گاجروں سے مشابہ مگر نہایت شیریں اور لذیذ۔ سیب کابل کے سیب سے بڑے اور زیادہ شیریں۔ ایک میوہ یہاں ہوتا ہے جس کو مشمش کہتے ہیں۔ وہ ہمارے یہاں کی جامن سے کچھ مشابہ ہے۔ ہر قسم کے میوے نہایت ارزاں ہیں۔ انگور 2 سیر تک آتے ہیں۔ سیب عمدہ سے عمدہ پیسے کے دو دو علیٰ ہذا۔

لباس اور وضع

لباس اور وضع بالکل یوروپین ہے۔ ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔ لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی لباس ہو سکتا تھا، عیسائی اور یہودی بھی استعمال کرتے ہیں اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے تو اچھا ہے کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں میں اختلاف کے آثار جس قدر مٹتے جائیں تمدن کے لیے مفید ہے لیکن سوشل ضرورتوں میں اس سے سخت ہرج ہوتا ہے مجھ کو اس کی وجہ سے اکثر دشواریاں پیش آئیں اور ہمیشہ خیال آتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے اگر عیسائیوں کو قومی لباس کی پابندی کا حکم دیا تو بہت بجا کیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ یعنی علماء اور مدرسین بھی یورپ کے اثر سے نہیں بچ سکے ان کے پائجاموں میں پتلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں صرف یہ فرق ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ چنٹیں ہوتی ہیں۔ کرتہ یا اچکن کے بجائے صرف واسکوٹ ہوتا ہے واسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں اور یہی امتیازی علامت ہے جو ان کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے۔ اس میں بھی یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے واسکوٹ کھلا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی عموماً یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر سپید کپڑے کی ایک دھجی لپٹی ہوتی ہے جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں اور وہ اہل علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے۔ عورتوں کے لباس کی تفصیل میں عورتوں کی تہذیب و معاشرت کے ذکر میں لکھوں گا۔

جامع اور شاہی ایوانات

یہاں کی عمدہ اور یادگار عمارتیں، جامع مسجدیں، اور شاہی ایوانات ہیں جامع مسجدوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ جداگانہ عنوان سے آگے آئے گا شاہی ایوانات کو یہاں سرائے کہتے ہیں۔ ان کی تعداد بیس یا اکیس ہے اور سب دور دور فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ عمارتیں مختلف سلاطین کے عہد کی ہیں اور نہایت عظمت وشان کی عمارتیں ہیں ایک ایوان عین لب دریا ہے جو سرتاپا سنگ رخام کا ہے اور نہایت وسیع۔ بلند، خوشنما ہے۔ حال میں شہنشاہ جرمن، سلطان کا مہمان ہوا تھا تو اسی ایوان میں ٹھہرا تھا۔

کوئی ٹاؤن ہال نہیں

یہ بات نہایت تعجب کی ہے کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں۔ پبلک گارڈن یعنی باغ عامہ بھی ایسا مختصر ہے کہ اس عظیم الشان دار السلطنت کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔

عدالتیں

عدالتیں (بجز دو تین کے) سب یکجا واقع ہیں اور اس مجموعی عمارت کو باب عالی کہتے ہیں۔ وزیر اعظم کا محکمہ بھی یہیں ہے۔ یہ عمارتیں چنداں شاندار نہیں ہیں۔ ہائی کورٹ جس کو یہاں محکمۃ التمیز کہتے ہیں باب عالی سے فاصلے پر ہے۔ میں اس کے اندر تو نہیں گیا۔ لیکن باہر سے بڑی شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے۔ پولس کمشنر کی عدالت غلطہ میں ہے۔ میں نے اس کی اچھی طرح سیر کی۔ عمارت چنداں قابل ذکر نہیں ہے۔ لیکن نہایت مرتب اور آراستہ ہے۔ اجلاس کے کمرے میں بیش قیمت ترکی قالین بچھا ہوا ہے۔ کرسیاں بھی نہایت خوبصورت اور موزون ہیں معارف یعنی سررشتہ تعلیم کا محکمہ بھی میں نے دیکھا معمولی عمارت ہے لیکن صفائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

> **ترکوں میں یہ عجیب دستور ہے کہ وہ ہر ایک بات کو پالیٹکس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس وجہ سے کسی معاملہ کا منظر عام میں آنا پسند نہیں کرتے۔ سررشتہ تعلیم کی رپورٹ جو سالنامہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے، نہایت مختصر اور محض مجمل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مصارف تعلیم اور پروفیسروں اور ٹیچروں کی تنخواہوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔**

تعلیمی نظام

اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہو سکا کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ناظرین کو یہ امید نہ کرنی چاہیے کہ میں اپنے مقاصد میں پورا کامیاب بھی ہوا اور یہ کہ میری تعلیمی رپورٹ کوئی مکمل رپورٹ ہوگی۔ تحقیقات کے لیے میں جو کوشش کر سکتا تھا وہ یہ تھیں کہ چند بار سررشتہ تعلیم کے دفتر میں گیا۔ افسران تعلیم سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں۔ بڑے بڑے کالج اور اسکول خود جا کر دیکھے۔ ٹیچروں پروفیسروں سے ملا، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں۔ لیکن یہاں ان تمام کوششوں پر بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ترکوں میں یہ عجیب دستور ہے کہ وہ ہر ایک بات کو پالیٹکس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس وجہ سے کسی معاملہ کا منظر عام میں آنا پسند نہیں کرتے۔ سررشتہ تعلیم کی رپورٹ جو سالنامہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے، نہایت مختصر اور محض مجمل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مصارف تعلیم اور پروفیسروں اور ٹیچروں کی تنخواہوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ بعض بعض کالجوں مثلاً مکتب حربیہ و مکتب سلطانی کی جداگانہ رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں نتائج امتحان اور نصاب تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اوّل اوّل مجھ کو خیال ہوا کہ چونکہ میری رسائی کے وسیلے کم تھے۔ اس لیے یہ حالات کم معلوم ہو سکے۔ لیکن جب میں نے خیر الدین پاشا وزیر ٹونس کی کتاب پڑھی تو تسکین ہو گئی۔ اس نے جہاں ترکی کا ذکر کیا ہے اور اس کی تمدنی و تعلیمی ترقیوں کا حال لکھا ہے۔ نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور یہ معذرت کی ہے کہ "میں نے ترکی کے جو حالات لکھے وہ انگریزی کتابوں کے ذریعے سے لکھے اور اس وجہ سے مفصل نہ لکھ سکا۔ لیکن مسلمانوں کی تحریرات میں اس قدر بھی نہیں مل سکتا۔" اس تمہید اور معذرت کے بعد میں اصل مطلب شروع کرتا ہوں۔

تعلیم کے مختلف طریقے تعلیم قدیم

قسطنطنیہ بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں تعلیم کے دو طریقے ہیں قدیم و جدید۔ قدیم تعلیم ترکی حکومت کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ چنانچہ آرخان المتوفی 761ھ نے جو اس سلسلہ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا اور یہ پہلا مدرسہ تھا جو ممالک عثمانیہ میں قائم ہوا۔ آرخان کے بعد سلاطین نے حوصلہ شاہانہ سے تعلیم پر توجہ کی اور سیکڑوں دار العلوم اور مدرسے قائم کیے۔ چنانچہ ہمارے رسالہ 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ نئی تعلیم کی تاریخ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ترکی حکومت ایشیائی قالب چھوڑ کر یوروپین قالب میں آئی۔ اس انقلاب کا بانی سلطان محمود تھا جس نے اول اول یوروپین وضع اختیار کی اور فوج کو یورپ کے طرز پر آراستہ کیا۔ اسی مجدد نے 1250ھ میں کتب حربیہ کی بنیاد ڈالی جو تعلیم جدید کا پہلا کالج تھا۔ یہ کالج اب بھی موجود ہے اور تمام حربی مدارس کا مرکز ہے سلطان محمود کے بعد سلطان عبد المجید نے 1261ھ میں جدید تعلیم کو زیادہ وسعت دی۔ اور مکاتب رشدیہ قائم کیے اس عہد سے اب تک یہ تعلیم نہایت وسعت کے ساتھ جاری ہے اور روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

■

ماخذ: سفرنامہ روم ومصر وشام، **سنہ اشاعت:** 1901 عیسوی، باہتمام سید ظہور الحسن مہتمم احسن التجارت دہلی کٹرہ نظام الملک قومی پریس دہلی میں چھپا۔

انتخابِ کلام علامہ شبلی نعمانی

طمطراق لیگ

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں رندے آشام بھی ہے
فیض اس کا ہے باندازۂ طالب یعنی
بادۂ صاف بھی ہے دردِ تہہ جام بھی ہے
کعبۂ قوم جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ، قبلہ گہِ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لیے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نوآموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخرو نمائش گری عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس
ان میں طرزِ عملِ بوسہ بہ پیغام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُر آب
دل میں غم خواریِ ترکانِ نکونام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کو جو پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح 'صرف' میں ایک قاعدہ ادغام بھی ہے

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست
ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود
سفرِ درجۂ اول کے لیے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور
گرچہ یہ سوء ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
''سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے''

پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی

اک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ زند لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
''اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''

قومی مسدس

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم
بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانان ہنر پرور و ارباب ہمم
جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے جو سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزم طرب سمجھے ہیں
ہے گمان ان کو کہ آیا ہے تھیٹر کوئی
یا کہ اس سے بھی تماشا ہے یہ بڑھ کر کوئی
اس سبھا میں بھی نظر آئے گا اندر کوئی
مسخرہ بن کے بھی آئے گا مقرر کوئی
نقل وہ ہو گی کہ دیکھی نہ سنی ہو گی کبھی
سیر وہ آج کریں گے کہ نہ کی ہو گی کبھی
کوئی کہتا ہے کہ تھیٹر تو نہیں ہے لیکن
ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے ممکن
راتیں گاتی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن
دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگان مُسن
کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہو گی آخر
بوڑھے غمزوں میں کوئی بات تو ہو گی آخر
دوستو کیا تمھیں سچ مچ تھیٹر کا یقین
کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہو گا رنگین
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی اک زہرہ جبین
آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچین
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے بھی تو بیجا سمجھے
ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار
مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پر غمخوار
نظر آتے ہوں دم نزع کے سارے آثار
واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیر تماشے سے ابھی سیر نہیں
نوحہ غم ہے، یہاں نغمۂ عشرت کیسا
ہے یہ عبرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا
قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے
ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ اگر وہ شرفا
صاحب افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے ہیں جو عقدہ کشا
ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پر ہیں جلوہ نما
قوم کے خوابِ پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں
بانی مدرسہ وہ سید والا گوہر
وہ مینیجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلی غمزدہ وہ شاعر اعجاز اثر
اور یہ نو بادہ، اقبال کے سب برگ و ثمر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان
اپنے رتبوں کا نہ کچھ دھیان نہ کچھ وضع کا پاس
دوستوں سے نہ جھجک اور نہ دشمن سے ہراس
گرچہ سب کہتے ہیں حاصل نہیں کچھ بھی جز یاس
ہائے کیا دھن ہے کہ پھر بھی تو نہیں ٹوٹتی آس
غرض مطلب کی ہے تصویر سراپا ان کا
ہاتھ خود کاسہ دریوزہ ہے گویا اُن کا
ان کا ہر لفظ ہے اک مرثیہ جاں فرسا
قوم کی شان دکھا دیتی ہے ایک ایک ادا
دیکھ اے قوم جو ابتک نہ تھا تو نے دیکھا
اپنے بگڑے ہوئے انداز کا پورا خاکا
گرچہ تدبیر بھی ہم سے نہیں کچھ کی جاتی
ہائے حالت بھی تو تیری نہیں دیکھی جاتی
یوں بھلانے کو تو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر
یاد آ جاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر
وہ بھی اک دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گزر
ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر
تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی
کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی

تھے نقیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم
ترے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم
ایشیا کو جو کیا تو نے مرقع برہم
جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم
کر دیا دفترِ تاتار کو ابتر تو نے
نیزہ گاڑا تھا جگر گاہ تتر پر تو نے
کون تھا جس نے کیا فارس و یوناں تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جیپال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر وافر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا
ہم نے مانا بھی کہ اب دل سے بھلا دیں قصے
یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے
دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی نہ بھولیں سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیوں کر
مردہ شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر
بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در

مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر
اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک
اُن سے سُن لے کوئی افسانۂ یارانِ وطن
یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خوابِ کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن
تیرے ہی نغمۂ پردرد کے ہیں یہ ارگن
پوچھنا ہے جو کوئی اُن سینشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کی کہانی تیری

غزلیں

پوچھتے کیا ہو جو حالِ شبِ تنہائی تھا
رخصتِ صبر تھی یا ترکِ شکیبائی تھا
میں تھا یا دیدۂ خونابہ فشاں تھی شبِ ہجر
ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
خون رو رو دیے بس، دو ہی قدم میں چھالے
یاں وہی حوصلۂ بادیہ پیمائی تھا
دشمن جاں تھے ادھر ہجر میں درد و غم و رنج
اور ادھر ایک اکیلا ترا شیدائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رُخ پیہم
جس طرف بزم میں وہ کافر تر سائی تھا
کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم
چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

تیس دن کے لیے ترکِ مے و ساقی کرلوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمر گزشتہ کی تلافی کرلوں
کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یک سو ہوجائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی
خوب گزرے فلکِ دوں سے جو یاری کرلوں

محمد ظفر الدین

اردو میڈیم سے تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کے درخشاں مواقع

ہندوستان میں اُردو ذریعہ تعلیم کے حوالے سے اکثر وبیشتر مایوس کن باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ثانوی اوراعلیٰ سطح پر اُردو ذریعہ تعلیم کا منظرنامہ بھی خوش کن نہیں معلوم ہوتا۔ تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کے میدان میں بھی اُردو ذریعہ تعلیم کے ادارے خاصی جدوجہد سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اُردو میڈیم اسکول وکالجوں کی تعداد، وہاں اساتذہ کی صورت حال،عمارتوں اور دیگر سہولتوں کی کمی؛ طلبہ کے امتحانی نتائج اور مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو واقعی محسوس ہوتا ہے کہ 'حالات' کچھ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔مگر کیا محض شکوے شکایات اور مایوسی وافسردگی سے مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے؟ یااس کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہے؟اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ بعض نجی اداروں کے ساتھ ساتھ حکومت کی جانب سے جواقدامات کیے جارہے ہیں ہمیں اُن سے واقف ہونا چاہیے اور اُن سے جہاں تک ممکن ہوزیادہ سے زیادہ مستفید ہونا چاہیے۔ استفادے کی بڑی صورت یہ بھی ہے کہ اُن مواقع سے عوام الناس کو باخبر کیا جائے اور اُنھیں اِس کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

1998 میں جب حکومت ہند نے اُردو ذریعہ تعلیم کے سب سے بڑے ادارے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی تو اِسے دو خصوصیات سے مزین کیا۔اول تو یہ کہ اس کا دائرہ کار پورا ہندوستان رکھا دوم یہ کہ اِسے روایتی اور فاصلاتی دونوں طریقہ ہائے تعلیم کو اختیار کرنے کی اجازت اور آزادی دی۔یہ دونوں ہی خصوصیات اُردو ذریعہ تعلیم کی وسعت اور اُردو آبادی تک رسائی کے بہترین ذرائع ثابت ہورہی ہیں۔ یونیورسٹی کے مقاصد میں اُردو زبان کی ترویج وترقی، اُردو میڈیم سے پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم، روایتی وفاصلاتی طریقوں سے اُردو میڈیم تعلیم اور تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ شامل ہے۔ ابتدا ہی سے یونیورسٹی نے ان نکات پر توجہ دی اور آج بھی انھیں مقاصد کے پیش نظر یونیورسٹی اپنی کارکردگی انجام دے رہی ہے۔تاہم زیرنظر مضمون کے ذریعے قارئین کو تکنیکی، پیشہ ورانہ اور روزگار رُخی کورسز اور ان کے ملک گیر سطح پر پھیلاؤ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے تاکہ بڑی تعداد میں اُردو آبادی ان تعلیمی سہولتوں سے استفادہ کرسکے۔یونیورسٹی تکنیکی وپیشہ ورانہ تعلیم کا اُہتمام تین سطحوں پر کررہی ہے۔سب سے پہلے اس کے ہیڈ کوارٹر (حیدرآباد) میں ایجوکیشن، انجینئرنگ، مینجمنٹ وغیرہ کے کورسز موجود ہیں۔دوسری طرف ایجوکیشن اور پالی ٹکنک وغیرہ ملک کے مختلف حصوں میں واقع یونیورسٹی کے سٹیلائٹ کیمپسوں میں دستیاب ہیں جن سے مقامی اور آس پاس کے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یونیورسٹی نے فاصلاتی طریقے سے تعلیم وتربیت کے بی ایڈ کورس کا جال ملک بھر میں پھیلا دیا ہے اور الگ الگ خطوں کے طالب علموں کو اُن کے قریب ترین مراکز سے جوڑ دیا ہے۔صرف تعلیم وتربیت کی بات کی جائے تو اس شعبے میں ڈی ایڈ، بی ایڈ سے لے کر ایم ایڈ، ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی تدریس وتحقیق کا بندوبست موجود ہے۔سب سے زیادہ مانگ بی ایڈ کی ہے۔اس برس روایتی طریقہ تعلیم کے تحت سات مراکز پر 808 اور فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت تیرہ مراکز پر 1300 یعنی مجموعی طور پر 2108 بی ایڈ کی نشستوں پر داخلے کی کارروائی کی گئی۔(تفصیل۔جدول: بی ایڈ) ان میں سے بیشتر مراکز اور نشستوں کا اضافہ گزشتہ چار پانچ برسوں میں ہوا ہے۔ یہ وہ اعداد وشمار ہیں جو اُردو خواں طبقے کو روزگار سے جوڑنے کے مظہر ہیں۔ آج ملک بھر میں اُردو یونیورسٹی کے تربیت یافتہ اُمیدوار اسکول اساتذہ کی حیثیت سے کام کررہے ہیں خاص طور پر بہار، جھارکھنڈ، مہاراشٹر، مغربی بنگال، جموں وکشمیر اور جنوب کی ریاستیں تلنگانہ وکرناٹک کے مختلف اضلاع میں یہاں کے بی ایڈ اور ایم ایڈ اساتذہ بڑی تعداد میں نئی نسل کی تعلیم وتربیت میں لگے ہوئے ہیں۔یہاں کے فارغ التحصیل اساتذہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کو نہ صرف متعلقہ مضمون کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ اُنھیں اُردو معاشرے کا ایک مکمل انسان بنانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔وہ طلبہ کی شخصیت کی ہمہ جہت اور ہمہ رُخی نشوونما پر توجہ دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ذریعے سے تعلیم حاصل کرتے وقت اُنھیں غیر شعوری طور پر اُردو تہذیب ومعاشرت کا درس بھی دیا جاتا ہے۔خاص طور پر کیمپس میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والوں کو قومی سطح کا ماحول ملتا ہے جہاں الگ الگ ریاستوں اور مختلف طرح کا پس منظر رکھنے والے طالب علم ایک ساتھ رہتے ہیں اور بقائے باہم کا درس حاصل کرتے ہیں۔اُن میں خود اعتمادی کے ساتھ خود انتظامی صلاحیتیں بھی فروغ پاتی ہیں۔اور جب اُنہیں پڑھانے کا موقع ہاتھ آتا ہے تو وہ اپنی ان تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

جدول: بی ایڈ

بی ایڈ سنٹرس	روایتی طریقہ تعلیم کے تحت	فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت	نشستوں کی مجموعی تعداد
حیدرآباد☆	154	100	254
سکندرآباد	00	100	100
سری نگر☆	154	100	254
جموں	00	100	100
اننت ناگ	00	100	100
دربھنگہ☆	100	100	200
بھوپال☆	100	100	200
سنبھل	100	100	200
آسنسول	100	100	200
اورنگ آباد	100	100	200
پونے	00	100	100
فریدآباد	00	100	100
بنگلور	00	100	100
مجموعی تعداد	808	1300	2108

☆اِن چار جگہوں پر ایم ایڈ کورس بھی دستیاب ہے۔

یونیورسٹی نے حالیہ عرصے میں جو جست لگائی ہے اُن میں بی ٹیک وایم ٹیک (10+50 نشستیں)، ایم سی اے (30 نشستیں)، ایم کام (30 نشستیں) وغیرہ کے ساتھ آرٹس اور سائنس کے پانچ سالہ گریجویشن و پوسٹ گریجویشن مربوط کورسز کا آغاز بھی کیا ہے۔ ان کے تحت ریاضی، طبعیات ، کیمیا، کمپیوٹر سائنس، نباتیات، حیاتیات، تاریخ، سیاسیات، نظم و نسق عامہ، معاشیات، سماجیات، اسلامیات اور مختلف زبانوں کے ساتھ نئی نسل تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہی ہے۔ ریاضی کے چیلنجز کو قبول کرنے والوں کے لیے ایم ایس سی ریاضی ((20 کا شعبہ بھی موجود ہے۔ پہلے سے جاری کورسز ایم بی اے ((60 اور ایم سی جے ((30 بھی ملک بھر کے طلبہ کی توجہ اور کشش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ سائنس کے نئے شعبوں کے لیے بڑے پیمانے پر لیباریٹریز تیار کرانے کا کام جاری ہے۔ بی ٹیک اور ایم ٹیک (کمپیوٹر سائنس وانجینئرنگ) ایک مربوط پروگرام ہے جس میں ایک ساتھ داخلے دیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر طالب علم چاہے تو اس کے ایک حصے یعنی صرف بی ٹیک مکمل کرنے کے بعد آئندہ کی تعلیم منقطع کرسکتا ہے اور وہ صرف بی ٹیک کی سند لے کر بازار میں قسمت آزمائی کرسکتا ہے۔ اس کورس میں داخلے کے لیے طبعیات، کیمیا اور ریاضی یا طبعیات ، کیمیا، ریاضی اور حیاتیات مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا 10+2 میں مجموعی طور پر 45% نمبروں کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے تمام کورسوں کی طرح اِس کورس میں بھی داخلے کے لیے اُردو جاننا ضروری ہے۔ بی ٹیک اور ایم ٹیک کی طرح ماسٹر آف کمپیوٹر اپلی کیشن (ایم سی اے) میں بھی ایک سال کے بعد تعلیم منقطع کرنے اور PGDIT کا سرٹی فی کیٹ حاصل کرلینے کی سہولت موجود ہے۔ دراصل یونیورسٹی نے عالمی سطح کی بڑی یونیورسٹیوں کے اس نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر طالب علم درمیان میں ملازمت مل جانے یا کسی دیگر وجہ سے تعلیم چھوڑنا چاہتا ہے تو اُسے وہاں تک کی ڈگری یا سرٹی فی کیٹ عطا کردی جائے جہاں تک اُس نے تعلیم حاصل کرلی ہے۔

یونیورسٹی میں آئی ٹی آئی اور پالی ٹکنک دو بہت ہی مشہور کورسز ہیں جن کا دائرہ عمل روز افزوں بڑھتا جارہا ہے اور ان سے ملک گیر سطح پر طلبہ وطالبات مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے مراکز حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں موجود ہیں۔ پالی ٹکنک کے ڈپلوما میں رواں تعلیمی سال کے دوران مجموعی طور پر 480 نشستوں کے لیے داخلے کی کارروائی مکمل کی گئی۔ (تفصیل جدول پالی ٹکنک) اس کورس میں داخلے کی اہلیت 35% نمبروں کے ساتھ دسویں جماعت پاس اور اُردو کی جانکاری ہے جبکہ اس کی تکمیل سے طلبہ کو اندرون و بیرون ملک روزگار کے مواقع حاصل ہوجاتے ہیں۔ اِنھیں بی ٹیک کے سال دوم میں داخلے کی اجازت بھی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی طالب علم میٹرک کے بعد تین سالہ کورس مکمل کرکے انجینئرنگ کرنے کا خواہشمند ہے تو اُسے براہ راست متعلقہ مضمون میں بی ٹیک کورس کے دوسرے سال میں داخلہ دیے جانے کی سہولت موجود ہے۔ یونیورسٹی صدر مقام پر آئی ٹی آئی میں پلمبنگ، الکٹریشین، سول ڈرافٹس مین اور ریفریجریشن اینڈ ایئرکنڈیشنگ کی تعلیم کا انتظام ہے جہاں راست تدریس اور تجربہ گاہ کے ذریعے طلبہ کو تربیت دی جاتی ہے اور اُنھیں عملی زندگی (مارکیٹ) کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

جدول: پالی ٹکنک

کورس۔ڈپلوما	تعداد حیدرآباد	تعداد بنگلور	تعداد دربھنگہ	مجموعی تعداد
سول انجینئرنگ	60	40	40	140
کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ	60	40	40	140
الکٹرانک اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ	60	40	40	140
انفارمیشن ٹکنالوجی	60	00	00	60

تکنیکی اور پیشہ ورانہ کورسز میں داخلہ لینے والے طلبہ و طالبات کی رہائش کے لیے یونیورسٹی نے لڑکے اور لڑکیوں کے الگ الگ دو۔دو ہاسٹل تعمیر کروائے ہیں۔ ان ہاسٹلوں میں کم و بیش ایک ہزار طلبہ وطالبات کے قیام کی گنجائش ہے البتہ بیرونِ شہر سے آنے والے طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد مزید ہاسٹلس کی متقاضی ہے۔ لہٰذا ایک ہی جگہ پر چار ہاسٹلس کی تعمیر کی کارروائی شروع ہوچکی ہے۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو یونیورسٹی کے ذریعے ملک کے اُردو داں طبقے کے لیے تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں بڑے پیمانے پر دستیاب ہیں۔ حالیہ عرصے میں یونیورسٹی کو بھوپال، سنبھل، آسنسول اور بیدر میں زمین حاصل ہوئی ہے جہاں تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو آگے بڑھانے کی پیش قدمی ہو رہی ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ملک کے طول وعرض سے تعلق رکھنے والے طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہی طلبہ اِس یونیورسٹی کے پیامبر بھی ہیں اور سفیر بھی۔ اِنھیں کے ذریعے اُردو یونیورسٹی کے اِن روزگار سے مربوط کورسز کے بارے میں لوگوں کو مزید جانکاری ہو رہی ہے اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہونے کا عمل جاری وساری ہے۔

■

Prof. Mohd. Zafaruddin, DEAN (I/c) School of Mass Communication & Journalism
H E A D, Department of Translation Studies
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032 (AP)

عبدالناصر

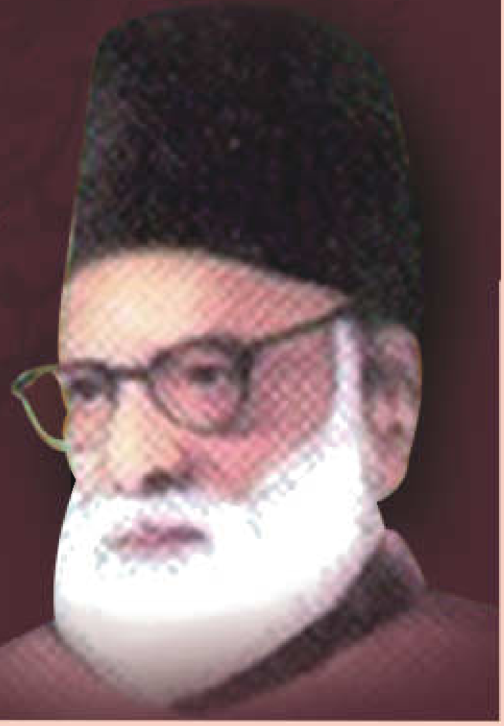

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری

صنف مُرقّع نگاری اُردو کی ایک معروف صنف ہے۔ آج تک بہت سے لوگوں نے اس میدان میں ذاتی کاوشیں کیں اور کامیاب بھی رہے۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے اردو شعرا کا جو تذکرہ 'آبِ حیات' کی شکل میں پیش کیا۔ وہ اُن کی انشاپردازی کا نمونہ ہونے کے ساتھ بیک وقت مرقع نگاری بھی ہے جس میں شعرا کی بولتی چالتی اور جیتی جاگتی تصویریں موجود ہیں۔ ان کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے 'ڈپٹی نذیر احمد' اور 'مولوی وحید الدین سلیم' کی ذات کے کامیاب مرقعے پیش کیے۔ منٹو اور رشید احمد صدیقی کے تحریر کردہ مرقعے بھی اچھے مرقعوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں قلی خاں نے اس شہر دھلی کی مناسبت سے 'مرقع دھلی' بھی تصنیف کی تھی جو اٹھارھویں صدی کی تہذیبی و تمدنی زندگی کی عکاس ہے۔

مولوی عبدالحق کی ذات کو قدرت نے بہت ساری خوبیوں سے متصف کر رکھا تھا اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان کی خدمت کے لیے وقف بھی کر رکھی تھی۔ ان کے قلم سے کئی اعلیٰ فن پارے بھی وجود میں آئے اس کے علاوہ اُردو کی قدیم مثنویاں بھی منظر عام پر آئیں جن کی شہرت و مقبولیت پر عرصۂ دراز سے پردہ پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے نہ صرف ان کو خود تلاش کیا بلکہ ان کے متعلق دیباچے بھی لکھے۔ دوسرے ادیبوں کو بھی اس سے تحریک ملی اور انھوں نے بھی اس قدیم ادبی سرمایے کو تلاش کرنے میں دلچسپی لی۔

جہاں تک مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری کی بات ہے انھوں نے اس جانب خاص طور سے توجہ نہیں دی۔ پھر بھی اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود انھوں نے جو مرقعے لکھے انھیں ان کے ایک شاگرد رشید شیخ چاند نے 'چند ہم عصر' کے نام سے یکجا کر دیا جن میں کل اٹھارہ مرقعے یا خاکے شامل تھے۔ ان میں سرسید احمد خاں کے علاوہ سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر، شعرا میں مولانا حالی اور امیر مینائی اور ادیبوں میں محسن الملک اور وحیدالدین سلیم کے نام شامل ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کا شائع کردہ 1992 کا جو ایڈیشن ہے اس میں صرف پندرہ لوگوں کے ہی مرقعے شامل ہیں۔ سرسید کا مرقع حذف کر دیا گیا ہے ممکن ہو کہ مرتب کی نظر میں اسے حذف کرنے کی کوئی خاص وجہ کارفرما رہی ہو۔ یا پھر اس میں سوانح نگاری کا رنگ غالب ہو۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی لازمی ہے کہ عام لوگوں کی نظروں میں سوانح اور مرقع نگاری میں کوئی واضح فرق نہیں لیکن یہاں بنیادی فرق یہ ہے کہ صنف سوانح نگاری خارجی فن ہے جب کہ مرقع نگاری داخلی فن ہے اور مرقع نگار، صاحب مرقع کی باطنی صفات سے آگاہ کراتا ہے۔

'چند ہم عصر' میں پہلا مرقع منشی امیر احمد صاحب مرحوم (امیر مینائی) کا ہے جن کی سلطنت اَودھ سے وابستگی اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی تصانیف 'ارشاد السلطان' اور 'ہدایۃ السلطان' جیسی ان میل اور بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنی ان کے ذمے تھی۔ آج یہ دونوں کتابیں روپوش ہو چکی ہیں۔ وہ انتزاعِ سلطنت تک لکھنؤ میں ہی رہے بعد ازاں غدر کے بعد ماہ رمضان 1275ھ میں نواب یوسف علی خاں بہادر متخلص ناظم ریاست رام پور کے پاس تشریف لائے اور نواب کی قدردانی سے فیضیاب ہوئے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے زمانے میں وہ شاعری میں ان کے استاد بھی ہوئے۔

مولوی عبدالحق نے ان کی شاعری کے متعلق یوں لکھا ہے:

"وہ اپنے خیالات کے اظہار پر پورے قادر

ہیں۔ الفاظ کی بندش اور ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ کسی حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ غرض منشی صاحب کا کلام اپنے رنگ میں اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہیں۔" (چند ہم عصر، ص8)

لیکن اصل میں امیر مینائی کا یادگار کارنامہ 'امیر اللغات' ہے۔ مگر یہ تکمیل سے محروم رہا۔ حالانکہ انھوں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ امیر مینائی کی اس لغت کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"منشی صاحب کی کتاب کی صرف دو جلدیں چھپی ہیں اور ان دونوں میں صرف (الف) کا بیان ہے۔ تیسری جلد میں (ب) ہے۔ تیار ہے مگر چھپی نہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے لیے ایک زمانہ اور صرفِ کثیر درکار تھا۔ افسوس کہ منشی جی کا انتقال ہوگیا اور یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔" (چند ہم عصر، ص9)

امیر مینائی کو اپنی اس لغت کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ تھا اور اسے انھوں نے اردو زبان کو فروغ اور وسعت دینے کے نقطۂ نظر سے لکھا تھا، چنانچہ اس کی تکمیل کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کے در دولت تک رسائی بھی کی مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہاں پہنچتے پر طویل بیماری کے باعث 17 جمادی الثانی 1318ھ بروز شنبہ رحلت فرما گئے۔

دوسرا مرقع پروفیسر مرزا حیرت کا ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل تھے لیکن وہ شہرت کی زندگی سے دور رہنا گوارہ کرتے رہے حالانکہ وہ الفنسٹن کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کی انفرادی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب یوں لکھتے ہیں:

"مرزا حیرت کی ایک ایک شے اعلیٰ درجہ کی تھی ان کا دماغ، ان کا حافظہ، ان کی قوت مشاہدہ، ان کی فیاضی سب غیر معمولی تھی۔ ان کی نظروں میں روپے کی حقیقت خاک دھول کے برابر تھی سوائے اس حالت میں جب کہ وہ کسی بیکس مظلوم کی امداد میں خرچ کرتے۔" (چند ہم عصر، ص18)

مرزا حیرت ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے لیکن اپنی موت سے چند سال قبل انھوں نے اپنے تمام شعری سرمایے کو خود ہی تلف کر دیا تھا۔ وہ جمع شدہ اپنی تمام کتابیں الفنسٹن کالج کی لائبریری کے ارباب کے حوالے کرنے کی وصیت بھی کر چکے تھے۔

تیسرا مرقع 'سید محمود مرحوم' کی وفات پر لکھی گئی تقریر ہے۔ سید محمود واقعی اپنے والد کے لائق و فائق فرزند تھے۔ وہ سرکاری وظیفے پر قانون کی تعلیم حاصل کرنے ولایت گئے اور تعلیم بھی مکمل کی۔ خود سرسید کی زندگی میں یہ سفر بھی خوشگوار تبدیلیاں لے کر آیا۔ سرسید نے وہاں جانے کے بعد جب اس معاشرے کو قریب سے دیکھا تو انھیں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم بنانے کا خیال آیا جس کے نتیجے میں انھوں نے وہاں سے آکر لوگوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے اور اس جانب راغب کرنے کے لیے 'رسالہ تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ یہاں میں نے یہ جملہ اضافی طور پر لکھ دیا لیکن یہاں ہمارا خاص مقصد تو سید محمود مرحوم کے مرقعے کی جانب سے انحراف نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"اس شخص کی زندگی کی سچی مثال اس امر کی ہے کہ لیاقت کا معیار امتحانات اور ڈگریاں نہیں ہوسکتیں، البتہ قیام ولایت میں انھیں ایک امر میں ضرور تفوق ہے اور وہ یہ کہ وہاں انھیں اعلیٰ صحبت نصیب ہوئی۔" (چند ہم عصر، ص21)

جہاں تک سرسید کے تعلیمی مشن کو پایان کار تک پہنچانے کی بات آتی ہے اس معاملے میں وہ اپنے والد کے معین و موید تھے۔ خاص طور سے کالج کو یونیورسٹی بنانے کا اولین خیال ان کے دل میں ہی پیدا ہوا تھا جس کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ ان کی یہ خواہش ان کی حیات میں تو نہیں لیکن وفات کے بعد 1920 میں شرمندۂ تعبیر ہوئی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ انھوں نے کالج کی دل کھول کے امداد کی اور ان رقوم کا کہیں بھی حساب نہیں رکھا۔ یہ خوبی انھیں سرسید سے ورثے میں ملی تھی۔ آج اس قسم کے اعلیٰ صفات کے حامل انسان خال خال نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل ایک مرقع 'مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم' پر لکھا گیا ہے جو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وحیدالدین بہ سلسلۂ ملازمت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اردو کے پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ مولوی عبدالحق ان کے سانحہ ارتحال کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"مولانا سلیم کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک جگہ خالی ہوگئی ہے جس کو پُر کرنا آسان نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ ہی کو ان کا جانشیں ملنا مشکل نہیں بلکہ اب ان جیسا ادیب سارے ملک میں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک جامع حیثیت شخص تھے، عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی کتاب 'وضع اصطلاحات علمیہ' ایک حد تک ان کی وسعت نظری اور تبحر کی شاہد ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔" (چند ہم عصر، ص86)

مولوی عبدالحق اپنے قیام دکن کے دوران اورنگ آباد میں مقیم تھے وہیں مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ میں نام دیو مالی کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس کی محنت، لگن اور جفا کشی بے مثل تھی۔ وہ پودوں کی دیکھ بھال میں ٹھیک اسی طرح مگن رہتا جیسے کوئی اپنے اولاد کی پرورش و نگہ داشت میں مصروف ہو۔ اس وجہ سے مولوی عبدالحق صاحب کی دلچسپی نام دیو مالی کے ساتھ بڑھتی گئی۔

بدلتے ہوئے زمانہ اور وقت وحالات کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس قسم کی کتابوں کا تصنیف کیا جانا ایک مستحسن فعل ہے۔ ان کی ایک دوسری اہم کتاب 'افاداتِ سلیم' جوان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ بھی کچھ کم قابل قدر نہیں ہے اس سے بھی قارئین کرام برابر مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک مرقع 'محسن الملک' کے نام سے بھی شامل ہے۔ سرسید کے اہم رفقا میں ان کا نام نہایت عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سرسید کے بعد کالج کی سکریٹری شپ کی اہم ذمے داری ان کے شانوں پر آگئی تھی جسے انھوں نے بخوبی نبھایا ساتھ ہی اردو زبان کی حفاظت وحمایت کے لیے بھی ایک انجمن قائم کی تھی جس کا اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا اس میں انھوں نے بڑی زبردست اور پرجوش تقریر کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے ان کے متعلق یہ درست ہی لکھا ہے:

"نواب محسن الملک اسی شاہراہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسید ڈال گئے تھے۔ سرسید کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا یہ انھیں کا کام تھا۔ اس کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے، محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔" (چند ہم عصر، ص105)

محسن الملک واقعی ملک وملت کے محسن تھے۔ جنھیں اپنی ذمے داریوں کا بخوبی ادراک تھا۔ اس کے بعد 'مولانا محمد علی مرحوم' کا مرقع شامل ہے وہ مختلف ومتضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ

خاص طور سے کالج کو یونیورسٹی بنانے کا اوّلین خیال ان کے دل میں ہی پیدا ہوا تھا جس کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ ان کی یہ خواہش ان کی حیات میں تو نہیں لیکن وفات کے بعد 1920 میں شرمندہ تعبیر ہوئی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ انھوں نے کالج کی دل کھول کے امداد کی اور ان رقوم کا کہیں بھی حساب نہیں رکھا۔ یہ خوبی انہیں سرسید سے ورثے میں ملی تھی۔ آج اس قسم کے اعلیٰ صفات کے حامل انسان خال خال نظر آتے ہیں۔

تھے۔ ایک جانب وہ انگریزی کے زبردست ادیب، انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے وہیں دوسری جانب حد درجہ جوشیلے بھی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کا لکھتے، بولتے یا تقریر کرتے وقت اعتدال و تناسب کا دامن خود ہاتھوں سے چھوٹ جاتا تھا۔ باوجودیکہ وہ بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کے متعلق مولوی عبدالحق کا یہ تجزیہ ہے:

"وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوسروں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن کچھ اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔" (چند ہم عصر، ص 106)

حق تو یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی شخصیت اور ذات کا اس سے بہتر اور مکمل تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کی ذات میں مصلحت پسندی کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ پھر بھی ہم سبھی ان کے خلوص اور صدق نیتی کے دل سے قائل ضرور ہیں۔

سرسید کے رفقائے کار میں سرفہرست نام 'حالی' کا ہے۔ سرسید کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے میں انھوں نے جی جان لگا دی تھی۔ اس لیے جس قدر لعن طعن اور لن ترانیاں سرسید کے حصے میں آئیں حالی بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ملاحظہ ہو:

"ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا۔ اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور 'مقدمہ شعر و شاعری' نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہل لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ 'اودھ پنچ' میں ایک طویل سلسلہ مضامین 'مقدمہ' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادب کی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کیا خرافات نہ بکی گئی ہوگی، مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔" (چند ہم عصر، ص 118)

بالآخر تمام نکتہ چینوں کی زبانیں سدا کے لیے بند ہو گئیں اور مولانا حالی کا جو شعر و شاعری، ادب و تنقید، سوانح اور شخصی مرثیے کے میدان میں مقام تھا وہ آج بھی سب پر ظاہر ہے۔

پیش نظر مجموعے میں دو مرقعے واقعی خوب ہیں۔ ان میں سے پہلا 'گدڑی کا لال - نور خاں' ہے۔ مولوی صاحب ان کی فرض شناسی اور اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے کافی متاثر تھے۔ لہٰذا وہ اس مرقع کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

"لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں، میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔" (چند ہم عصر، ص 90)

نور خاں ایک سپاہی کے عہدے پر فائز تھے لیکن وہ اپنی سچائی اور فرض شناسی کے لیے کافی مشہور تھے۔ فوج میں ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے فوج میں بھرتی ہو کر آتے تھے انھیں یہ ڈرل سکھایا کرتے تھے۔ اس لیے اکثر گورے افسران ان سے بخوبی واقف تھے۔ دوسری جانب خان صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی خودداری اور نازک مزاجی کی وجہ سے دفع داری کے عہدے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ پھر بھی وہ اپنی سچائی، دیانت داری اور سخت کوشی پر ساری عمر ثابت قدم رہے۔ مولوی عبدالحق انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا وہ مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔" (چند ہم عصر، ص 97)

اس کتاب میں شامل آخری اور اہم رقع 'نام دیو-مالی' کے عنوان سے ہے۔ وہ بھی محنتی، جفاکش اور ذاتی شرافت کا پتلا تھا۔ اس کے متعلق عبدالحق لکھتے ہیں:

"سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی اسی طرح ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔" (چند ہم عصر، ص 127)

مولوی عبدالحق اپنے قیام دکن کے دوران اورنگ آباد میں مقیم تھے وہیں مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ میں نام دیو مالی کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس کی محنت لگن اور جفاکشی بے مثل تھی۔ وہ پودوں کی دیکھ بھال میں ٹھیک اسی طرح مگن رہتا جیسے کوئی اپنے اولاد کی پرورش و نگہداشت میں مصروف ہو۔ اس وجہ سے مولوی عبدالحق صاحب کی دلچسپی نام دیو مالی کے ساتھ بڑھتی گئی۔ مرقع کے آخری حصے میں وہ نام دیو مالی کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

"آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔" (چند ہم عصر، ص 128)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرقع نگاری کے فن میں بھی مولوی عبدالحق کی اپنی واضح شناخت ہے۔ جہاں دوسرے ادبا کی رسائی نہیں ہو پائی۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنے دل کی باتیں قاری تک بخوبی پہنچا دیتے ہیں جو اپنی جگہ بے حد اہم ہے اور ایک صاحب قلم کی شناخت بھی۔ ابھی جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ تمام مرقعے میں ہماری معلومات کا خزانہ پوشیدہ ہے لیکن ان میں کچھ نے تو سوانح کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ کچھ میں دونوں کا ملا جلا رنگ نظر آتا ہے لیکن موخر الذکر دو مرقعے خالص ادبی مرقعے ہیں اور اپنی واضح انفرادیت رکھتے ہیں۔ ■

Dr. Abdun Nasir, C-24, Okhla Vihar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

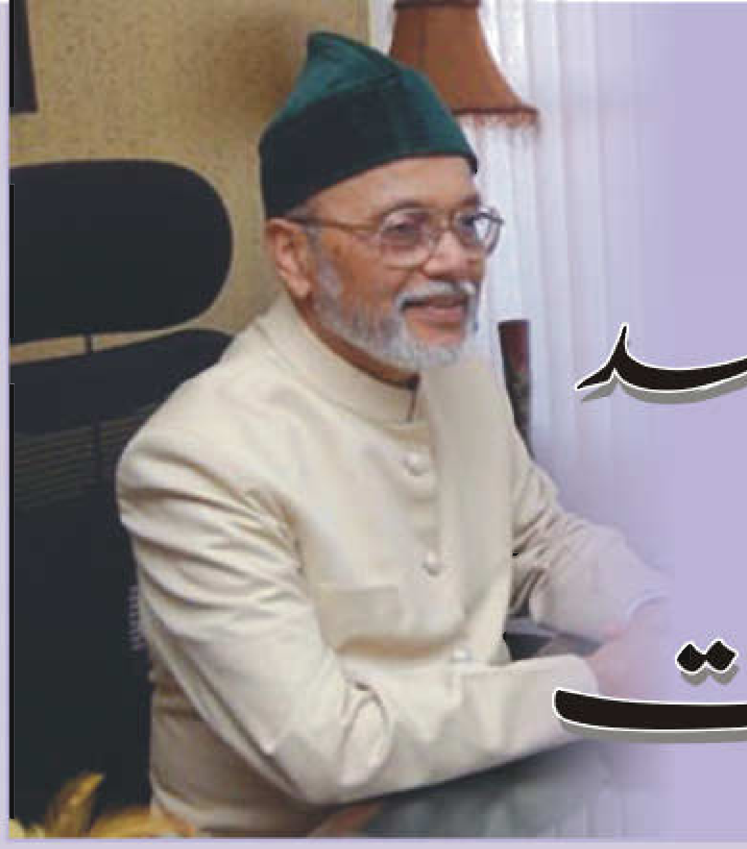

عتیق الرحمن

پروفیسر نذیر احمد کی ادبی خدمات

اردو فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اپنی کتابوں سے تنقید و تحقیق کی شمع روشن کرنے والے ادیبوں میں پروفیسر نذیر احمد کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی پیدائش 3 جنوری 1915 کو اتر پردیش کے ضلع گونڈہ پوسٹ آفس، بنکوان گاؤں کولہی غریب کے ایک شریف و با عزت گھرانے میں ہوئی۔ یہ گھرانا زمینداروں کا تھا اور اپنے حلقے میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ نذیر صاحب کے والد کا نام حاجی محمد اسماعیل اور والدہ تجّن پھلیلا خالہ کہلاتی تھیں۔ طبیعتاً دونوں نرم مزاج، کم گو اور ہنس مکھ تھے۔ بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ یہ خوبیاں نذیر صاحب کو وراثت میں ملی تھیں۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ بنکوان سے حاصل کی اور 1929 میں مدرسہ گونڈہ میں داخلہ لیا اور اسی مدرسے سے ہائی اسکول پاس کیا اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور لکھنؤ یونیورسیٹی سے فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی، 1939 میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور ایم اے بھی اسی یونیورسیٹی سے 1939 میں فارسی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ نذیر صاحب نے پی ایچ ڈی کا مقالہ 'ظہوری ترشیزی: حیات و خدمات' کے عنوان سے استاد مسعود حسن رضوی کی نگرانی میں 1945 میں تمام کیا اور فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری کا مقالہ 'عادل شاہ کے ہمعصر فارسی شعرا' کے موضوع پر لکھا اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ در آخر نذیر صاحب نے 1955-56 میں اردو ادب میں بھی ڈی لٹ کی ڈگری لکھنؤ یونیورسیٹی سے ہی حاصل کی۔

درس و تدریس: ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد نذیر صاحب نے دیوریا کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے اردو اور فارسی کے معلم کی حیثیت سے اپنے کیریئر کی شروعات کی اور دس سال تک درس و تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ لیکن انھوں نے فارسی زبان و ادب سے متعلق تحقیقی کاموں کو جاری رکھا۔ استاد نذیر احمد کا 1950 میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسیٹی میں انتخاب ہوا، نذیر صاحب نے 1955-56 میں فارسی زبان و ادب میں اپنی تکمیلی اطلاعات کو بڑھانے کے لیے ایران کا سفر کیا اور ایرانی استادوں مثلاً سعید نفیسی، بدیع الزماں فروزانفر، ذبیح اللہ صفا، پرویز ناتل خانلری اور محمد معین سے کسب فیض کیا۔ نذیر صاحب ایران سے لوٹنے کے بعد 1957 میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی میں ریڈر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا اور 1977 میں پروفیسر کی پوسٹ سے اسی یونیورسیٹی سے سبک دوش ہوئے۔ پروفیسر نذیر احمد کے ہمعصروں میں سید امیر حسن عابدی، وزیر الحسن، سید حسن، شہریار اور مرحومہ زبیدہ خاتون ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے عہدے پر بھی فائض رہے۔ ان کا انتخاب علی گڑہ میں 13 مارچ 1957 کو 'تاریخ ادب اردو' کے اسسٹنٹ ڈائیریکٹر سے ہوا۔ اس طرح لکھنؤ یونیورسیٹی سے تقریباً سات سال کام کرنے بعد علی گڑھ تشریف لائے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کے بارے میں خود انھیں کی زبانی سنیے:

"میں 1957 میں علی گڑھ آیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں لکھنؤ کے ساتھی ڈاکٹر محمد حسن صاحب بھی تھے۔ جب میں علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے اسسٹنٹ ڈائیریکٹر کی آسامی کے انٹرویو کے لیے آیا تو باوجود اس کے کہ لکھنؤ کی گاڑی چار بجے صبح پہنچتی تھی، ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے رضوان حسین صاحب کو میرے لینے کے لیے اسٹیشن بھیج دیا۔ سید رضوان حسین اب شعبۂ انگریزی کے لایق استاد ہیں، ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا قیام زہرہ باغ کوٹھی میں تھا جو ان دنوں لق و دق میدان میں یکہ وتنہا کھڑی تھی، آج زہرہ باغ ایک بڑے محلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ شروع شروع میں اکیلا علی گڑھ آیا تو پروفیسر آل احمد سرور نے جو ان دنوں سرسید ہال کے پرووسٹ تھے میرے قیام کا بندوبست وہیں کر دیا۔ میرے کمرے کے ملحق کمرے میں ڈاکٹر وسیم صدیقی کا قیام تھا جو عثمانیہ ہوسٹل کے وارڈن تھے۔ یہ وہی وسیم صدیقی صاحب ہیں جن کی ملیریا کے ویکسن سے متعلق تحقیق، عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ علی گڑہ کا نام آتے ہی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں:

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"

(کارنامۂ نذیر: ص 33و43)

اس طرح پروفیسر نذیر احمد کا درس و تدریس کا جو سفر دیوریا کے ایک معمولی سے اسکول سے شروع ہوا وہ 1977 میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے اختتام کو پہنچا۔ پروفیسر نذیر احمد کا انتقال 19 اکتوبر 2008 کو علی گڑھ میں ہوا اور یونیورسیٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

نذیر صاحب 'انجمن اساتذۂ فارسی ہند' کے بانیوں میں

سے ہیں اس کی تشکیل جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی میں 1977 میں ایرانی اساتذہ خانلری اور سعید سرجانی کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ آپ کو دوبار 'اساتذۂ فارسی ہند کا' صدر منتخب کیا گیا۔ ایک بار آل انڈیا اورینٹل کانفرنس عربی وفارسی کے صدر رہے۔ 'غالب نامہ' کے مدیر اعلی، غالب انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی کے چیرمین، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور 1991 سے تاحیات غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری رہے اس کے علاوہ 'ایران شناسی' تہران، انڈوایرانیکا، کلکتہ، معارف، اعظم گڑھ، بیاض، دہلی، قند پارسی، خانہ فرہنگ ایران، دہلی نو کے اڈیٹوریل بورڈ کے تاحیات ممبر رہے۔

انعام و اکرام: استاد نذیر احمد کو مختلف انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ 1976 میں 'اعزاز غالب' سے غالب انسٹی ٹیوٹ نے نوازا۔ 1976 میں صدر جمہوریہ ہند نے ان کی بہترین فارسی زبان و ادب میں تحقیقی و تنقیدی خدمات کے لیے (Certificate of Honour) (سرٹیفکٹ آف آنر سے، 1978 میں فخرالدین علی احمد انعام و پدم شری ان کی ادبی خدمات کے لیے عطا کیا گیا۔ 1987 میں 'جائزۂ خسرو' خسرو انجمن امریکا سے، 1988 میں 'حافظ شناسی' اعزاز، خانۂ فرہنگ ایران سے، 1980 میں انجمن اساتذۂ ہند نے ان کی اعلی خدمات کے لیے 'استاد ممتاز فارسی' اکرام سے نوازا۔ 1982 میں تہران یونیورسیٹی، ایران نے ان کی بہترین خدمات کے لیے 'ایرج افشار ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔ نذیر صاحب کی بیش بہا خدمات کے لیے خدابخش لائبریری ایوارڈ سے اور 1993 میں آپ کو آل انڈیا میرا کاڈمی نے 'اعزاز میر' کی سند سے سرفراز کیا۔

ادبی خدمات: استاد نذیر احمد اردو، فارسی اور انگریزی کی مشہور و معروف کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ جن کی فہرست بہت طویل ہے اور اس میں ظہوری ترشیزی: حیات و خدمات (انگریزی)، تحقیقی مقالے (اردو)، نورس (انگریزی)، کتاب نورس (اردو)، مکاتیب سنائی (فارسی)، تاریخ اور ادبی مطالعے (اردو)، دیوان حافظ (فارسی)، فرہنگ قواس (فارسی)، دیوان سراجی (فارسی)، نقد قاطع برہان (اردو)، دیوان عمید لوایکی (فارسی)، غالب پر چند مقالے (اردو)، فارسی قصیدہ نگاری (اردو) شامل ہیں۔

اسی طرح استاد نذیر احمد صاحب نے مختلف تاریخی اور ادبی موضوعات پر منفرد رسائل مرتب کیے ہیں جن میں سہ نثر ثمی (لاہور)، نامہ ہائے قطب شاہی (فارسی) تہران، ذال فارسی (تہران)، بیہقی و ہند (فارسی، مشہد)، Delhi، Fali، Humani's visit to Iran، Dynasty of Fars، Tumurid Mss، literary Remains, Kokakata of Artistic and Historical Values in India، قطب شاہی خطوط (اردو، علی گڑھ)، عادل شاہ کے خطوط (اردو، علی گڑھ)، فارسی اور ہندوستان (اردو، پٹنہ، سلسلہ خدا بخش خطبات، 1974)، معمای کاہی (اردو، اورینٹل کالج میگزین)، دکنی بادشاہوں کے خطوط (اردو، علی گڑھ)، برہان قاطع ((اردو، مجلۂ علوم اسلامی، علی گڑھ، جون - دسمبر، 1969)، خلیل اللہ: بیجاپور کا شاہی خطاط (اردو، علی گڑھ)، شیرانی اور ان کی فارسی تحقیق (اردو، کراچی)، شبلی اور ان کا Contribution (اردو، اعظم گڑھ)، ایاز: محمود کے دربار کا ایک جنرل (اردو، اعظم گڑھ)، ثعالبی نیشاپوری اور اسے چند نامہ (اردو، نئی دہلی) کے نام بطورِ خاص لیے جاسکتے ہیں۔

(کارنامۂ نذیر، ص 112-113)

پروفیسر نذیر نے اردو رسائل مرتب کرنے کے علاوہ 201 اردو مقالے، 19 فارسی اور 68 مقالے انگریزی میں لکھے ہیں۔

اردو مقالے: نذیر صاحب کے اردو مقالے جن کی تعداد 201 تک جاتی ہے اور فارسی زبان و ادب سے متعلق موضوعات مثلاً مخطوطہ شناسی، ادب، تاریخ، تہذیب، لغت اور موسیقی وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے بہت مقالوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آپ کے اردو مقالات مشہور و معروف میگزین مثلاً نگار، فکر و نظر، غالب نامہ، برہان، ہماری زبان، نوائے ادب، آج کل، تکمیل الطب، معاصر، آہنگ، نیا ادب، فارسی سوسائٹی، اورینٹل کانفرنس، حیدرآباد، اورینٹل کانفرنس انا ملائی، اورینٹل کانفرنس، دہلی، اورینٹل کانفرنس، بھوبھنیشور، اورینٹل کانفرنس میگزین، علی گڑھ، تاریخ ادب اردو، ہسٹری جرنل، نقوش لاہور، پاکستان، منادی، اردو کراچی، یونیورسٹی جرنل شعبۂ فارسی کلکتہ، نذر رحمان، نذر مختار، عابدی نامہ، منادی، اسلام اور عصر جدید، صحیفہ نمبر (42) تحریر، دانش، اسلام آباد، پاکستان، و گوشۂ نذیر احمد مشتمل بر چہار مقالہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔

> **پروفیسر نذیر احمد فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے عہدے پر بھی فائض رہے۔ ان کا انتخاب علی گڑھ میں 13 مارچ 1957 کو 'تاریخ ادب اردو' کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ہوا۔ اس طرح لکھنؤ یونیورسیٹی سے تقریباً سات سال کام کر نے بعد علی گڑھ تشریف لائے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔**

فارسی مقالے: استاد نذیر احمد کے فارسی مقالات مختلف موضوعات پر متعدد جرنل انڈو ایرانیکا، کلکتہ، فارسی تاریخ، تہران، ایران نامہ، تہران، قند فارسی رایزنی فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو، کیہان فرہنگی، تہران، نذر زیدی، دہلی نو، آیندہ، ایران اور ایران شناسی، تہران وغیرہ میں شایع ہو چکے ہیں۔

انگریزی مقالے: اردو و فارسی مقالات کے علاوہ نذیر صاحب کے 68 انگریزی مقالے مختلف موضوعات پر انڈو ایرانیکا، اسلامک کلچر، اورینٹل کانفرنس، لکھنؤ یونیورسٹی، بیاض اور اسلامک کلچر حیدرآباد جرنلس میں شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نام ہے ایک وسیع النظر دانشور، ایک باشعور ادیب، ایک بالغ نقاد، ایک منفرد محقق اور ایک معروف ایران شناس کا۔ حیات و کائنات اور فکر و شعور کی ترتیب نے انھیں ایک ایسے انداز نظر کا مالک بنا دیا جس کے بغیر کھوٹے اور کھرے کی پرکھ ممکن نہیں۔ اسی کا کرشمہ ہے کہ فکر و فن کے سمندر سے گوہر نایاب نکال لانا کچھ انھیں کا حصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کی فکر و آگہی کی شہرت برصغیر کی حدوں سے نکل کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پہنچ چکی ہے۔ مشرق و مغرب یکساں طور پر ان کے وجدان و عرفان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ یہ بے شمار تحقیقی، علمی، و ادبی مقالے اردو، فارسی اور انگریزی میں قلم بند کر چکے ہیں جو وقت نظر اور وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

کتابیات

(1) پروفیسر نذیر احمد، درنظر دانشمندان، پروفیسر ماریہ بلقیس، اسلامک وِنڈرس بیورو، 2002

(2) کارنامۂ نذیر، دکتر ریحانہ خاتون، اسلامک ونڈرس بیورو، 2003

(3) عابدی نامہ، گروہ زبان و ادبیات فارسی، انجمن فارسی دہلی، اے ایس پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی، 1990

(4) پروفیسر نذیر احمد، ہندی زبان و ادبیات فارسی (صفحہ 18 تا 18) مجلات ہنر، چشم انداز فرہنگی، تیر 1382، شمارہ 1، تہران، گذارشگر: مختاریان ابوالقاسم (انٹرنیٹ)

www.bedeldehlavi.com (5)

Dr. Atiqur Rahman, Asstt. Professor of Persian,
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,
Bhasha-Bhavana, Visva-Bharati, University,
Santiniketan-731235, West Bengal M.N

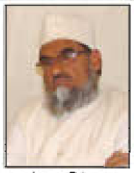

عطاء الرحمن قاسمی

خان عبد الغفار خان انبالوی

تاریخ آزادی کے مایہ ناز سپوت

تاریخ آزادیِ ہند میں عام طور پر خان عبدالغفار خاں سے بادشاہ خان ہی مراد ہوا کرتے ہیں، جنھیں عرف عام میں سرحدی گاندھی (گاندھیائی لیڈر) سے موسوم کیا جاتا ہے جو مشہور و معروف مجاہد آزادی اور خدائی خدمت گار تنظیم کے روح رواں تھے، لیکن بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ انہی کے ہم نام اور ہم مرتبہ خان عبدالغفار خان انبالوی بھی تھے، جو جذبۂ حب الوطنی میں سرشار، دیش بھگتی میں لامثال اور ایثار وقربانی میں لاثانی تھے اور انگریز دشمنی میں فرد فرید تھے اور اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اول الذکر سے افضل و برتر نہیں تو کوئی کمتر بھی نہیں تھے۔ لیکن جو شہرت و ناموری خان عبدالغفار خاں، سرحدی گاندھی کے حصے میں آئی وہ خان عبدالغفار خان انبالوی کو نصیب نہ ہوسکی۔ اسے تاریخ کا ایک المیہ قرار دیا جائے یا کسی شخصیت کا ذاتی کرشمہ۔

خان عبدالغفار خان، ضلع انبالہ کے ایک گاؤں 'لاہا' کے راجپوت پٹھان تھے، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ دو بھائی تھے، چھوٹے بھائی خان عبدالجبار خان تھے اور لاہا میں کھیتی باری کرتے تھے، جہاں آپ کی زمین اور باغات تھے، خود خان عبدالغفار خان انبالوی کو بھی کاشتکاری سے دلچسپی تھی لیکن جذبۂ حب الوطنی نے آپ کو تحریک آزادی میں حصہ لینے پر مجبور کیا اور انگریزوں کے استبداد و مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور قید و بند کی صعوبتیں واذیتیں برداشت کیں۔

مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سریندر سنگھ ہڈا اور پرتاپ سنگھ کیرون سے گہرے تعلقات اور مراسم تھے یہ تمام قومی معاصر رہنما اور مجاہدین آزادی بھی خان عبدالغفار خان انبالوی کی قومی خدمات کے معترف اور قدرداں تھے۔ خان عبدالغفار خان انبالوی حکومت ہریانہ میں ایک سے زیادہ بار وزیر اور پنجاب وقف بورڈ کی تاسیس کے بعد اس کے رکن بھی رہے۔ درگاہ قمیص الاعظم کے بھی ممبر تھے۔ آپ نے ہریانہ اسمبلی میں مختلف ایشوز پر تقریریں بھی کی ہیں۔ آپ کی تقریریں اسمبلی کارروائیوں کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔

جب 1947 کے پرآشوب دور میں مغربی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو رہا تھا، اور وہاں کے مسلمان تقسیم ملک کے نتیجے میں پاکستان جا رہے تھے، یا تہِ تیغ کیے جا رہے تھے، تو پنجاب کے دوسرے شہروں کی طرح خود انبالہ بھی مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا اور وہاں کا یہ حال تھا کہ غیر مسلم بچے اپنے والدین اور عزیز واقارب سے پوچھتے تھے کہ مسلمان کیسے ہوتے ہیں، انبالہ میں مسلمانوں کی صورتیں تک نظر نہ آتی تھیں جبکہ کبھی انبالہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر اب حالات بدل چکے تھے، ان ناگفتہ بہ حالات میں پنجاب وہریانہ کے کسی حلقہ انتخاب سے کسی مسلمان کو الیکشن لڑنا اور کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں محال تھا۔

آزادی کے بعد آزاد ہندوستان میں پہلا اسمبلی الیکشن ہوا اور کانگریس پارٹی میں حلقہ انبالہ سے اسمبلی ٹکٹ دینے کے متعلق گرما گرم بحث ہوئی کہ انبالہ حلقہ میں کس کو ٹکٹ دیا جائے۔ بعض کانگریسی لیڈروں نے کہا کہ اکثریتی فرقے کے کسی آدمی یا کسی سکھ کو ٹکٹ دیا جائے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ حلقۂ انبالہ سے خان عبدالغفار خان انبالوی کو ٹکٹ دیا جائے تو سبھی کانگریسی لیڈروں نے کہا کہ وہاں تو صرف خان عبدالغفار خان ہی ایک مسلم لیڈر اور ایک مسلم ووٹر ہیں وہ کیسے 1947 کے سلگتے اور کھولتے ماحول میں کامیاب ہو پائیں گے۔ مولانا آزاد نے بڑے وثوق کے ساتھ فرمایا! میرے

بھائی! خان عبدالغفار خان ہی کو انبالہ سے ٹکٹ دیا جائے! چنانچہ مولانا آزاد کے اصرار پر خان عبدالغفار خان کو حلقۂ انبالہ سے ٹکٹ دیا گیا اور خان عبدالغفار خان انبالہ سے بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔

واضح رہے کہ خان عبدالغفار خان کے اسمبلی الیکشن کے موقع پر دو مرتبہ پنڈت جواہر لعل نہرو الیکشن میٹنگ میں انبالہ گئے تھے۔ اسلامیہ ہائی اسکول میں، جو وقف تھا اور اب ڈی اے وی پی کالج سے موسوم ہو چکا ہے۔ خان عبدالغفار خان کا انتخابی اجلاس ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے خان عبدالغفار خان کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں خان عبدالغفار خان کے لیے نہیں اپنے لیے ووٹ مانگنے آیا ہوں تاکہ میں پڑوسی ملک پاکستان کو بتا سکوں کہ ہندوستان میں آج بھی ہندو مسلم اتحاد قائم اور بھائی چارگی کی فضا برقرار اور سیکولرزم زندہ ہے چنانچہ خان عبدالغفار خان اچھے ووٹوں سے الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

خان عبدالغفار خان کی کامیابی میں جہاں پنڈت جواہر لعل نہرو کی خطابت واپیل کا اثر تھا وہاں خود خان عبدالغفار خان اپنی ذاتی حیثیت میں ایک انمول ہیرا تھے اور دیش بھگتی وحب الوطنی میں فقید المثال تھے بیوی بچوں سے محبت کرنا ایک فطری عمل ہے اور ان سے جدائی وفراق اختیار کرنا انسان کے لیے سب سے مشکل اور صبر آزما کام ہے اور باعث قلق بھی۔ تقسیم ملک کے خوفناک حوادث کے بعد جب پنجاب سے مسلمان نقل مکانی پر مجبور ہوئے تو آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی اہلیہ اور آپ کے بچے بھی پاکستان چلے گئے لیکن اولاد سے فطری محبت کے باوجود آپ نے نہ صرف پاکستان جانا ناپسند کیا بلکہ وہاں سے آنے والے خطوط بھی نہیں پڑھتے تھے۔ اہلیہ اور بچوں کی جانب سے جو خطوط آئے دن موصول ہوتے تھے، آپ ان کو ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے۔ آپ کی ہردلعزیزی دراصل آپ کی غیر معمولی عوامی خدمت کی وجہ سے تھی، آپ کئی بار حلقہ انبالہ سے الیکشن جیتے اور اچھے ووٹوں سے جیتے اور ہریانہ کے باثر وزیر بھی رہے۔ حالانکہ آپ اقلیت میں تھے۔ آپ موجودہ لیڈروں کی طرح عوام سے بے تعلق نہیں بلکہ ہمیشہ اُن کی خدمت میں مصروف عمل رہتے اور ان کی ضیافت بھی کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ ان کی ضیافت کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہے۔

انبالہ میں خان عبدالغفار خان کے دفتر کے قریب ایک چائے فروش تھا جو خان صاحب کے مہمانوں کے لیے چائے لایا کرتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ خان عبدالغفار خان ہمیشہ مقروض رہتے تھے اور مہینہ کے آخر میں چائے کا بل اتنا آتا تھا کہ اسمبلی کی تنخواہ بھی اس کے لیے ناکافی رہتی تھی اور ہر آنے والا ان کو مزید مقروض کر جاتا تھا، وہ آنے والوں پر ناراض ہوتا کہ وہ اپنا کام بھی کراتے ہیں اور ان کو زیر بار بھی کر جاتے تھے۔ خان عبدالغفار خان کو ہریانہ اور ہریانہ کے لوگوں سے غایت تعلق تھا اور وہاں کے لوگوں پر کسی طرح کی زیادتی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی جب بنسی لعل وزیر اعلیٰ ہریانہ نے ماروتی کمپنی کے لیے گڑگاؤں کے کاشتکاروں اور غریبوں کی زمینوں کو اونے پونے داموں پر ایکوائر کرنا شروع کیا تو خان عبدالغفار خان نے سخت احتجاج کیا اور بنسی لعل کو اس عمل سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن جب بنسی لعل اپنے فیصلے سے باز نہیں آئے تو خان عبدالغفار خان نے احتجاجاً ہریانہ ہی چھوڑ دیا اور دہلی میں کرنل گمان کے گھر مقیم ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ ہریانہ سے آئے ہوئے آزادی کی پنشن کا چیک بھی واپس کر دیتے تھے۔

غالباً کچھ دنوں چودھری بریندر سنگھ ہڈا ممبر پارلیمنٹ کے گھر میں بھی رہے، چودھری بریندر سنگھ ہڈا موجودہ وزیر اعلیٰ

تقسیم ملک کے خوفناک حوادث کے بعد جب پنجاب سے مسلمان نقل مکانی پر مجبور ہوئے تو آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی اہلیہ اور آپ کے بچے بھی پاکستان چلے گئے لیکن اولاد سے فطری محبت کے باوجود آپ نے نہ صرف پاکستان جانا نا پسند کیا بلکہ وہاں سے آنے والے خطوط بھی نہیں پڑھتے تھے۔ اہلیہ اور بچوں کی جانب سے جو خطوط آئے دن موصول ہوتے تھے، آپ ان کو ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے۔

ہریانہ چودھری بھوپیندر سنگھ ہڈا کے والد تھے۔ اور پائے کے لیڈر تھے، موجودہ وزیر اعلیٰ بھوپیندر سنگھ ہڈا خان عبدالغفار خاں کے پیر بھی دبایا کرتے تھے اور جب ہلکے انداز سے دباتے تھے تو خان صاحب کہتے تھے کہ آج تم دودھ پی کر نہیں آئے۔ پروفیسر کے سی یادو صاحب نے بیان کیا ہے کہ خان عبدالغفار خان انبالوی بھوپیندر سنگھ ہڈا کے والد رنبیر سنگھ ہڈا سابق ایم پی سے کہا کرتے تھے کہ لالہ کی میری زمینیں اور باغات لے لیجیے تو رنبیر سنگھ ہڈا کہا کرتے خان صاحب میرے اوپر اتنا احسان مت کیجیے۔

ایام ہجرت کے آخر میں جب خان صاحب دہلی میں سخت بیمار ہوئے اور اسپتال میں داخل کیے گئے تو وہ آپ کا آخری وقت تھا۔ کسی نے اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کو اطلاع دی کہ خان عبدالغفار خان اسپتال میں داخل ہیں، اور کبھی کبھی روتے بھی ہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو سے خان عبدالغفار خان کے جو تعلقات و مراسم تھے ان سے اندرا گاندھی بھی واقف تھیں۔ ایک دن اندرا گاندھی خان صاحب کی عیادت کے لیے ہسپتال آگئیں اور خان عبدالغفار خان سے پوچھا کہ خان صاحب کیا بال بچے یاد آرہے ہیں، اور ان کو بلوا دیا جائے تو خان صاحب نے جھڑک کر کہا نہیں! اور دوسری طرف سر پھیر لیا۔ اندرا گاندھی پلٹ کر دوسری طرف گئیں تو دیکھا کہ خان صاحب رو رہے تھے، اندرا گاندھی سمجھ گئیں آخری وقت ہے بچے یاد آرہے ہیں۔ اندرا گاندھی نے اپنے سکریٹری کو طلب کیا اور کہا کہ تم فوراً پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمیشنر کو فون کرو اور کہہ دو کہ خان عبدالغفار خان کے بچے جہاں بھی ہوں وہ تیار ہو کر ایمبسی میں آجائیں اور یہاں سے چارٹر پلین بچوں کو لینے کے لیے بھیجا جارہا ہے۔ ان کو فوری طور پر ہندوستان لانا ہے۔ جب بچے چارٹر پلین سے ہندوستان آگئے تو اندرا گاندھی خان عبدالغفار خاں کے بچوں شمیم حیدر، عظیم حیدر کو لے کر خان عبدالغفار خان کے پاس اسپتال گئیں اور کہا خان صاحب یہ آپ کے بچے ہیں۔ اس طرح اندرا گاندھی نے آپ کی آخری خواہش بھی پوری کر دی جو نہرو خاندان کی روایت رہی ہے۔ انتقال کے بعد اندرا گاندھی نے بچوں سے کہا کہ تم لوگ اپنے گاؤں لالہ جاؤ اور وہاں جو خان صاحب کے باغ اور کھیت ہیں ان کو بیچ دو اور پیسے پاکستان لے جاؤ۔ ایک دو مہینے یہاں رہنے کے بعد ان کے بچوں نے باغ اور زمین کو فروخت کیا پھر پاکستان چلے گئے۔ خان عبدالغفار خان کا دہلی میں انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے، آج بھی آپ کی قبر پر یہ عبارت کندہ ہے:

اللہ　بسم اللہ الرحمن الرحیم　محمد

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مزار اقدس

خان عبدالغفار خان انبالوی

سابق وزیر ہریانہ و نائب صدر صوبہ پنجاب کانگریس کمیٹی

موصوف، مجاہد تحریک خلافت، مجاہد تحریک آزادی اور مولانا ابوالکلام آزاد

مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے۔

اللہ غریق رحمت کرے، انا للہ و انا الیہ راجعون

■

Mr. Ataurrahman Qasmi, N-80/C, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

مذہبی جستجو

بی آرنندا
مترجم: علی جواد زیدی

گاندھی کے باپ کرم چند، جو پور بندر ریاست اور بعد میں راجکوٹ ریاست کے دیوان تھے، دنیادار آدمی تھے اور ان کی شخصیت کی ساخت میں روحانیت کو زیادہ دخل نہیں تھا۔ لیکن ان میں وہ مذہبی کلچر ضرور موجود تھا جو ان کے زمانے اور ان کے طبقے کے تہذیبی اثاثے کا جزو تھا۔ اپنی طویل علالت کے دوران وہ کبھی کبھی اپنے پاس ہندو پنڈتوں جین منیوں اور پارسی اور مسلم عالموں کو مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے بلایا کرتے تھے۔ اپنے والد کے تیماردار کی حیثیت سے موہن ان مذاکرات کے موقعے پر اکثر موجود رہتا تھا اور اگر چہ وہ ان کی باتیں پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا، یہ حقیقت کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے دوستانہ طریقہ پر بحث کر سکتے ہیں اس کم عمری میں اس کے لیے رواداری کا سبق بن گئی تھی۔

گاندھی کی ماں تپلی بائی کا تو اوڑھنا بچھونا ہی مذہب تھا۔ ان کی زندگی برتوں اور مذہبی سنسکاروں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھی۔ اس کے باوجود گاندھی کے گھر میں باقاعدہ مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موہن جیسے بچے کے لیے جس کے یہاں مذہبی اور اخلاقی مسائل سے دل چسپی کا نشو ونما کافی قبل از وقت ہو چکا تھا یہ ایک اہم کوتاہی تھی۔ مذہبی رسوم کی جگمگاہٹ اور شان وشوکت سے ان کی تشفی بالکل نہیں ہوتی تھی۔ اپنے والد کے کتب خانے کی کتابیں دیکھتے دیکھتے ان کی نظر منوسمرتی کے قصہ تخلیق پر پڑی تھی۔ یہ انھیں اطمینان بخش نہ معلوم ہوئی، لیکن کسی نے ان کے شکوک رفع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت ان کی الجھن اور بھی بڑھ گئی جب وہ لامذہبیت کی طرف کھنچنے لگے اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ رجحان ہر قسم کے اقتدار کے خلاف ان کے عنفوان شباب کی بغاوت کا جزو تھا۔

جب اٹھارہ برس کے سن میں گاندھی لندن پہنچے تو اپنے پیدائشی مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بے حد ناقص تھیں۔ ان کے تھیوسفسٹ دوستوں نے جب انھیں سر ایڈون آرنالڈ کی کتاب (غیبی نغمہ The Song Celestial) پڑھنے کی دعوت دی تو انھیں یہ تسلیم کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی کہ انھوں نے بھگوت گیتا نہ تو سنسکرت میں پڑھی ہے اور نہ اپنی مادری زبان گجراتی میں۔ اس طرح ان کا ایسی کتاب سے تعارف ہوا جو آگے چل کر ان کی روحانی کتاب الہدایت بننے والی تھی۔ سر ایڈون کی دوسری کتاب (نور ایشیا) The Light of Asia بھی بہت دل کش ثابت ہوئی۔ گوتم بدھ کی کہانی، ان کی زندگی ترک دنیا اور تعلیمات، سبھی نے انھیں جھنجھوڑ ڈالا۔

> **گاندھی کی ماں پتلی بائی کا تو اوڑھنا بچھونا ہی مذہب تھا۔ ان کی زندگی برتوں اور مذہبی سنسکاروں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھی۔ اس کے باوجود گاندھی کے گھر میں باقاعدہ مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موہن جیسے بچے کے لیے جس کے یہاں مذہبی اور اخلاقی مسائل سے دل چسپی کا نشو و نما کافی قبل ازوقت ہوچکا تھا یہ ایک اہم کوتاہی تھی۔**

گاندھی تھیاسوفیکل سوسائٹی میں شامل نہیں ہوئے لیکن اس کے لٹریچر کو پڑھ کر مذہب میں ان کی دل چسپی ضرور بڑھ گئی یہیں ان کے ایک جوشیلے سبزی خور ساتھی نے انجیل سے بھی انھیں متعارف کرایا۔ عہد جدید والے حصے، بالخصوص تہاڑ کے وعظ نے ان کے دل کو براہ راست متاثر کیا۔ انجیل کی یہ عبارت پڑھ کر کہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ تم شر کی مقاومت نہ کرنا، لیکن جو کوئی تمھارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دینا۔ اور اگر کوئی تمھارے خلاف قانونی کارروائی کرے اور تمھارا کوئی کوٹ زبردستی لے لے تو تم اسے لبادہ بھی لے جانے دو۔" گاندھی کو گجراتی شاعر شام لال بھٹ کے یہ شعر یاد آ گئے جو وہ بچپن میں گنگنایا کرتے تھے:

پانی کے پیار کے بدلے، بھر پیٹ کھانا کھلاؤ
مہربان ہو کر سلام کرنے والے کے سامنے جوش وخروش سے جھک جاؤ
ایک پیسے کے بدلے میں سونا دے دو
اگر کوئی جان بچائے تو اس کے لیے جان دینے میں عار نہ کرو
اسی طرح عقلمندوں کے قول وفعل کا لحاظ کرو

اور چھوٹی موٹی خدمت کا بھی دس گنا صلہ دو
لیکن جو لوگ صحیح معنوں میں شریف ہوتے ہیں وہ تمام انسانوں کو ایک مانتے ہیں
اور برائی کے بدلے میں بھی خوشی خوشی بھلائی دیتے ہیں

انجیل، بدھ اور بھٹ ان کے ذہن میں یکجا ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ نفرت کے بدلے میں محبت اور شر کے بدلے میں خیر دینے کے خیال سے وہ مسحور ہو گئے۔ ابھی وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں پا رہے تھے لیکن ان کے اثر پذیر ذہن میں یہ خیال پکتا رہا۔ انگلستان چھوڑنے کے پہلے ہی گاندھی نے وہ 'لامذہبیت کا صحرا' پار کر لیا تھا جہاں وہ عنفوان شباب میں بھٹک کر پہنچ گئے تھے۔

جنوبی افریقہ کے قیام میں پہلے ہی سال انھیں کچھ پرجوش کویکر مل گئے تھے، جنھوں نے گاندھی کے مذہبی رجحان کو دیکھ کر انھیں عیسائیت کے دامن میں سمیٹ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھوں نے عیسائی دینیات اور تاریخ کی کتابوں کا ان کے سامنے انبار لگا دیا، وہ ان پر زور تبلیغ صرف کرتے رہے اور ان کے ساتھ اور ان کے لیے دعا کرتے رہے آخر میں وہ انھیں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ایک کنونشن میں اس امید سے لے گئے کہ وہ بھی اجتماعی جذبات کی زد میں بہہ جائیں گے۔ گاندھی کویکروں کے کردار کی تعریف میں پوری فیاضی سے کام لیتے رہے لیکن انھوں نے دوٹوک طور پر کہہ دیا کہ ان کے دل میں ہندو دھرم کو چھوڑنے اور عیسائیت کو قبول کرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

گاندھی کے عیسائی دوستوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تبدیل مذہب کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر قدم پیچھے ہٹا لیے۔ ایک اجنبی ملک میں کویکر تبلیغ کا پہلا اثر ان پر یقیناً زبردست ہوا لیکن انھیں پریٹوریا میں عیسائی بننے کی اس سے زیادہ جلدی نہ تھی جتنی لندن میں تھیاسوفسٹ بننے کی تھی۔ اب بھی ہندومت کے بارے میں ان کی معلومات سطحی تھیں لیکن اپنے پیدائشی مذہب کے لیے ان کے دل میں شدید وابستگی کا جذبہ تھا۔ ان کے ایک کویکر دوست، کوٹس نے ان سے کہا کہ وہ ویشنو مالا اپنی گردن سے اتار ڈالیں۔ ''یہ توہم پرستی آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آیئے، میں یہ مالا آپ کی طرف سے توڑ دوں۔'' گاندھی نے جواب دیا ''نہیں، آپ ایسا نہیں کریں گے یہ میری ماں کا مقدّس تحفہ ہے۔'' کوٹس نے پوچھا ''لیکن آپ کا اس پر اعتقاد بھی ہے؟ گاندھی نے جواب دیا میں اس کی پراسرار اہمیت سے واقف نہیں ہوں میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ اگر میں نہ پہنوں تو میں کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤں گا، لیکن معقول اور کافی دلائل کے بغیر میں اس ہار کو چھوڑ بھی نہیں سکتا جو انھوں نے اتنی محبت سے پہنائے

ہیں'' ہار ایک علامت تھا اسی طرح ان کے لیے ہندومت کو ترک کرنا بھی قوی اور معقول دلائل کے بغیر ناممکن تھا۔ ہندومت اور مالا دونوں ہی انھیں اپنے چاہنے والے والدین سے ورثے میں ملے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ایک طرف عیسائیت کے بعض پہلو۔ عیسیٰ کی زندگی اور موت، کا وعظ اور بعض عیسائیوں کی صاف و شفاف پاکیزگی، جاذب توجہ تھے تو دوسرے پہلو ایسے بھی تھے جن سے راحت ہوتی تھی۔ بچپن میں راجکوٹ کی ایک سڑک کے کونے پر انھوں نے ایک عیسائی مبلغ کو ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کا مذاق اڑاتے سنا تھا، ان کے تصور میں عیسائی تبدیلی مذہب کا مطلب گوشت خوری، تمباکو نوشی اور شراب نوشی سے تھا۔ ویشنو برادری میں جس سے گاندھی کا تعلق تھا یہ گناہ کبیرہ سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ان ہندوستانی مزدوروں کے بچے جو ناٹال میں پیدا ہوئے تھے اور جو اپنا مذہب بدل کے عیسائی ہو گئے تھے بالکل عیسائی پادریوں کی مٹھی میں تھے۔

تبدیلی مذہب سے وابستہ ان تصورات کے علاوہ، انھیں نظریاتی نوعیت کی مشکلات بھی درپیش تھیں۔ انھوں نے عیسائیت کی ایسی تفسیریں بھی دیکھی تھیں جو موجودہ عقائد سے متضاد تھیں۔ جب انھوں نے ٹالسٹائے کی (سلطنت خدا دل کے اندر Kingdem of God is With in you پڑھی تو انھیں محسوس ہوا کہ انھیں اس ایک کتاب سے جو علم حاصل ہوا وہ ان تمام کتابوں سے نہ ہو سکا تھا جو ان کے کویکر دوست انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ ٹالسٹائے نے ہر عیسائی فرقے کے چرچ کی مذمت کی کیونکہ انھوں نے عوام پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے عیسیٰ کی صحیح تعلیمات کو مسخ کر دیا تھا۔ ٹالسٹائے نے عیسیٰ کی تعلیمات اور عیسائیوں کی روزمرہ کی زندگی کے تضادات بھی دکھائے تھے۔ پہلے کی ایک کتاب (میرے معتقدات What I Believe) میں ٹالسٹائے نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ عیسیٰ عبادات اور ذاتی بخشائش کے ایک مذہب ہی کے بانی نہیں تھے بلکہ عیسیٰ کی تعلیمات ایک فلسفیانہ، اخلاقی اور سماجی نظریے کی حامل تھیں۔ ایک مزاج پسند عیسائی کے یہ خیالات اس نظریاتی تبلیغ کی موثر رد ثابت ہوئے جو کویکر گاندھی کے ذہن پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی کی عصبیت بعض بنیادی عیسائیوں کے معتقدات کو قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ وہ عیسیٰ کی تاریخی شخصیت کو قبول نہ کر سکے۔ وہ کہتے کہ ''خدا نے صلیب انیس سو برس پہلے نہیں اٹھائی تھی۔ وہ آج بھی صلیب لیے ہوئے ہے۔'' وہ اسے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ عیسیٰ کی موت اور ان کا خون تمام دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ گاندھی کے نزدیک دنیا کو گناہوں کے نتائج سے نجات پانے کے بجائے اس کی ضرورت ہے کہ دنیا میں کوئی گناہ ہی نہ کرے۔ وہ یہ بھی ماننے کو تیار نہ تھے کہ عیسائیت ہی تنہا مذہب حق پر ہے۔ وہ

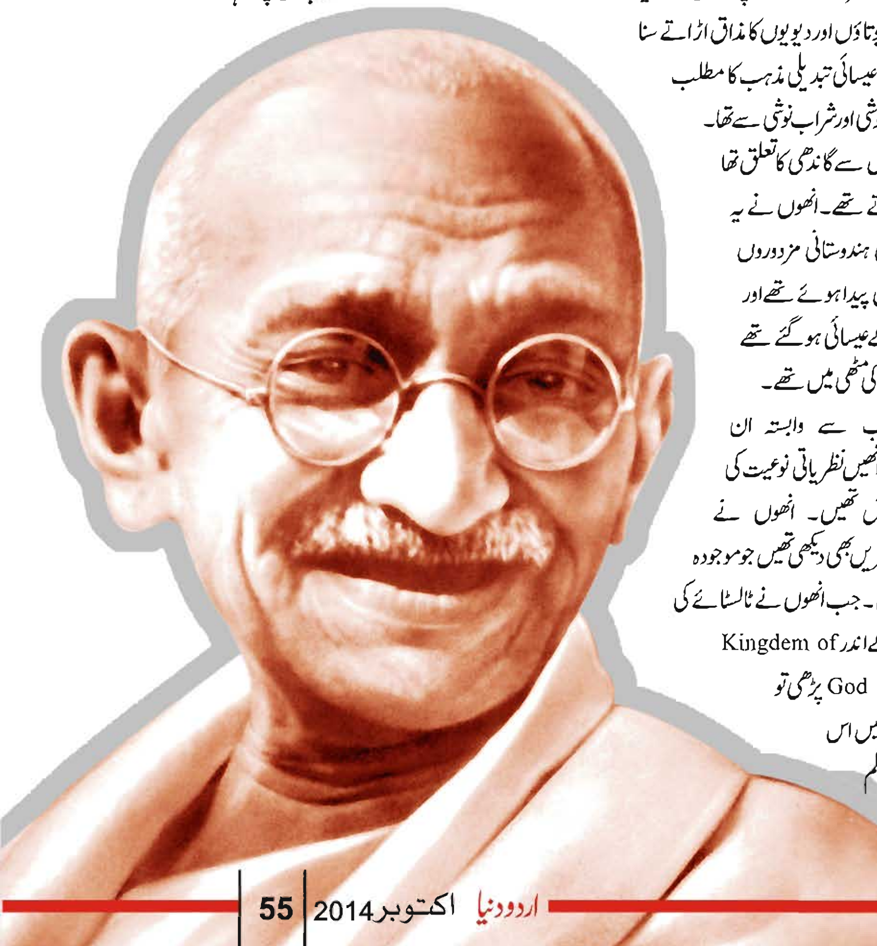

عیسیٰ کو تنہا تخت پر بٹھانے کو راضی نہ تھے۔'' وہ (عیسیٰ) بھی میری زندگی کو کچھ کم متاثر نہیں کرتے کیونکہ میں بے شمار فرزندان خدا میں انھیں بھی بے شمار کرتا ہوں۔ میں فرزندان، کے الفاظ لغوی معنوں میں نہیں بلکہ زیادہ گہرے اور غالباً زیادہ شاندار معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس سے روحانی پیدائش مراد ہے۔''

اگر چہ 1901 میں بھی وہ ایک مشہور ہندوستانی عیسائی سے روشنی حاصل کرنے کے لیے ملے، لیکن اس مذہب کو اختیار کرنے کے امکانات پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سارے مذہب ٹھیک ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی ہے کیونکہ ان کی تشریح وتفسیر معمولی دماغ والے اور بعض اوقات معمولی دل والے کرتے ہیں بلکہ زیادہ تر ان کی غلط تشریح کی جاتی ہے۔'' کارلائل کی کتاب 'ہیرو ورشپ' میں 'ہیرو بحیثیت پیغمبر' کے زیر عنوان مضمون کو پڑھ کر گاندھی پہلے پہل اسلام سے متعارف ہوئے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور واشنگٹن ارونک کی لکھی ہوئی پیغمبر حضرت محمدؐ کی سیرت پڑھی اور پیغمبر کے فقر اور انکسار اور ان کی زور اور ان کے اوّلین پیروؤں کی اس جرات کا حال پڑھ کر جس سے انھوں نے ذلتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا وہ محو حیرت ہو گئے۔

'' کارلائل کی کتاب 'ہیروورشپ' میں 'ہیرو بحیثیت پیغمبر' کے زیرعنوان مضمون کو پڑھ کر گاندھی پہلے پہل اسلام سے متعارف ہوئے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور واشنگٹن ارونک کی لکھی ہوئی پیغمبر حضرت محمد کی سیرت پڑھی اور پیغمبر کے فقر اور انکسار اور ان کی زور اور ان کے اوّلین پیروؤں کی اس جرات کا حال پڑھ کر جس سے انھوں نے ذلتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا وہ محو حیرت ہوگئے۔
جنوبی افریقہ میں عیسائیت اور اسلام پرستی پر کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں لیکن ہندومت کی کتابیں انھیں ہندوستان سے منگوانا پڑتی تھیں۔

جنوبی افریقہ میں عیسائیت اور اسلام پرستی پر کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں لیکن ہندومت کی کتابیں انھیں ہندوستان سے منگوانا پڑتی تھیں۔ انھوں نے مذہبی موضوعات پر اپنے دوست رائے چند بھائی سے خط وکتابت شروع کی۔ انھوں نے گاندھی کو استقلال کا مشورہ دیا تاکہ ہندومت کی بے مثال باریکیوں، خیال کی گہرائی، روح کے متعلق اس کی بصیرت اور فکر کی وضاحت، ان پر آشکارا ہو جائے۔ رائے چند کی عالمانہ تشریحات نے ہندومت سے گاندھی کے جذباتی لگاؤ کو اور گہرا کردیا اور اُس دور میں یہ تشریحات فیصلہ کن ثابت ہوئیں جب ان سے عیسائی دوست تقریباً یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گاندھی بپتسمہ کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

آخر میں، ہندومت سے ان کا رشتہ جس کتاب نے سب سے زیادہ استوار کیا اور ان کی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بھگوت گیتا تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے اسے 1890 میں افریقہ میں پڑھا تھا۔ یہ سر ایڈون آرنالڈ کا منظوم ترجمہ Song Celestial تھا۔ انھوں نے دوسرے ترجمے بھی اصل کے ساتھ پڑھے اور وہ اس کتاب کو روزانہ پڑھنے لگے۔ وہ روزانہ صبح کو غسل وطہارت کرتے وقت اس کا ایک اشلوک حفظ کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ انھیں پوری نظم زبانی یاد ہوگئی۔

'مہابھارت' کے رزمیے میں جس کا ایک حصہ 'گیتا' بھی ہے، بنیادی کہانی کوروؤں اور پانڈوؤں کے خاندانی جھگڑے پر مشتمل ہے۔ اس میں آخری خوں ریزی کروکشیتر کے میدان جنگ میں ہوئی۔ یہ رزمیہ گزشتہ ڈھائی ہزار برسوں سے ہندو وراثت کا حصہ رہا ہے۔ گاندھی شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ یہ رزمیہ کوئی تاریخی کتاب نہیں بلکہ تمثیلی ہے۔ جہاں تک گاندھی سمجھ سکتے تھے گیتا کا اصلی مقصد خودشناسی کی منزل کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ بے لوث عمل ہی جو عواقب کے خوف اور انعام کی خواہش کے بغیر کیا جائے، منزل تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ وہ گیتا کے لغوی معنی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ کرشن جی نے جنگجو ارجن کو شاعرانہ زبان میں للکارا ہے کہ وہ کروکشیتر کی جنگ میں آگے بڑھ کر اپنے چچازاد بھائیوں کا مقابلہ کریں، وہ دراصل ایک علامت ہے اس جنگ کی جو خیر وشر کے درمیان ہر انسانی دل میں جاری رہتی ہے۔ دریودھن اور اس کی جماعت انسان کے جذبات اسفلی اور ارجن اور ان کی جماعت جذبات علوی کی نمائندگی کرتے ہیں اور 'دلوں میں بسنے والے' خود کرشن ہیں۔ جو لوگ مہابھارت کی کہانی کو لغوی معانی میں تسلیم کیے جانے پر مصر تھے ان کو گاندھی نے بتایا کہ اگر اس کہانی کو ظاہری شکل میں تسلیم کیا جائے تو مہابھارت کے مصنف نے تشدد کے بے کار اور لاحاصل ہونے کو قطعی طور سے ثابت کردیا تھا۔ جنگ کا خاتمہ ہمہ گیر بربادی کی صورت میں نکلا اور فاتح کا حال بھی مفتوح سے کچھ بہتر نہ تھا۔

گیتا کے بارے میں یہ نظریہ روایتی نظریے اور بال گنگادھر تلک اور اروبندو گھوش جیسے اہم اور مستند اصحاب کی مستند تفسیر وتشریح سے بالکل ہی مختلف تھا۔ علما کے نزدیک کروکشیتر کی لڑائی کے تاریخی بیانات سے انکار، حقائق سے انکار کے مرادف ہے۔ انھیں یہ شبہ تھا کہ گاندھی گیتا کے حقائق کو اس لیے توڑ مروڑ رہے ہیں کہ یہ ان کے نظریہ عدم تشدد سے کسی طرح ہم آہنگ ہو سکے۔ یہ بھی اشارہ کیا جاتا تھا کہ ان کے نقطۂ نظر پر انجیل، بالخصوص پہاڑ کے وعظ کے مطالعے کا اثر ہے۔

گاندھی نے اسے تسلیم کیا ہے کہ کس طرح پہاڑ کے وعظ کے اس ٹکڑے کو کہ ''جو کوئی تمھارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا گال بھی اس کے سامنے کردینا'' انھوں نے زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا اور تبھی سے یہ ان کے ذہن پر چھا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ وشنٹ شین نے لکھا ہے ''اس سے یہ فرض لینا کہ وہ گیتا کی عیسوی تشریح پیش کررہے تھے، حق بجانب نہ ہوگا۔ اگر ہم ان کی اس ابتدائی دلیرانہ تشریح کو قبول کرلیں گے کہ کروکشیتر خود انسانی قلب ہے، تو انھوں نے اس کے بعد جو بھی تشریح و تفسیر کی ہے وہ اپنشد اور گیتا کے مشن کے عین مطابق ٹھہرتی ہے۔ اس دلیرانہ تشریح کے جو وجوہ انھوں نے بتائے ہیں وہ بدیہی حقیقت کے اس مشاہدے پر مبنی ہیں یعنی ان کی نظر میں بدیہی جو انھیں گیتا کے طویل مطالعے سے حاصل ہوا۔

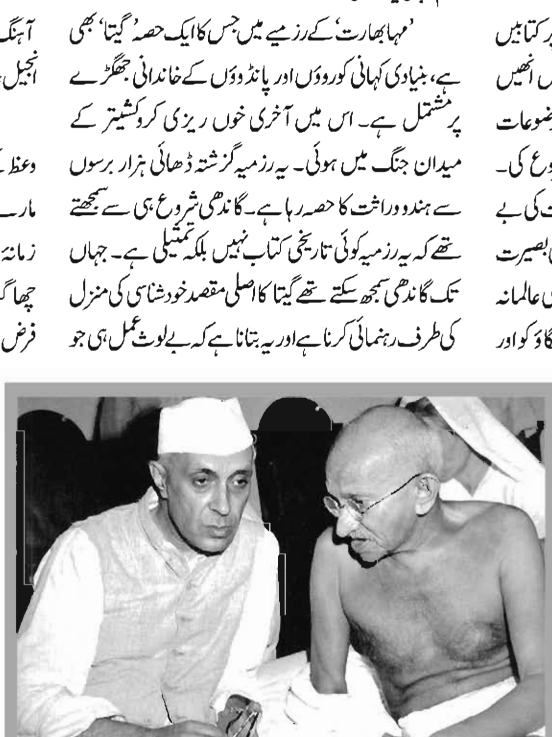

گاندھی بھی ایک اشلوک کے تجربے میں گھنٹوں

صرف کر سکتے تھے، لیکن وہ اس سے بھی واقف تھے کہ وہ عالم اور پنڈت نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ گیتا صرف عالموں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے پیغام کا مقصد یہ ہے کہ اسے زندگی میں برتا بھی جائے۔ ''یہ مان لینا چاہیے کہ 'گیتا' کے لغوی معانی کے اعتبار سے یہ کہنا ممکن ہے کہ جنگ اور (عمل کے) پھل کے ترک میں پوری موافقت ہے، لیکن چالیس برس تک اس بات کی پوری اور لگاتار کوشش کرنے کے بعد کہ میں اپنی زندگی کو گیتا کی تعلیمات کا نمونۂ عمل بناؤں میں نے بڑے انکسار کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ ہر شکل اور صورت میں اہنسا پر عمل کیے بغیر مکمل ترک ناممکن ہے۔''

انھوں نے اس بات کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا کہ کوئی صحیفہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو اس کے مفاہیم زمان و مکاں سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور صرف ایک ہی معنی تک ان کی تشریح محدود ہوتی ہے۔ عظیم صحائف کے معانی میں بھی ارتقائی کیفیت جاری رہتی ہے۔ اگر گیتا کے مصنف کو 'بے تعلق عمل' اور تشدد میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا تھا تو اس سے گاندھی کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے معانی پنہا لیے۔

گاندھی کے لیے گیتا ایک روحانی ڈکشنری (فرہنگ) بن گئی اور اخلاقی تعلیم کے لیے ایک مرشدِ برحق: ''جب کبھی مجھے افق پر روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی، میں بھگوت گیتا سے رجوع کرتا ہوں اور مجھے کوئی نہ کوئی اشلوک ایسا مل جاتا ہے جس سے میرا قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور میں محیطِ غم میں گھرا ہونے کے باوجود مسکرانے لگتا ہوں۔ میری زندگی المیوں سے بھری گزری ہے اور اگر ان المیوں سے میرے دل میں کوئی نمایاں یا ناقابلِ فراموش داغ نہیں پڑے تو یہ بھگوت گیتا کی تعلیمات کی برکت ہے۔''

دو الفاظ 'اپری گرہ' (عدم ملکیت) اور سمبھاؤ (ہمواری) نے ان کے سامنے لاتعداد راہیں کھول دی تھیں۔ عدم ملکیت کا مفہوم یہ تھا کہ جیسے جہاز کو ہلکا کرنے کے لیے سامان پھینک دیا جاتا ہے اسی طرح مادّی سامان جس کے بوجھ تلے روح دب جاتی ہے اتار پھینکا جائے اور روپے، جائداد اور جنس کے رشتے توڑ دیے جائیں اور جو علاحدہ نہ کیا جا سکے اس کا اپنے کو مالک نہیں بلکہ متولی سمجھا جائے۔ ہمواری کا مقصد یہ ہے کہ رنج و راحت فتح و شکست میں یکساں طور پر پرسکون رہنا اور کامیابی کی امید اور ناکامی کے خوف یا مختصر لفظوں میں عمل کے پھل کی پروا کیے بغیر کام کیا جائے، اسی طرح سے وہ بے عزتی کرنے والے اور گستاخ اور بد اطوار افسروں سے اور ایسے ساتھیوں سے جو کل ساتھ تھے اور آج بے معنیٰ مخالفت کر رہے تھے اور ایسے لوگوں سے جنھوں نے ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا، یکساں برتاؤ کر پائے۔ کئی برس بعد گاندھی نے عیسائی مبلغین کے ایک گروہ پر یہ راز افشا کیا کہ ''ہندومت کو جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اس سے میری روح کو اطمینان ملتا ہے اور میری تمام شخصیت میں رواں دواں ہے اور مجھے بھگوت گیتا سے وہ سکون روح حاصل ہوتا ہے جو وعظ سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہندو عقیدے کی بدولت تمام زندگی ایک وحدت ہے۔ ان کے اپنے عقیدۂ عدم تشدد (اہنسا) کی تصدیق بھی ہوئی اور یہ عقیدہ بھی برقرار رہا۔ وہ ہندوؤں کی ہر رسم یا ہر عقیدے کو نہیں مانتے تھے۔ وہ ہر مذہب کے ہر اصول اور قاعدے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اگر انسانیت سوز یا غیر منصفانہ رسوم کے لیے مقدس کتابوں کی سند پیش کی جاتی تھی تو ان کا ردِ عمل کھلم کھلا عدم اعتماد کا ہوتا تھا۔ یہ قول جو بار بار دہرایا جاتا ہے کہ عورتوں کے لیے کوئی آزادی نہیں ہو سکتی، اور جس کو واضع قانون منو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کو وہ بعد کا اضافہ تصور کرتے تھے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہی کہیں گے کہ منو کے زمانے میں عورتوں کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اسی طرح انھوں نے ان لوگوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جو چھوت چھات کا جواز ویدوں سے مہیا کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار ان کا ہندو دھرم چند اساسی معتقدات میں محدود ہو گیا۔ یہ معتقدات تھے ایشور (خدا) کی حقیقتِ مطلق، تمام زندگی کی وحدت اور عرفانِ الٰہی کے واسطے محبت کی اہمیت (اہنسا)۔ ایسے بنیادی مذہب میں علاحدگی پسندی اور تنگ نظری کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے خیال میں ہندومت کی خوبی یہ تھی کہ اس میں تمام دنیا کے پیغمبروں کی پرستش کی گنجائش تھی۔ یہ عرفِ عام میں تبلیغی مذہب نہیں ہے۔

ہندومت ہر ایک سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے دھرم یا مذہب کے اعتبار سے خدا کی پرستش کرے اور اسی وجہ سے یہ تمام مذہبوں سے صلح کا برتاؤ کرتا ہے۔

انھوں نے عیسائی مبلغین کی اس بات پر سرزنش کی کہ وہ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کے لیے ''غیر مذہبی جوا کھیلتے ہیں۔ جو شے کسی شخص کو اچھا عیسائی، یا اچھا مسلمان یا اچھا ہندو بناتی ہے وہ اس کا طرزِ زندگی ہے نہ کہ اشلوکوں کی قرأت یا عبادت کا طریقہ روحوں کو بچانے کے لیے مشنریوں کی کوشش انھیں متکبرانہ معلوم ہوئی۔ آسام کے آدی باسیوں اور پہاڑوں کے بارے میں انھوں نے کہا ''میں ان کے پاس کیا لے کر جاؤں؟ میں ان کے پاس اپنی برہنگی ہی لے کر جا سکتا ہوں۔ انھیں اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں شامل ہونے کی دعوت دینے کی بجائے مجھے خود ان کی دعاؤں میں شرکت کرنا چاہیے۔''

مذاہب کے تقابلی مطالعے، ان کی دینیات کی کتابوں کے تھوڑے بہت مطالعے اور مختلف مذاہب کے علما سے گفتگو اور خط و کتابت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اصلی مذہب میں دل کا معاملہ زیادہ ہے اور دانشوری کا کم اور اصلی اعتقاد وہی ہے جس پر خود عمل بھی کیا جا سکے۔ یہ ان لوگوں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آ سکتا تھا جن کے پاس بقول سویفٹ اتنا مذہب تو تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کر سکیں لیکن اتنا نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کر سکیں۔ گاندھی کو ان کی زندگی میں مختلف القاب سے یاد کیا گیا۔ سناتنی (کٹّر) ہندو، مرتد ہندو، بودھ، تھیاسوفسٹ، عیسائی اور عیسائی مسلمان۔ وہ یہ سب تھے اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ عقائد و رسوم کے ٹکراؤ کی تہہ میں انھوں نے ایک وحدت ڈھونڈ لی تھی۔ ایک مکتوب نگار نے گاندھی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ عیسائیت قبول کر کے اپنی روح کو بچا لیں۔ گاندھی نے جواب میں لکھا ہے ''خدا کسی لوہے کی الماری میں بند نہیں ہے کہ اُس تک الماری کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں داخل ہو کر ہی پہنچا جا سکتا ہو۔ وہ تو کھلا ہوا ہے۔ اور اس تک اربوں راہوں سے پہنچا جا سکتا ہے، بس انکسار اور دل کی صفائی شرط ہے۔

■

ماخذ: مہاتما گاندھی، **مصنف:** بی آر نندا، **مترجم:** علی جواد زیدی، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، **سنہ اشاعت:** پہلا ایڈیشن: 1986، دوسرا ایڈیشن: 2002

محمد عبدالرحمن ارشد

رچرڈ ایٹن برا: ایک عظیم گاندھی شناس

مہاتما گاندھی اور گاندھیائی فلسفہ وطرزِ حیات کے مداحوں اور معتقدین میں ایک اہم نام بین الاقوامی شہرت یافتہ فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار رچرڈ ایٹن برا کا بھی ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی حیات اور جہدِ آزادی پر ایک تاریخ ساز بایوپک 'گاندھی' ڈائرکٹ کی۔ یہ فلم نہ صرف برطانیہ اور ہندستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی خوب دیکھی اور پسند کی گئی۔ ایٹن برو نے مہاتما گاندھی کی شخصیت کو فلم 'گاندھی' بنا کر پردہ پر بھی زندہ جاوید بنا دیا۔

ایٹن برا کا پورا نام رچرڈ سیمول ایٹن برا تھا۔ ان کی پیدائش 29 اگست 1923 کو انگلینڈ کے مشہور شہر کیمبرج میں ہوئی۔ ایٹن برو کے والد فرڈرک لیوی ایٹن برو ایمین ویل کالج، کیمبرج میں پرنسپل تھے۔ ایٹن برو تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈیوڈ ایٹن برو ماہر علم حیاتیات ہیں اور بی بی سی سے بطور براڈ کاسٹر جڑے ہوئے ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی جان ایٹن برو ہیں۔ ان کی موت 2012 میں ہوئی۔ رچرڈ ایٹن برو نے 1945 میں اداکارہ شیلا سِم سے شادی کی۔ انھیں تین اولادیں ہوئیں، جن میں بڑی بیٹی جین ہالینڈ اور اس کی 15 سالہ لڑکی لیوسی کی موت 2004 بحر ہند کی سونامی میں ہوگئی تھی، اس حادثے سے ایٹن برو کو گہرا صدمہ پہنچا۔ ان کی دیگر دو اولاد مائکل اور شارلٹ ہیں۔ مائکل ایک تھیٹر ڈائرکٹر ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔ شارلٹ ایک اداکارہ ہیں انھیں 3 بچے ہیں۔ ایٹن برو کی ابتدائی تعلیم وگسٹن گرامر اسکول فار بوائز، لی سسٹر میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے لندن کے مشہور ڈراما اسکول رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ (راڈا) میں داخلہ لیا۔ یہ لندن کا قدیم ترین ڈراما اسکول ہے جس کی بنیاد 1904 میں پڑی تھی۔ یہ ادارہ دنیا کا سب سے بڑا ڈراما اسکول مانا جاتا ہے۔ اس ادارے سے ان کا تعلق تاعمر رہا۔

ایٹن برا کی بنائی ہوئی فلم 'گاندھی' 1982 میں ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بنیادی طور پر انگریزی میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں مہاتما گاندھی کا کردار بین کنگسلے نے ادا کیا ہے۔ برطانوی اداکار بین کنگسلے اس کردار کے لیے پوری طرح موزوں تھے۔ وہ فلم میں مہاتما گاندھی سے کافی حد تک ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بین کنگسلے نے برٹش متاثر ہندستانی انگریزی کے لب ولہجہ کو بھی پوری طرح اپنا لیا ہے۔ فلم 'گاندھی' ان معنوں میں اہم ہے کہ یہ پہلی مغربی فیچر فلم تھی جو ہندستان میں بنائی گئی اور پورے طور پر ہندستان کی ایک عظیم شخصیت کے گرد گھومتی ہے۔ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے عظیم پیغام کی بازگشت اس فلم میں صاف سنائی دیتی ہے۔

اس فلم نے لاکھوں لوگوں کو مہاتما گاندھی اور ان کے فلسفے سے متعارف کروایا۔ فلم گاندھی تاریخی اور دستاویزی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ تفریح کے مقصد کو بھی پورے طور پر ادا کرتی ہے۔ فلم 'گاندھی' کی زبردست کامیابی کو دیکھتے ہوئے اسے 11 آسکر انعامات کے لیے نامزد کیا گیا تھا جن میں آٹھ آسکر اس فلم کو ملے۔ بہترین پکچر اور بہترین ہدایت کار کے آسکر انعام سے ایٹن برو کو نوازا گیا۔ بہترین آرٹ ڈائرکشن، سنیماٹوگرافی اور ملبوسات ڈیزائن کا تین آسکر بھانو اتھیا کو ملا۔ اس کے علاوہ بہترین حقیقی اسکرین پلے کے لیے جان برائی لی، بہترین فلم ایڈیٹنگ کے لیے جان بلوم اور مرکزی کردار (مہاتما گاندھی کا) کے لیے بہترین اداکار کا آسکر بین کنگسلے کے حصے میں رہا۔

بابائے قوم 'گاندھی' کی حیات اور ان کے عظیم کارناموں کی کہانی ہے جس میں ان کے ایک عام وکیل سے عظیم قومی رہنما اور بین الاقوامی امن ومفاہمت کا علمبردار بننے تک ان کے سفر کا جیتا جاگتا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی ایک طرف ہندستان کی جدو جہد آزادی کے اہم ترین محرک کے طور پر جانے جاتے ہیں تو دوسری جانب روحانی پیشوا کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے فلسفے نے لاکھوں عوام کو متاثر کیا ہے۔ ان دونوں حیثیتوں کو فلم 'گاندھی' میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس فلم کی پیشکش اتنی فطری اور حقیقی ہے کہ شروع سے ہی ہم بیانیے میں کھو جاتے ہیں اور کرداروں سے اپنا ذہنی انسلاک پیدا کر لیتے ہیں۔ فلمی مناظر کی ترتیب پوری طرح منطقی ہے۔ فلم تقریباً 3 گھنٹے کے دورانیے میں ہے لیکن ظاہر ہے اتنا وقت فلم میں 55 سال کی مدت کے کارناموں کے بیان کے لیے ناکافی ہے۔ اس نکتے

کے پیش نظر ایٹن برو نے فلم میں جدو جہد آزادی اور مہاتما گاندھی کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو ہی فلمایا ہے۔

فلم 'گاندھی' کا پروڈکشن ایٹن برو کا دیرینہ خواب تھا۔ ایٹن برو کی ملاقات لندن کے وال ڈورف میں مہاتما گاندھی کے ایک پیروکار موتی کوٹھاری سے ہوئی تھی۔ تب موتی کوٹھاری نے ایٹن برو کو مہاتما گاندھی پر ایک فلم بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ ایٹن برو ان کی رائے سے متفق ہو گئے اور انھوں نے فلم بنانے کا ارادہ کرلیا۔ واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ آٹھ برس کی عمر میں ایٹن برو نے مہاتما گاندھی پر ایک نیوز ریل دیکھی تھی۔ تبھی سے وہ ان سے متعارف اور متاثر تھے۔ ان کے والد فرڈرک لیوی ایٹن برو بھی گاندھی سے بے حد متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ ایٹن برو مہاتما گاندھی کے نقش قدم پر چلیں۔ یہی وجہ تھی کہ موتی کوٹھاری کی تجویز کو ایٹن برو نے سنجیدگی سے لیا اور مہاتما گاندھی پر فلم پروڈیوس کرنے کا عزم کرلیا۔

فلم بنانے کے لیے انھیں 20 سال تک مختلف چیزوں کے لیے جدو جہد اور جستجو کرنی پڑی۔ چاہے وہ فنڈ اکٹھا کرنے کا کام ہو یا فلم بنانے سے متعلق دیگر امور کا۔ مالیات کے انتظام کے بعد ایٹن برو کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مہاتما گاندھی کا کردار ادا کرنے والے اداکار کی تلاش کا تھا۔ ایٹن برو اپنی سوانح عمری Entirely Upto you, Dorling! میں لکھتے ہیں کہ اس سے متعلق ایک خصوصی ملاقات میں انھوں نے جب پنڈت جواہر لعل نہرو سے بات کی تو انھوں نے ایلک گِنس کو مہاتما گاندھی کے کردار کے لیے موزوں ترین خیال کیا۔ ایٹن برو پنڈت نہرو کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں اداکار کی قومیت ایک غیر اہم چیز ہے۔ اور جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ اداکار بہت اچھا ہونا چاہیے۔ ایٹن برو لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے اس بارے میں ایلک گِنس سے بات کی تو انھوں نے اپنی جسامت اور ضعیف العمری کا عذر پیش کردیا۔ بہت سارے اداکاروں پر غور وخوض کرنے کے بعد اخیر میں ایٹن برو نے جان ہرٹ اور بین کنگسلے کو اسکرین ٹسٹ کے لیے رضامند کر لیا۔ اسکرین ٹسٹ میں مہاتما گاندھی کے کردار کے لیے بین کنگسلے کو موزون ترین مانا گیا۔ 'گاندھی' کی شوٹنگ 1980 میں شروع ہوئی۔ گویا اس تگ و دو میں 18 سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایٹن برو بتاتے ہیں کہ تب تک اس فلم کے بنانے کا مشورہ دینے والے موتی کوٹھاری کی موت ہو چکی تھی۔ شوٹنگ کی شروعات مہاتما گاندھی کی 33 ویں برسی کے موقع پر ہوئی جس میں ان کی آخری رسومات کو فلمایا گیا۔ اس موقع کی شوٹنگ کے لیے عوام کا ایک جم غفیر درکار تھا۔ ایٹن برو تذبذب میں تھے کہ بڑی تعداد میں لوگ آئیں گے کہ نہیں۔ لیکن شوٹنگ کے دن صبح ہوتے ہی جب عوام کا ریلا چلا تو ایٹن برو کو مہاتما گاندھی کی مقبولیت اور فلم کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ تقریباً 4 لاکھ افراد اس موقع پر جمع ہوئے تھے جو فلم سازی کی تاریخ میں سب سے بڑا مجمع تھا۔

'گاندھی' کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ایٹن برو نے اس کام کے لیے بہت سارے لوگوں کو مدعو کیا، لیکن خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ سب سے پہلے تو اس فلم کے تجویز کار موتی کوٹھاری سے ایٹن برو نے دریافت کیا، لیکن ان کے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ ایٹن برو فلم بنانے کا پکا ارادہ کر

> **ایٹن برو عظیم اداکار اور ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ انھوں نے فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیٹی کی یاد میں انھوں نے جنوبی افریقہ کے شہر سوازی لینڈ میں جین ہالینڈ سنٹر فار لرننگ قائم کیا جو دسمبر 2004 کی سونامی کا شکار ہو گئیں تھیں۔ وہ تعلیم کے سفیر تھے۔ ایسی تعلیم جو رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق مٹادے۔**

چکے تھے اس لیے انھوں نے فنڈ کی فراہمی کے لیے اپنی تگ ودو جاری رکھی۔ فلم بننے اور پورا ہونے کا خواب تب پورا ہوا جب حکومتِ ہند نے فلم بنانے میں مالی اشتراک کیا۔ کیونکہ پنڈت نہرو اپنی موت سے قبل فلم کو مالی امداد کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فلم کو بنانے کے لیے ایٹن برو نے اپنا گھر بھی رہن رکھ دیا تھا۔ بہر حال کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ 22 ملین ڈالر کے لاگت کی یہ فلم اپنے اخراجات کو بھی حاصل کر پائے گی یا نہیں۔ فلم کی زبردست کامیابی نے سارے شک وشبہات کو پارہ پارہ کردیا اور فلم نے اپنے اخراجات سے 20 گنا زیادہ کمائی کی۔

ہدایت کار کی حیثیت سے ایٹن برو نے ایک درجن فلمیں بنائی ہیں۔ ان کے ڈائرکشن میں بنی پہلی فیچر فلم "Oh! What a Lovely War" تھی جو 1969 میں ریلیز ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے Young Winston (1972)، A Bridge Too Far (1977)، Magic (1978)، Gandhi (1982)، A Chorus Line (1985)، Cry Freedom (1987)، Chaplin (1992)، Shadow Lland (1994)، In Love and War (1997)، Grey Owl (1999) اور Closing the Ring (2009) فلمیں ڈائرکٹ کیں۔ ان میں Cry Freedom اہم ہے۔ یہ فلم اسٹیو بائکو (یہ ایک سیاہ فام افریقی تھے جنھوں نے نسل پرستی کے خلاف بلیک کانشسنس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی) اور سفید نسل ڈونالڈ ووڈس کی دوستی کی سچی کہانی پر مبنی ہے۔ حالانکہ 1992 میں ان کی ہدایت کاری میں چارلی چیپلن کی سوانح عمری پر بنائی گئی فلم Chaplin ناکام رہی تھی۔

ایٹن برو نے چھ درجن سے زائد فلموں میں اداکاری کی ہے۔ 1942 میں بنی فلم In Which We Serve اداکار کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں 19 سالہ ایٹن برو نے فوجی جہاز کے عملہ کا رول کیا۔ اداکار کے طور پر Brighton Rock، The Great Escape، 10 Rillington Place، Miracle on 34th Street اور Jurassic Park میں انھیں بہترین رول ادا کرنے کے لیے خوب پذیرائی کی گئی۔ Jurassic Park میں ایٹن برو نے ایک سنکی سائنسداں کا رول کیا ہے جس کا مقصد صرف پیسے کمانا ہوتا ہے۔ Brighton Rock جرائم پر بنی ایک فلم ہے۔ ان کی پہلی کامیاب فلم The Angry Silence تھی جو 1960 میں ریلیز ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ستیہ جیت رے کی فلم 'شطرنج کے کھلاڑی' میں جنرل جیمس آٹرم کا رول ادا کیا ہے۔ یہ فلم منشی پریم چند کے اسی نام کے افسانے پر بنی اور 1977 میں ریلیز ہوئی تھی۔

ایٹن برو عظیم اداکار اور ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ انھوں نے فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیٹی کی یاد میں انھوں نے جنوبی افریقہ کے شہر سوازی لینڈ میں جین ہالینڈ سنٹر فار لرننگ قائم کیا جو دسمبر 2004 کی سونامی کا شکار ہو گئیں تھیں۔ وہ تعلیم کے سفیر تھے۔ ایسی تعلیم جو رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق مٹادے۔ اپنے اسی جذبے کی وجہ سے وہ جنوبی افریقہ کے واٹر فورڈ کملابا ورلڈ کالج آف ساؤدرن افریقہ سے جڑے رہے۔ یہیں سے انھیں فلم 'کرائی فریڈم' بنانے کی ترغیب ملی۔ ایٹن برو کی پوری زندگی حرکت وعمل کا آئینہ ہے۔ ان کا انتقال سنیما کی دنیا بالخصوص ہالی ووڈ کے لیے بڑا خسارہ ہے۔

■

Mohd Abdur Rahman Arshad, Research Scholar, Dept of urdu, Dehli University Delhi - 110007

سید اطہر رضا بلگرامی

حج
اقتصادی تطہیرِ نفس کے دائرے میں

اسلام میں حج وہ فریضہ عبادت ہے جو قولی و فعلی اعتبار سے اقتصادی تطہیر نفس سے جڑا نظر آتا ہے۔ اِس فریضے کی ادائیگی کا حکم اقتصادیات کی بنیاد پر ٹکا ہے جو ایک طرف تمام حج پر آمادہ افراد کو ابتدا سے ہی تطہیر نفس کی تربیت دیتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف تمام اہم اقتصادی سرگرمیوں جیسے پیداوار، تقسیم، بازار، سرمایہ کاری، روزگار، تجارت، درآمدات و برآمدات، کرنسی کی منتقلی کو تطہیرِ کار کے اصولوں میں باندھتا نظر آتا ہے۔ اس طرح عملِ حج عالمی سطح پر نظامِ معیشت کا ایسا ماڈل پیش کررہا ہے جہاں تمام معاشی سرگرمیاں مساوات پر مبنی معاشی استحکام کو فروغ دیتی نظر آتی ہیں۔

حکم ہو رہا ہے کہ اگر استطاعت ہو تو زندگی میں ایک بار حج ضرور کرو۔ حج کی ابتدا ہی معاشی بنیاد پر رکھی گئی۔ استطاعت کی بندش نے اس عبادت کو دیگر عبادتوں کے مقابلے تمام معاشی سماجی، و معاشرتی فرائض کے دائروں میں سمیٹ کر زیادہ وسیع و بلیغ بنا دیا اور واضح کر دیا کہ عبادت ان فرائض سے منہ موڑ کر، ان کو نظر انداز کر کے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ دراصل استطاعت کو فرائض کی ادائیگی کا پیمانہ بنایا گیا اور عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔

(1)

جس وقت حج کا ارادہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے مالی استطاعت کی طرف ذہن جاتا ہے جو آمدنی کا پیمانہ ہے۔ یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ حج کے مجموعی مصارف کیا ہوں گے اور کیا ان کو پورا کرنے کے اہل ہیں یا نہیں۔ اگر مالی اعتبار سے خود کفیل نہ ہوئے تو پھر دیگر ذرائع کیا ہوں گے۔ یہاں قابل فروخت اثاثوں کی طرف نظر جاتی ہے، عزیز و اقارب و دوست احباب سے مالی تعاون کی طرف ذہن جاتا ہے۔

جب استطاعت کے ان مادی پیمانوں کو پرکھ لیا جاتا ہے تو پھر سماجی و معاشرتی فرائض میں لپٹی استطاعت کی طرف توجہ موڑی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ کون کون سے سماجی و معاشرتی فرائض واجب کیے گئے ہیں جن کی ادئیگی یا معقول بندوبست کے بغیر حج نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے گھر میں دیکھیے کہ کوئی شادی کے قابل بیٹی یا بہن موجود تو نہیں۔ پہلے اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئیے یا تسلی بخش انتظام کر لیجیے، پھر حج کا عزم کیجیے۔ یہ بھی دیکھیے کہ کسی کی کفالت تو نہیں کر رہے ہیں، کسی کی دیگر اقتصادی ذمے داریوں کو تو نہیں نبھا رہے ہیں۔ ان کا معقول بندوبست کر لیجیے پھر حج کا قصد کیجیے۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ آپ کسی فرد یا ادارے کے مقروض تو نہیں یا کسی کا اہم فرض واجب الادا تو نہیں۔ پہلے ان کا تشفی بخش انتظام کر لیجیے پھر حج کا ارادہ کیجیے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ گھر میں کوئی ایسا دائمی مرض میں مبتلا عزیز تو نہیں یا کوئی معذور عزیز شخص یا بزرگ تو نہیں جن کی تیمارداری یا دیگر ذمے داریاں آپ پر ہوں۔ ان کو بے آسرا چھوڑ کر حج کا فریضہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انسانیت کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کو سماجی و معاشرتی استطاعت کے دائرے میں رکھ کر فرض بنایا گیا اور اس فرض کی ادائیگی سے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ کیا گیا۔

اگر غور کیجیے تو حج جیسی عبادت کی ابتدا ہی اقتصادی، سماجی و معاشرتی فرائض کے احساس کو ابھارنے سے منسلک کر دی گئی۔ یہ عبادت آلائش دنیا سے پاک و صاف کر کے انسان کو انسانیت کی اعلیٰ صفات سے مزین کرتی ہے تاکہ وہ ملک و سماج کا قیمتی اثاثہ بنے۔ عصر حاضر کا معاشی نظام جو انسانی وسائل کے فروغ میں ماڈی وسائل کے ہمراہ غیر مادی وسائل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے اور اس کو سرمایہ بنانے میں مشغول ہے، اس کے لیے حج ایک تربیت گاہ ہے، ایک عملی ماڈل ہے جو انصاف پر مبنی مستحکم معاشی نظام کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے۔

(II)

جب آپ استعداد و استطاعت کا اندازہ لگاتے ہوئے حج کے لیے پُرعزم ہوئے تو تیاریاں مختلف اقتصادی سرگرمیوں میں ملوث ہوگئیں جو طلب کی صورت ایک اجتماعی فورس کے طور پر ابھرتی ہے۔ یہ فورس محلہ، قصبہ، شہر، علاقہ،

صوبے اور پھر ملک گیر دائروں میں وسیع ہوتی جاتی ہے مرد، خواتین، جوان، بوڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ اجتماعی فورس بہ لحاظ عمر و جنس اور مالی استعداد مختلف سطحوں میں تقسیم ہوتے ہوئے ایک مجموعی عظیم فورس میں ڈھل جاتی ہے۔

آپ حج کی تیاریوں کی عملی سرگرمیوں پر نظر ڈالیے تو اقتصادیات کے تمام معروف شعبے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔ طلب کی فورس نے سپلائی کو متاثر کیا تو پھر پیداوار، بازار، نظام تقسیم، تجارت، روزگار، سرمایہ کاری، درآمدات و برآمدات اور کرنسیوں کی منتقلی (Currency-Exchange) کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ اب جیسے جیسے حج کے ایام قریب آتے جاتے ہیں، یہ تمام سرگرمیاں تیز ہوتی جاتی ہیں اور یوں معیشت مزید فعال بن جاتی ہے۔

اس طلب کی فورس کو بہ لحاظ عمر و جنس و علاقائی تفریق کے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل ایسی ڈیمانڈ فورس جس میں ناگزیر اشیا و خدمات شامل ہیں اور دوم وہ جس میں ترجیحی اشیا و خدمات آتی ہیں۔ اوّل الذکر ڈیمانڈ فورس میں آمدنی کی سطح کے فرق سے مقدار و معیار میں فرق ہوسکتا ہے لیکن ان اشیا و خدمات کی ضرورت سبھی کو ہوتی ہے جس کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ اشیائے خورد و نوش، ملبوسات، احرام، مقنع و چادر، احتیاطی ادویات و دیگر ساز و سامان کرنسی کی منتقلی اس کی چند مثالیں ہیں۔ آخر الذکر اشیا و خدمات ترجیحاتی زمرے میں آتی ہیں جو بہ اعتبارِ سطح آمدنی، سماجی و معاشرتی روایتوں اور علاقائی شناختوں کے ابھرتی ہیں جس میں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں آرام و آسائش کے ساز و سامان، علاقائی ترجیحاتی اشیا اور اعتقادی اشیا خصوصیت سے شامل ہیں۔ اس مجموعی ڈیمانڈ فورس نے پیداوار بڑھائی، انوسٹمنٹ کو فروغ دیا، روزگار کے مواقع وسیع کیے، بازار اور تجارتی سرگرمیوں کو تیز کیا اور بہ حیثیت مجموعی قلیل مدتی طور پر ہی سہی، مجموعی معاشی کاروبار کو مزید فعال بنا دیا۔

حج کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ مقامی سطح سے لے کر ملکی سطح تک ایک مجموعی ڈیمانڈ فورس ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہونے جارہی ہے جس ملک میں یہ ڈیمانڈ فورس پہنچتی ہے وہاں دنیا کے دیگر ممالک بھی اپنی اپنی ڈیمانڈ فورس لے کر پہنچتے ہیں غور کیجیے ایک مقام پر کتنی عظیم ڈیمانڈ فورس جمع ہوگئی جو بازاروں، تجارت، انوسٹمنٹ، روزگار، پیداوار و کاروبار کو کس بڑے پیمانے پر متاثر کررہی ہے۔ اس عالمی سطح کی ڈیمانڈ فورس کا مقابلہ عالمی سطح کی سپلائی فورس سے ہورہا ہے جہاں نمایاں خصوصیت یہ پائی جارہی ہے کہ ڈیمانڈ فورس میں خواہ کتنی ہی شدت کیوں نہ ہو سپلائی میں کوئی کوتاہی یا کمی نظر نہیں آتی، قیمتوں میں بیجا اتار چڑھاؤ نظر نہیں آتا، کوالٹی میں گراوٹ نظر نہیں آتی، تجارتی موقعہ پرستی نظر نہیں آتی، منافع خوری کی عرض سے مصنوعی و دانستہ کمیابی نظر نہیں آتی۔ تجارت و کاروبار کی آزاد فضا ہوتے ہوئے تمام پیداوار و تقسیم کی سرگرمیاں اقتصادی تطہیر کار سے وابستہ ہیں اس لیے ڈیمانڈ و سپلائی میں توازن قائم ہے اور یہی توازن عالمی معیشتوں کے لیے ایک ماڈل ہے۔

اس عالمی ڈیمانڈ فورس کو، ملکی ڈیمانڈ فورس کی مانند، دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک خانہ لازمی یا ناگزیر ڈیمانڈ فورس کا ہے جس کا تعلق، ملک و قوم کی تفریق کے بغیر، تمام حاجیوں سے ہے۔ رہائش کی سہولتیں، ٹرانسپورٹ، حفاظتی اقدامات، صحت و صفائی، پانی، بجلی، غسل خانہ، بیت الخلا، مختلف مقامات پر عارضی رہائش کیمپوں کا انتظام، حفاظتی اقدامات، ہنگامی صورتِ حال سے نپٹنے کے انتظامات، تعلقات عامہ و ترسیل بہت اہم ہیں۔ اس کی تکمیل سعودی حکومت کرتی ہے۔ ان میں کچھ ڈیمانڈ فورس حاجیوں کی استعداد و استطاعت کے بموجب مختلف معیاروں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ مثلاً رہائشی ڈیمانڈ فورس، اعلیٰ، درمیانی اور ادنیٰ ہوٹلوں، پرائیویٹ رہائش گاہوں، مختلف معیار کے اقامتی ہال وغیرہ میں تقسیم نظر آتی ہے۔ یہی صورتِ حال اسپتالوں اور نرسنگ ہومس کی بھی ہے۔

خیال کیجیے اس ناگزیر ڈیمانڈ فورس کی تکمیل کے لیے سعودی حکومت کے کتنے شعبے، کتنا سرمایہ، کتنی مشینی و انسانی طاقت، کتنے ماہرین، اور کس قدر اسپورٹس کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مسلسل تعمیراتی سرگرمیاں، سڑکوں، سرنگوں، پانی و گیس لائنوں کا پھیلاؤ، خانہ کعبہ و مسجد نبوی کی مسلسل توسیع، ہوٹلوں و دیگر اقامت گاہوں میں مسلسل اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس لازمی ڈیمانڈ فورس کی تکمیل کے لیے سعودی حکومت کو متواتر توسیعی انداز میں سرمایہ، بشری قوت، ماہرین، بیرونی ممالک کی امداد، انتظامیہ، ٹرانسپورٹ میں اضافہ کرتے رہنا پڑے گا۔

اس ناگزیر و لازمی ڈیمانڈ فورس کے ہمراہ ایک دوسری ڈیمانڈ فورس بھی ابھرتی ہے جو نجی دائرے میں آتی ہے۔ یہ فورس خالص مالی حیثیت اور ذاتی پسند و ترجیحات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست بازاروں سے ہے۔ بحیثیت مجموعی بہت بڑی فورس ہے جس سے ہر حاجی وابستہ نظر آتا ہے۔ ملک و قوم، علاقائی و ریاستی سطحوں میں تقسیم کے باوجود یہ ایک متحد فورس ہے۔ احرام، خواتین کا مقنع و چادریں، رومال، تسبیح و جانماز، آبِ زم زم، کھجور، خشک میوہ، اشیائے خورد و نوش، ملبوسات، آرائشی ساز و سامان، طغرے کی طلب تمام حاجیوں میں مساوی ہے۔ ملک و قوم، مالی حیثیت، معاشی و معاشرتی تفریق کے باوجود نجی پسند و ترجیحات کے بموجب ان اشیاء کی طلب بازاروں میں بڑھتی ہی نظر آتی ہے اور بازار بہ حسن و خوبی ان کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ نہ صرف پورا کرتے ہیں بلکہ طلب کے مقابلے اشیا و خدمات کے انبار نظر آتے ہیں۔

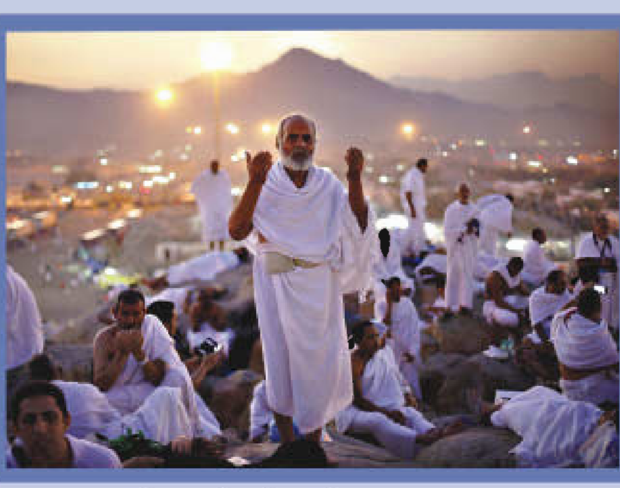

یہ طلب خواہ کتنی ہی وسیع اور متفرق کیوں نہ ہو، بازاروں میں دستیابی کے لحاظ سے کوئی کوتاہی نظر نہیں آتی۔ دستیابی و تقسیم کا موثر نظام قیمتوں میں استحکام قائم رکھتا ہے۔ نتیجتاً ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، دانستہ کمی، تجارتی موقعہ پرستی اور منافع خوری جیسے عام منفی رجحانات جو نظام معیشت میں بدعنوانیوں کو جنم دیتے ہیں اور انصاف پر مبنی معاشی نظام کو پنپنے نہیں دیتے، نہیں پائے جاتے۔ کاروبار، تجارت اور بازاروں کے تطہیر کار کا نتیجہ ہے جہاں حاجیوں سے بھرے بازار بے خوف و خطر صاف و شفاف خرید و فروخت میں مصروف نظر آتے ہیں۔

حج کے دوران کچھ قیمتی اشیا کی طلب میں شدید اچھال آجاتا ہے۔ ان قیمتی اشیا میں سونا، چاندی کے ظروف، زیورات، نگینے، منقش قیمتی طغرے، الکٹرانک ساز و سامان، موبائل، آئی پیڈ، لیپ ٹاپ، خصوصی کشش رکھتے ہیں۔ چین، جاپان، کوریا، ملیشیا، فرانس کے ساز و سامان سے بازار بھرے ملتے ہیں جہاں خریداری بالعموم ڈالرس اور سعودی کرنسی ریال میں ہوتی ہے۔ چونکہ تمام خرید و فروخت ان دو اہم کرنسیوں میں ہوتی ہے اس لیے کرنسی ایکسچینج

(Currency- Exchange) کا ایک بڑا نظام قائم ہے جہاں متعین شرح پر کرنسیوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے اور حاجیوں کا انبوہ کثیر بغیر کسی تردد و پریشانی کے، بغیر کسی دھوکے کا احساس کے، کرنسیوں کو تبدیل کرتا ہے۔ غور کیجیے لاکھوں حاجیوں کی اس خرید و فروخت کی سرگرمیاں ریال کے بدلے سعودی حکومت کو باہری ممالک کی کتنی کرنسیوں کو لا کر اکٹھا کر دیتی ہوں گی۔ سعودی حکومت کتنا زرِ مبادلہ جمع کرتی ہوگی اور وہ کس قدر اپنی معاشی ترقی اور معاشی استحکام کے رخ سے مضبوط ہوجاتی ہے۔ غور کیجیے۔

(III)

حج کی قولی و فعلی سرگرمیاں اقتصادیات کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں جہاں آزاد معیشتوں کے مروجہ چلن اور ان کے منفی اثرات سے بچتے ہوئے مساوات اور شفافیت کو ابھارنے، فروغ دینے اور ان پر عمل پیرا رہنے کا عزم ملتا ہے۔ یہ قولی و فعلی اعتبار سے 'تطہیرِ نفس' کے مظاہرے ہیں جو حاجیوں سے لے کر بازاروں، کارخانوں کاروبار، انتظامیہ بھی شعبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور مادیت میں پاکیزگی قائم رکھتے ہیں۔

حاجیوں کے رخ سے دیکھیے تو حج معمولات زندگی بدلنے، بے جا خواہشات و لذات ترک کرنے، ناگواریوں اور خلافِ طبع حالات برداشت کرنے، ان کو صبر و شکر، کے ساتھ قبول کرنے کی تعلیم و تربیت دیتا نظر آتا ہے۔ وہ مروّجہ مادّی تنظیم زندگی میں بدلاؤ و ریفارم کی مشق کرا رہا ہے۔ اس طرح حج نفسانی ریاضت بھی ہے اور جسمانی و روحانی عبادت بھی ہے۔

حج وہ قولی و فعلی عبادت ہے جس کا تعلق فرد سے نہیں افراد سے ہے، اجماع سے ہے۔ یہ اجماع باوجود تمام تر اقتصادی، سماجی، معاشرتی تفریقات کے ایک مرکز پر جمع کیا گیا ہے۔ سب کے جسم پر صرف دو سفید چادریں ہیں جن کو احرام کہا گیا۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے لاکھوں انسان اسی سادہ سے لباس میں موجود ہیں۔ معاشرے کی تمام اقتصادی و معاشرتی تفریقات کو یکلخت مٹا دیا گیا۔ نہ زبان کی تفریق باقی ہے اور نہ اقتصادی و معاشرتی تفریقات کو یکلخت مٹا دیا گیا۔ نہ

زبان کی تفریق باقی ہے اور نہ اقتصادی و معاشرتی تفریقات کی کوئی اہمیت ہے۔ آپ تو اس انبوہ کثیر میں یہ بھی نہیں پہچان سکتے کہ کون کتنا امیر و صاحب اختیار ہے اور کون کتنا غریب و لاچار۔ یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ مروجہ مادّی و معاشرتی عوامل تفریق و تضاد کا باعث ہیں۔ ان سے ہٹ کر ایک متحد عظیم بشری قوت جو کامل مساوات کا آئینہ ہو، اس کی مشق کر کے دنیا کے سامنے نمونہ پیش کرو۔

دورانِ حج آپ کو لذاتِ زندگی سے بھی پرہیز کرنے کی تاکید ہے۔ مختلف اقسام کی پرتکلف غذاؤں کے بجائے صرف سادہ غذاؤں کا ہی استعمال کرو۔ پر لذت مشروبات، و اجتماعی دعوتوں سے پرہیز کرو۔ مختلف مقامات پر قیام کے دوران بھی کوئی اہتمام نہیں، کوئی دنیاوی بحث و مباحثہ نہیں، آپسی میل ملاپ، تفریح ہنسی مذاق، رشتوں و خاندانی چقمقوں کا ذکر نہیں جو آج کے معاشرے کا جزوِ لازم ہے۔

ان پابندیوں کے ہمراہ کچھ اور پابندیاں جن کو ہم ڈسپلن کہہ سکتے ہیں عائد کی گئیں۔ آپ حج کے دوران ناخن کاٹنے، شیو بنانے، کسی مخلوق یہاں تک جوں کو بھی گزند پہنچانے، جسم سے خون نکالنے، آرائش و زیبائش، خوشبو استعمال کرنے سے پرہیز کریں گے۔ ان سارے کاموں میں تفریق پیدا ہوسکتی ہے، تہذیبی وقار پامال ہوسکتا ہے اور یگانگت مجروح ہوسکتی ہے۔

ابتدا سے انتہا ارکانِ حج کی ادائیگی کے ہمراہ نظامِ زندگی کو مختلف مادی، نفسانی و معاشرتی ضوابط میں باندھنے کی سعی ریفارم کی ایسی تربیتیں ہیں جن کی تقلید دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی نظر آجاتی ہیں۔ جس وقت آپ نے سادہ لباس بطور احرام زیب تن کیا، سادہ کھانا کھا کر مطمئن ہوئے، اپنے آپ کو آرائش و زیبائش سے دور رکھا، خدا کی مخلوق یہاں تک کہ جوں کو بھی نہ مارا، نہ کوئی گزند پہنچائی، مروّجہ سوشلائزیشن و مجلسی صحبتوں سے احتراز کیا جو اتحاد کے بجائے نفاق و انتشار کا سبب بنتی ہیں، طواف و سعی کے ذریعے فکری مرکزیت و جہد پیہم کا مظاہرہ کیا، سر کے بال اُتروائے اور قربانی پیش کی اور تین شیطانوں کو تمام برائیوں کی علامت مانتے ہوئے کنکریاں مار کر اپنے کو برائیوں سے دور رکھنے کا عزم کیا تو آپ کے یہ تمام مظاہرے مادّی بھی ہیں، نفسانی بھی ہیں اور روحانی بھی ہیں جن کو مجموعی طور پر تطہیرِ نفس کہا گیا ہے۔ ان کی پیروی انسان کو ایک صالح باعمل انسان بناتی ہے۔ ان پر عمل پیرائی غیر معتدل اور غیر معقول مادّی رغبتوں سے محفوظ رکھتے ہوئے شفاف و منصفانہ طرزِ زندگی کی طرف ذہن انسانی کو موڑتی ہیں، عدم توازنی کیفیات سے معاشرے کو بچاتی ہیں، نفاق کی جگہ اتحاد پیدا کرتی ہیں۔

حاجی کا انبوہ کثیر اقتصادی دائرے میں صارفین کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ ان کی طلب کا ایک وسیع دائرہ ہے جس کو پورا کرنے کے لیے ایک وسیع نظام پیداوار و تقسیم ہے، کاروبار، تجارت و بازار کی سرگرمیاں ہیں جو بڑے پیمانے پر انوسٹمنٹ کرتی ہیں۔ منظم پیداوار و تقسیم صارفین کو کسی سطح پر مایوس اور ناانصافیوں سے دوچار نہیں ہونے دیتیں۔ حج کے دوران اقتصادی میدان کا ہر شعبہ چاہے حاجیوں کی صورت صارفین ہوں، کاروباری ہوں، پیدا کرنے والا طبقہ ہو، صنعت کار ہوں، انتظامیہ ہو، حکومت ہو سبھی اگر غور کیجیے تو قولی و عملی اعتبار سے 'تطہیرِ نفس' سے جڑے نظر آتے ہیں۔ یہی تطہیرِ نفس معاشیات کے میدان میں اکنامک ریفارم میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ حج عالمی سطح پر فکری و عملی اقتصادی ماڈل پیش کر رہا ہے اور یقیناً جب بشری قوتوں کو سرمایہ بنانے پر زور دیا جائے گا تو حج ہی خضرِ راہ بنے گا۔

■

S.A.R Bilgrami, 101-S Sector - 8, Jasola Vihar, New Delhi - 110025

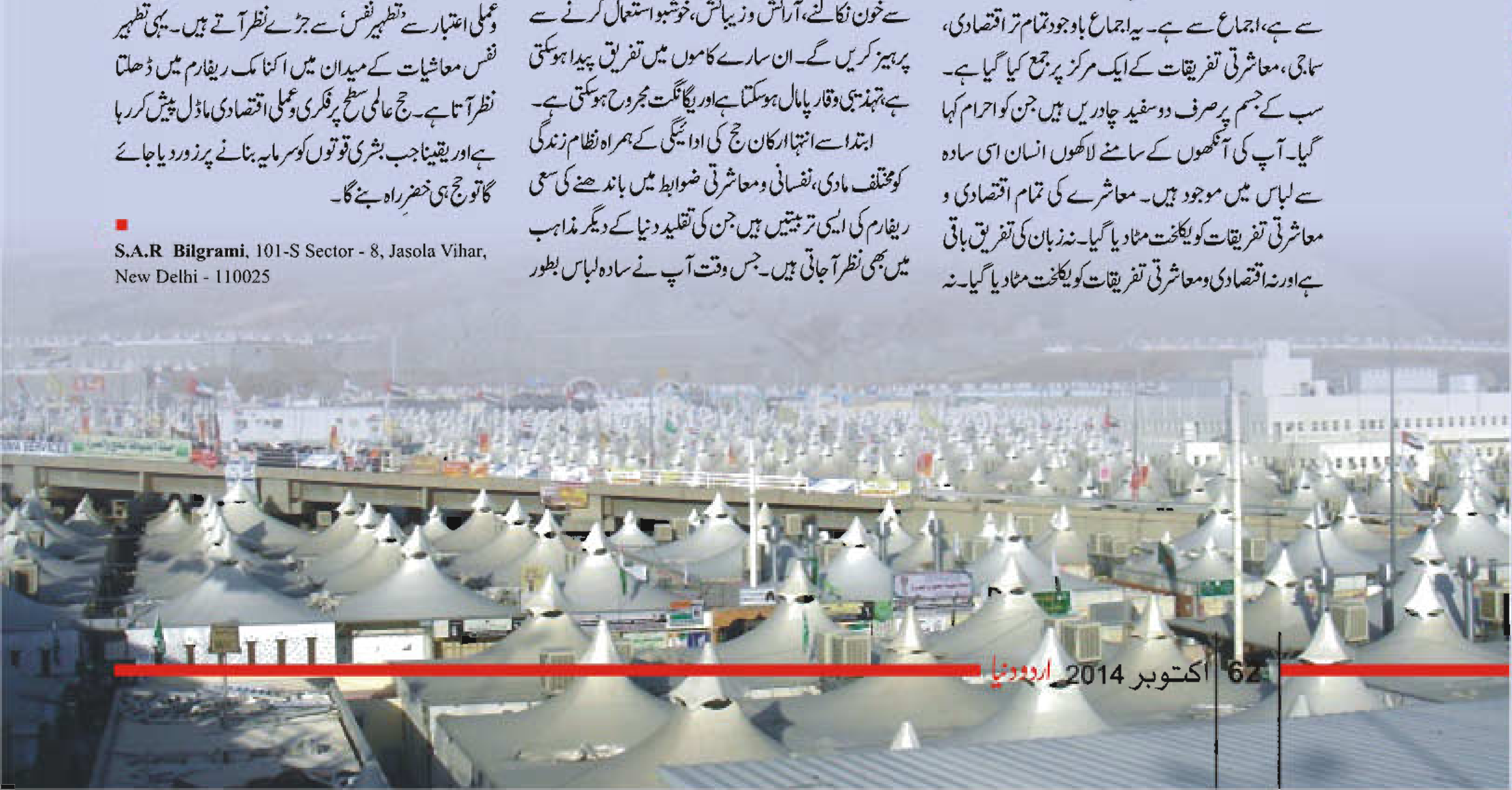

فاروق ارگلی

ترجمانِ محبت: شعری بھوپالی

شعری بھوپالی کا شمار بیسویں صدی کے ان مقبول ترین شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے کلاسیکی غزل کو ایک نئے آہنگ سے ہمکنار کیا۔ انھوں نے اس دور میں اُردو غزل کی رعنائیوں اور سحر آفرینیوں سے لاکھوں دلوں کو مسخر کیا جب اُردو شاعری مختلف جدید رجحانات، تحریکات اور تغیرات سے گزر رہی تھی۔ شعری بھوپالی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے نئے لب و لہجے اور نئی لفظیات کے ساتھ اساتذۂ قدیم کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے حکایاتِ عشق و محبت اور حدیثِ دلبراں کے افسانے سنائے، وہیں مشاہداتِ حسن و جمال، وہی رودادِ ہجر و وصال، مگر غزل کی سادگی و مرصع کاری کا یہ کمال کہ شاعر کی آواز شعر بن کر دلوں میں اُتر گئی۔ بلاشبہ شعری بھوپالی، اصغر، فانی، جگر، سیماب اور جوش و فراق کے معاصرین میں اپنی شناخت بنانے والے سخنوروں میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

بیسویں صدی میں اُردو غزل کی تاریخ میں شعری بھوپالی کے شعری مقام و مرتبہ کی تعینِ قدر جس طرح بھی کی گئی ہو، یا کی جانی باقی ہو، اس سے قطع نظر ایک صاحبِ اسلوب غزل گو کی حیثیت سے شعری بھوپالی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم اسے تیز رفتار زندگی کی مجبوری کہیں یا اہلِ نقد و نظر کی ستم ظریفی کہ بھول جانے اور بھلا دینے کی روایت اجتماعی عادت بنتی جا رہی ہے۔ کسی بھی فن پارے پر نگاہِ دانشوری کا حکم لگانا جائز لیکن جن فنکاروں نے خونِ جگر سے کشتِ فن کی آبیاری میں زندگیاں صرف کر دیں، ان کی خدمات کا ذکر اگر ہوتا رہے تو یہ ہماری ادبی اور تہذیبی صحت کے لیے مفید عمل تو ہے ہی۔

محمد اصغر خاں شعری بھوپالی 1902 میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا محمد اکبر خاں اس وقت کے مقتدر علمائے دین میں شمار ہوتے تھے، جس وقت محمد اصغر شیر خوار تھے تبھی انھوں نے بھوپال میں سکونت اختیار کر لی۔ محمد اصغر نے بھوپال میں ہی ہوش سنبھالا۔ ان کی پرورش دینی ماحول میں ہوئی۔ بھوپال کے دینی مدارس مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ وحیدیہ سے عربی فارسی سے آراستہ ہوئے۔ بچپن سے ہی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ نامور مزاح نگار ملا رموزی کی نظر پڑی تو شاگرد بنا لیا۔ ملا رموزی نے ہی انھیں شعری تخلص عطا کیا تھا۔ اساتذۂ ادب کی کتابوں کے مطالعے نے ذہن بیدار کیا۔ بھوپال کی فضائیں شعر و سخن سے معمور تھیں۔ شعری اس عمر میں بھی اچھے خاصے شعر کہنے لگے۔ والد انھیں طبیب بنانا چاہتے تھے اس لیے 1936 میں انھیں دہلی بھیج دیا گیا۔ تعلیم کے لیے شملہ ڈیوڑھی سے معقول وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ دہلی کے علمی ادبی ماحول میں ان کے شوق کو جلا ملی۔ حاذق کا کورس چار سال کا تھا، دل لگا کر طبّی تعلیم و تربیت حاصل کرتے، زیادہ تر فاضل وقت مشغلۂ سخن آرائی میں صرف ہوتا۔ دہلی میں خواجہ محمد شفیع دہلوی کی بزم آرائیاں شباب پر تھیں، اس وقت ان کی اُردو مجلس کی ادبی نشستوں کی خوب شہرت تھی، شہر کے کاملین علم و ادب اور شاعروں ادیبوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی۔ معروف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پڑھی جاتیں، مباحث اور تبادلۂ خیال ہوتا اس سے نو آموزوں کی تربیت ہوتی۔ دہلی کی ان ادبی مجلسوں سے شعری نے خوب استفادہ کیا، شعری صاحب نے لکھا ہے:

''اس وقت دہلی میں اُردو مجلس کی ادبی نشستیں زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ خواجہ شفیع صاحب دہلوی کا دولت کدہ ہر اتوار کو گلستانِ شعر و ادب بنا رہا کرتا تھا۔ دہلی میں رہنے یا قیام کرنے والا شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا اہلِ ذوق ہو جس نے اُردو مجلس میں شریک ہو کر لطفِ سخن نہ پایا ہو اور دادِ سخن نہ حاصل کی ہو۔ حکیم فضل الرحمن فریدی کے ساتھ میں بھی اُردو مجلس میں شریک ہوا اور اپنی معروضات پیش کیں۔ اہلِ دہلی نے جو اعلیٰ اخلاقی قدروں کے امین کہے جاتے ہیں، میری انتہائی حوصلہ افزائی فرمائی۔ مجھے جو کچھ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ سب دہلی کے دورانِ قیام کا نتیجہ ہے۔'' (صبحِ وطن)

دہلی میں طب کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ اس وقت تک شعری ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے بھی شہر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان کی زبان میں سلامت اور اشعار میں ندرت تھی، دہلی میں ہی خواجہ محمد شفیع دہلوی اور دیگر مقتدر اصحاب نے شاعری کے میدان میں ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اسی دوران جب حکیم حاذق کے کورس کا ایک سال باقی رہا تھا، ان کے والد مولانا محمد اکبر خاں بیمار ہو گئے۔ یہ خبر پا کر شعری فوراً بھوپال روانہ ہو گئے۔ مولانا صاحب کی طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی گئی، بالآخر اسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا شعری کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ گھر کی ذمے داری ان کے کندھوں پر آ گئی، وہ دہلی واپس نہ جا سکے اور طبیب بننے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ گزر بسر کے لیے روزی کا وسیلہ تلاش کرنا پڑا۔ کانجی ہاؤس کے منصرم کی ملازمت ملی جہاں آوارہ جانور قید کیے جاتے تھے اور ان کے مالکوں پر جرمانہ کر کے بے زبان قیدیوں کو رہا کیا جاتا تھا، وہ وقت معینہ تک اذیت میں گرفتار رہنے کے بعد نیلام کیے جاتے۔ کانجی ہاؤس کی ملازمت شعری کے شاعرانہ مزاج کے خلاف تھی، استعفیٰ دے دیا اور ایک یونانی شفاخانہ میں نوکری کر لی۔ انھوں نے تین سال طب کی تعلیم حاصل کی تھی، تجربہ کام آیا اور پیشۂ طبابت اطمینان و سکون کی زندگی گزارنے کا ذریعہ بن گیا۔ شفاخانے کی

مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی جوان ہوتی گئی۔ پہلے مائل سندیلوی سے مشورۂ سخن کیا بعد میں اس وقت بھوپال کے استاد شاعر حضرت ذکی وارثی سے باقاعدہ تلمذ اختیار کیا اور ان سے علم کلام، عروض و بلاغت اور فن شعر کے رموز و نکات سے کماحقہٗ آگہی حاصل کی۔

1940 کا سال شعری بھوپالی کی زندگی میں انقلاب لے کر آیا جب بھوپال کے عظیم الشان کل ہند مشاعرے میں مقامی شاعر کی حیثیت سے مدعو کیے گئے۔ اس تاریخی مشاعرے میں احسن مارہروی، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، احسان دانش، شوکت تھانوی اور سراج لکھنوی جیسے اکابر شعرا شریک تھے۔ نوجوان شاعر شعری بھوپالی نے آغاز میں ہی مشاعرہ لوٹ لیا۔ انھوں نے روح پرور ترنم سے غزل پڑھی تو داد و تحسین کا وہ طوفان برپا ہوا کہ جگر صاحب سمیت سبھی نامور شعرا حیران رہ گئے۔ شعری کی غزل اگلے دن بھوپال کے گلی کوچوں میں ہر کسی کی زبان پر تھی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ شعری جہاں جاتے اسی غزل کی فرمائش ہوتی، اسی دوران بمبئی کے ایک مشاعرے میں مشہور فلمساز ہدایت کار شوکت حسین رضوی نے سنی اور اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے اپنی زیر تکمیل فلم 'جگنو' میں شامل کرلی۔ یہ مشہورِ زمانہ غزل ہے:

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
جہاں وہ ہیں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی
اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنّا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی
مناسب ہو تو او ظالم گھڑی بھر کے لیے آجا
بجھانی ہے ترے دامن سے شمع زندگی اپنی
وہیں چلیے وہیں چلیے تقاضا ہے محبت کا
وہ محفل ہائے جس محفل میں دُنیا لٹ گئی اپنی

شعری بھوپالی کے یہ خوبصورت اشعار ملکۂ ترنم نور جہاں کی آواز میں ساری دُنیا میں آج 70 برس بعد بھی گونج رہے ہیں۔ یہ غزل شعری بھوپالی کی پہچان بن گئی جس میں انھوں نے اپنی شاعری کے اوّلین دور میں ہی تغزل کی ایسی شان پیدا کی جو سادگی اور دل پذیری کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ غزل کے دیگر اشعار دیکھیے:

تری محفل سے اب جائیں بھی تو اُٹھ کر کہاں جائیں
کہ دُنیا بھی یہی اپنی ہے عقبیٰ بھی یہی اپنی
مقدر سے کہیں ملتا ہے موقع جان دینے کا
لٹا دے دولتِ غم پر متاعِ زندگی اپنی
یہیں ٹکرا کے رہ جاتی ہیں نظریں اہلِ عالم کی
ترے جلوؤں کا پردہ بن گئی دیوانگی اپنی
نہ ہے یہ اضطراب اپنا نہ ہے یہ بے خودی اپنی
تری محفل میں شاید بھول آیا زندگی اپنی
بصد شوق و مسرت اُٹھ کے جلوؤں نے بلائیں لیں
یہ کس منظر پہ جا پہنچی نظر بہکی ہوئی اپنی
نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہے نہ رنگینی ہے اے شعری
خود اپنے شعبدوں سے کھیلتی ہے بے خودی اپنی

بھوپال کے اُسی یادگار مشاعرے سے شعری جگر صاحب کی نگاہ میں آ گئے۔ اگرچہ شعری بھوپالی نے اس دَور کے کئی شعرا سے اکتسابِ فیض کیا لیکن جگر صاحب کی تربیت نے ان کے کلام کو نکھار دیا۔ جگر صاحب کی قربت اور ان کی تربیت کے بارے میں خود شعری بھوپالی کا بیان ہے:

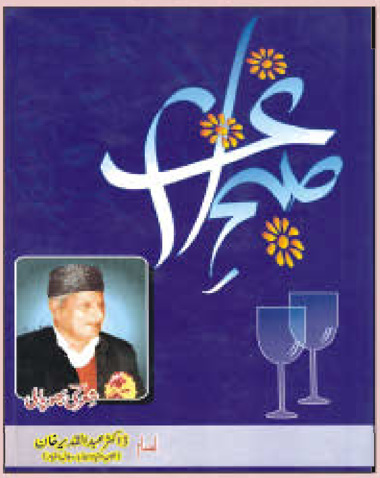

"ادبی رہبری کے لیے کسی شاعر کی ذہنی اصلاح بے حد ضروری ہے، اس ذیل میں قبلہ رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کا مرہونِ کرم ہوں جن کی خدمت میں رہنے سے میری فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور جن کی توجہات نے میری ادبی دُنیا کو بنایا سنوارا۔"

شعری بھوپالی کو بڑے مشاعروں میں غزل کا جادو جگاتے ہوئے سننے دیکھنے والے آج بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اپنے روایتی اثر آگیں ترنم سے جب وہ عام فہم، آسان اور دلآویز اشعار سناتے تو سامعین پر وجد طاری ہوجاتا تھا۔ ان کے چند اشعار سے اُردو روایتی غزل کی دلکشی اور شعری کی معجز بیانی کا اندازہ بہ آسانی ہوسکتا ہے:

نظر کب ان کی نظر سے ملائی جاتی ہے
یہ چوٹ وہ ہے کہ جو دل پہ کھائی جاتی ہے

وہ یہ کہتے ہیں ہم تمھارے ہیں
ساری دُنیا بس اب ہماری ہے

جو میرا عشق اُلٹ دے نقاب اے شعری
تمام عالم امکاں میں روشنی ہوجائے

زہے ذوقِ حسنِ تصور کہ ان سے
ارادہ کیا اور ملاقات کرلی

چوٹ کھایا ہوا زمانے کا
میں قفس کا نہ آشیانے کا

محبت اور پھر ان سے محبت
میں اس جینے پہ مرتا جارہا ہوں

تو ہے دیوانۂ جذباتِ محبت شعری
تیرے اشعار قیامت کا اثر رکھتے ہیں

محبت ایک عالم ہے دو عالم سے الگ شعری
یہاں دُنیا شریکِ رنج و راحت ہو نہیں سکتی

محبت کو مسلسل جوشِ طوفاں کی ضرورت ہے
کنارے پر یہ دُنیا پرورش پایا نہیں کرتی

زمانہ کس طرح واقف ہو برقِ عشق سے شعری
یہ بجلی دل پہ گرتی ہے نظر آیا نہیں کرتی

شعری بھوپالی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ صرف مشاعروں کے ہی سپرہٹ شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی ہمیشہ زندہ اور ترو تازہ رہنے والی غزلیہ شاعری میں فلسفہ عشق کو صالح اور پاکیزہ فکری معیار بخشنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے ایسی غزلیں بھی کہی ہیں جن کے ایک ایک شعر میں رمز و معنی کا ایک جہان آباد ہے۔ انتہائی سادگی اور معصومانہ اسلوب میں وہ بڑی سے بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ اس رنگ کے کچھ اشعار شعری صاحب کی شاعرانہ فکر کی غمازی کرتے ہیں:

بجائے خود حقیقت ہوں، بطور خود تجسّس ہوں
بہت پیچھے ہیں مجھ سے حق و باطل دیکھنے والے

تصدق عظمتِ کونین اس مجذوب الفت پر
جو ان کا غم چھپائے اور خود بدنام ہوجائے

خودی ہے بے خودی ہے عشق ہے غم ہے جوانی ہے
ہزاروں مرحلے ہیں اور تنہا زندگانی ہے

پسند کی نہ خودی اور بے خودی میں نے
بدل کے رکھ دیا میزانِ زندگی میں نے

شعاعِ زندگی پاکیزہ فطرت ہو نہیں سکتی
بغیرِ غم مکمل آدمیّت ہو نہیں سکتی

ہم ایک دوسرے کی آواز سن رہے ہیں
اور عشق درمیاں کی دیوار ہوگیا ہے

یا ابتدائے عشق میں غم میرے ساتھ تھا
یا غم کے ساتھ ساتھ چلا جارہا ہوں میں

دُنیائے حقیقت کو بھی پھر دیکھیں گے شعری
آزاد تو ہوجائیں ذرا قیدِ نظر سے

اور شعری صاحب کا یہ شعر تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے:

برابر خفا ہوں برابر منائیں
نہ وہ باز آئیں نہ ہم باز آئیں

شعری بھوپالی 1940 کے بعد پچیس برسوں تک مشاعروں کے ذریعے شہرت اور کامیابی کی بلندیوں تک پہنچے، ان کا کلام اخبارات وجرائد میں بھی چھپتا اور پسند کیا جاتا رہا۔ 1965 میں جب وہ بزرگوں کی صف میں آگئے اس وقت دوستوں اور قدر دانوں کے اصرار پر پہلی بار اپنا اوّلین مجموعہ کلام 'صبحِ غزل' شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنے شعری رویے کا اظہار بھی پہلی بار کیا:

''چونکہ میں مزاجاً طوالت پسند نہیں ہوں، اس لیے اپنے اظہارِ خیال وجذبات کے لیے اصنافِ ادب میں غزل کو بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ پچھلے پندرہ بیس برس سے ہمارے تمام اُردو کے شعرا نئے نئے تجربات کررہے ہیں، اور اسی مدت میں بعض حضرات نے بالاتفاق غزل کی مخالفت بھی کی لیکن غزل کی مقبولیت اور خسرویت کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور انھیں غزل کی تابندگی اور پائندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس سے میرا مقصد کسی بھی صفِ اوّل کی مخالفت نہیں بشرطیکہ وہ صالح اور صحت مند ہو۔ اُردو میں توارد کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک ایسا توارد قابلِ رشک ہے جو مطالعہ یا سامعہ کا نتیجہ نہ ہو، اور یہ ممکن بھی ہے کیونکہ ہماری سیاسی اور سماجی قدریں اور حالات ومشاہدات میں بڑی حد تک یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ لیکن کسی شاعر کا سنا ہوا یا کسی کتاب کا پڑھا ہوا شعر تھوڑی سی ترمیم و تبدیلی کے ساتھ اپنانے کو میں اچھا نہیں سمجھتا خواہ یہ فعل کسی مشہور شاعر کا ہی کیوں نہ ہو۔ موجودہ ادبی ماحول میں اچھا پڑھنے والے زیادہ پیدا ہورہے ہیں اور اچھا کہنے والے کم۔''

شعری بھوپالی اپنی نجی زندگی میں نہایت مرنجاں مرنج، سراپا خلوص ومحبت انسان تھے۔ بھوپال شہر میں اعلیٰ، ادنی، ہندو مسلمان سب ان کا احترام کرتے تھے۔ اکثر ادبی حلقوں میں تو یہ بحث موضوعِ گفتگو رہتی تھی کہ شعری بھوپالی اچھے شاعر ہیں یا اچھے انسان، اس پر سب اتفاق کرتے تھے کہ وہ دونوں طرح اچھے اور بہت اچھے آدمی ہیں۔ زندہ دلانِ

غزل شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہوجائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہوجائے

ہر اک جذبہ، ہر اک سعیِ طلب ناکام ہوجائے
محبت ہی محبت کا اگر انجام ہوجائے

یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہوجائے

محبت کی قسم اُن کے بھی دل میں یہ تمنا ہے
دوبارہ ہم سے اُن سے نامہ و پیغام ہوجائے

تصدق عظمتِ کونین اُس مجذوبِ الفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہوجائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہوجائے

وہی نالہ، وہی نغمہ بس اک تفریق لفظی ہے
قفس کو منتشر کردو نشیمن نام ہوجائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہوجائے

بھوپال میں یہ تذکرہ آج بھی عام ہے کہ ادب وتہذیب کے گہوارے بھوپال نے یوں تو بڑی بڑی ہستیاں پیدا کی ہیں لیکن چار 'ش' نے اس شہر کو سب سے زیادہ شہرت بخشی ہے۔ یہ چار 'ش' ہیں آنجہانی صدرِ جمہوریہ شنکر دیال شرما، شیرِ بھوپال کہے جانے والے شاکر علی خاں، شعری بھوپالی اور مشہور عالم قوالہ وشاعرہ شکیلہ بانو بھوپالی۔

1984 میں شعری صاحب کا دوسرا اور آخری مجموعۂ کلام 'آتشِ دل' شائع ہوا جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی، انھیں اپنی زندگی میں خاطر خواہ شہرت اور قدر ومنزلت حاصل ہوئی۔ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی نے قائم ہوتے ہی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور سب سے پہلا ایوارڈ انھیں پیش کیا۔ ملک کی کئی انجمنوں اور ادبی تنظیموں نے بھی اعزاز وانعام سے نوازا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں اب تک وہ مقام اُردو دُنیا نہیں دے سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

9 جولائی 1991 کو شعری صاحب نے بھوپال میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس موقع پر عہدِ حاضر کے نامور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بالکل درست کہا کہ ''شعری بھوپالی ہماری عظیم غزل کے ان تاجداروں میں سے تھے جہاں قدیم غزل کا نقطۂ عروج ملتا ہے۔''

پاکستان کی بین الاقوامی متنازعہ شخصیت، ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھوپال میں پیدا ہوئے، انھوں نے شعری بھوپالی کو اپنے بچپن میں بہت قریب سے دیکھا تھا، شعری صاحب انھیں پیار سے 'بیٹا' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ عبدالقدیر خان نے بھوپال کے اس ماحول میں پرورش پائی جہاں شعروادب کا چرچا تھا۔ آج بھی دنیا کے اس بڑے سائنسدان کا ذوقِ شعروشاعری زندہ ہے۔ انھوں نے 2004 میں شعری بھوپالی کا پہلا شعری مجموعہ 'صبحِ وطن' بیحد اہتمام کے ساتھ اسلام آباد سے شائع کیا تھا۔ شعری صاحب کو یاد کرتے ہوئے عبدالقدیر نے 'پیش لفظ' میں لکھا ہے:

''میرے والد مرحوم عبدالغفور خان سی پی ہندوستان میں کئی شہروں میں ہیڈ ماسٹر تھے اور پنشن حاصل کرنے کے بعد انھوں نے بھوپال میں ہی محلہ گنوری میں رہائش اختیار کرلی۔ والد مرحوم ناگپور، امراوتی، جبل پور، بھساول، اکولا اور کامٹی وغیرہ میں رہے تھے، میرے کچھ بھائی بہن بھوپال سے باہر پیدا ہوئے، میں خوش قسمت ہوں کہ میں بھوپال میں پیدا ہوا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور گنوری پرائمری اسکول میں پڑھنے لگا تو میں نے شعری صاحب سے شناسائی حاصل کی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی منشی رحمت اللہ خان پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ نہایت محبت کرنے والے شخص تھے، والدہ مرحومہ سے پوچھتے، کوئی کام ہو تو بتادیں، ایک کپ چائے پیتے اور چلے جاتے، شعری بھوپالی منشی رحمت اللہ خان کی بیگم کے عزیز تھے اور دو چار دن میں وہاں چکر لگالیا کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی عبدالحفیظ خان میونسپل کارپوریشن میں انسپکٹر تھے، ان کو بھی شاعری کا بہت شوق تھا، اشکی تخلص تھا، ان کی شعری صاحب سے بہت دوستی تھی، اکثر وبیشتر وہ شعری صاحب کو ہماری بیٹھک میں بلاکر چائے کا دور چلاتے اور شاعری پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ میں بھی اکثر بیٹھ جایا کرتا اور ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ شعری صاحب درمیانہ قد اور گندمی رنگ کے مالک تھے۔ ہمیشہ کالی شیروانی اور چست چوڑی دار پاجامہ پہنے رہتے تھے، قراقلی ٹوپی پہنتے تھے، بڑے خوش مزاج اور ملنسار آدمی تھے۔ ہم سے بڑی شفقت سے پیش آتے، مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے، ان کا مسکراتا چہرہ آج بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔''

کچھ عرصہ ہوا کہیں پڑھا تھا کہ ان کا غیر مطبوعہ کلام دو مجموعوں 'فریادِ وطن' اور 'شعری کا پیغام' کی صورت میں کسی نے مرتب کیا ہے۔ راقم الحروف ناقص معلومات کا قصوروار ہوسکتا ہے کہ یہ علم نہیں ہوسکا کہ یہ مجموعے شائع ہوئے یا نہیں۔ بلاشبہ شعری بھوپالی ایک نہایت اہم غزل گو تھے، ان کے فن اور شخصیت پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

■

Farooque Argali, 25Ganesh Park, Rasheed Market, Delhi-110051

صحت

محمد رفیق

ایبولا کا قہر

عالمی صحت تنظیم نے اعلان کیا ہے کہ ای بولا وائرس کے تیزی سے پھیلنے اور مرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے تمام ممالک میں 'بین الاقوامی صحتی ایمرجنسی' نافذ کی جائے۔

یہ وہ اعلان ہے جس نے ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ اس سے قبل اس وائرس نے اتنی تباہی نہیں مچائی تھی۔ اس کے پھیلاؤ اور خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تمام ممالک چوکنے ہوگئے اور بیرون ممالک بالخصوص افریقہ سے آنے والے مسافروں کی مکمل جانچ کے بعد ہی ملک میں داخل ہونے کی اجازت دی جارہی ہے۔

یہ وائرس مختلف دور میں سرخیوں میں رہا ہے۔ 1976 میں جب یہ وبائی صورت اختیار کرگیا تو سوڈان میں 284 موتیں ہوئیں۔ اس کے بعد 1995 سے 2013 کے درمیان یہ پھر سرگرم ہوا اور مغربی افریقہ کے کئی ممالک کو اپنے دام میں گرفتار کرلیا۔ صرف کانگو میں مختلف ادوار میں 1069 مریضوں کی تشخیص کی گئی تو یہ ای بولا وائرس سے متاثر پائے گئے۔ ان میں سے 656 مریضوں کی موت ہوگئی۔ فی الوقت جنیوا میں 543 مریضوں کی شناخت ہوئی جن سے 394 مریض فوت ہوگئے۔ لائبیریا میں 824 مریضوں میں سے 466، نائجیریا میں 15 سے 4، سیئرالیون میں 848 معاملات میں سے 365 کی موت ہوچکی ہے۔ اس طرح ان چار ممالک میں کل مریضوں کی تعداد 2240 اور مرنے والوں کی کل تعداد 1229 ہوچکی ہے۔ جنوب مشرقی جینوا کا پسماندہ علاقہ نیری کور سے یہ مرض جینوا کے صدر مقام کناکرے میں آکر سرگرم ہوا۔ اس ملک سے منسلک لائبیریا، سیئرالیون میں تیزی سے پھیلنے لگا۔

امسال ایک بار پھر یہ سرگرم عمل ہوا ہے۔ یہ وائرس اب افریقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے حتیٰ کہ ہمارے ملک میں ہر بیرون ممالک سے آنے والے مسافروں کی سختی سے جانچ کی جارہی ہے۔ حالیہ اگست 2014 کی رپورٹ کے مطابق افریقہ میں 2127 مریضوں کی موت ہوچکی ہے۔ اس وائرس سے چرندو پرند بھی محفوظ نہیں ہیں۔ گوریلا، چمپانزی (لنگور) بھی متاثر ہیں۔ اب تک مغربی افریقہ میں 500 گوریلے اور 420 لنگوروں کی موت ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ گھریلو جانور بھی خاصی تعداد میں متاثر ہیں۔

سب سے پہلے اس وائرس کی شناخت شمالی جمہوریہ کانگو کے ضلع مونگ گالا کے چھوٹے سے گاؤں یام بوکو میں 26 اگست 1976 میں کی گئی۔ اس کا سب سے پہلا متاثرہ شخص مابولولوکیلا نامی ایک اسکول ہیڈ ماسٹر تھا جو مرکزی افریقہ میں ای بولا ندی کی سیر کے لیے گیا تھا۔ چونکہ یہ وائرس ای بولا ندی کے آس پاس سے پھیلا ہوا ہے لہٰذا اس کا نام بھی اسی ندی کے نام پر رکھ دیا گیا۔

ای بولا وائرس کی ساخت خطی، غیر قطع دار، اکہری دھاگا نما، غیر جانب دار سرے پر مشتمل ہے۔ عموماً وائرس میں پروٹین کی تہہ پائی جاتی ہے لیکن یہ پروٹین کی تہہ سے مستثنیٰ ہے۔ ای بولا وائرس تقریباً 19 کلو بیس لمبے جوڑی میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر 7 جین ہوتے ہیں۔ اس کی ساخت دھاگا نما ہونے کی وجہ سے یہ "U" یا "6" شکل میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پیچیدہ، خمیدہ یا شاخدار بھی ہوتے ہیں۔ اس کی لمبائی تقریباً ایک ہزار نانو میٹر ہوتی ہے۔ اس کا دور حیات میزبان کے خلوی دیوار سے چپکتے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا دور حیات طویل اور پیچیدہ ہے۔ ای بولا وائرس کی پانچ قسمیں ہیں۔

اس کی ابتدائی چار قسمیں انتہائی خطرناک ہیں، جس سے انسان متاثر ہوکر مرجاتا ہے۔ اس کی پانچویں قسم صرف جانوروں میں ہوتی ہے۔ وہ اتنی مہلک نہیں ہے۔

ابھی تک یہ واضح نہیں ہوسکا کہ اس مرض کے پھیلنے کی خاص وجہ کیا ہے۔ لیکن تحقیق سے واضح ہوا ہے کہ ای بولا وائرس سے متاثر جانوروں کا انسان کے ساتھ ربط اور تسلسل ہے۔ حالانکہ یہ ربط سیلان سیال کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ انسان سے انسان کا متاثر ہونے کی وجہ خون کا تبادلہ ہے۔ اگر متاثرہ مریض کا خون کسی ضرورت کے تحت صحت مند انسان کو لگایا جاتا ہے تو اس کا وائرس خون کے ذریعے دوسرے انسان میں منتقل ہوجاتا ہے حتیٰ کہ مردہ انسان کے جسم کا وائرس بھی زندہ انسانی جسم میں داخل ہوجاتا ہے۔ استعمال شدہ سوئی اور انجکشن، میڈیکل آلات سے بھی یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔

متاثرہ چمگادڑ ادھورے کھائے ہوئے پھل کو چھوڑ دیتے ہیں جسے ارضیاتی دودھ دینے والے جانور، گوریلے، بن مانس، بارہ سنگھا، لنگور وغیرہ ایسے پھلوں کے کھانے سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ زنجیر قدرتی طفیل سے شروع ہوکر جانوروں کی آبادی کو متاثر کرتی ہے۔ دراصل چمگادڑ کے لعاب سے یہ وائرس پھلوں کے گودے میں سرایت کرجاتے ہیں۔ ان پھلوں کے کھانے والے جانوروں میں یہ وائرس منتقل ہوجاتے ہیں۔ مغربی افریقہ میں پھلوں پر گزارہ کرنے والے چمگادڑوں کو بھون کر، سوکھا یا ان کا سوپ بنا کر پیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ وائرس انسانی جسم میں داخل ہوجاتا ہے۔ مغربی افریقہ کے ممالک کے باشندوں میں رسمی ملاقات کے ذرائع بغل گیر ہونا، بوسہ لینا، مصافحہ کرنا وغیرہ شامل ہے۔ مردہ جسموں کو دفن کرنے سے قبل نہلانا، عورتوں کے بالوں کا گوندنا، مردوں کا داڑھی بنانا وغیرہ سے بھی یہ مرض لاحق ہورہا ہے۔ مردہ جسموں کو نہلاتے ہوئے اور دیگر رسومات ادا کرتے وقت مریض سے رسنے والے خون سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر ربط قائم ہوجاتا ہے جس سے وائرس دوسرے جسم میں سرایت کرجاتا ہے۔

اس وائرس سے متاثر ہوتے ہی اس کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ ابتدا میں انفلوئنزا مرض کی علامت مریض میں ظاہر ہوتی ہے۔ تھکاوٹ، بخار، سردرد، جوڑوں میں درد، عضلات میں اینٹھن اور درد، پیٹ درد، قے، دست اور بھوک کا کم ہونا اس کے علاوہ گلے میں خراش، سینے میں درد، سانسوں کا اکھڑنا، چبانے میں دقت ہونا۔ 50 فی صد معاملات میں

مریض کی جلد پر سرخ دھبوں کا ظاہر ہونا پایا گیا ہے۔ سیلان خون سے قبل اس کی ابتدائی علامات ملیریا، ڈینگو یا معیادی بخار جیسی ہوتی ہے۔ 40 سے 50 فی صد معاملات میں خلوی جھلی، آنتوں، ناک، اندام نہانی اور مسوڑوں کے پھٹنے سے سیلان خون ہوتا ہے۔ سیلان خون کی ابتدا مریض کے متاثر ہونے سے 5 سے 7 دنوں کے بعد ظاہر ہونے لگتی ہے۔ آنکھوں کی ذیلی نازک جھلیوں کے پھٹنے سے جلن، کم نظر آنا، خون اور آنسو بہنے لگتا ہے۔ خونی قے ہوتی ہے۔ خون کے سفید ذرات کم ہوجاتے ہیں۔ جگر کے خامرے کم بنتے ہیں۔ جلد پر سرخ دھبے نمایاں ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ انجکشن لگانے کی جگہ پر بھی سرخ دائرے کا نشان ظاہر ہوجاتا ہے۔ زیادہ سیلان خون آنتوں سے خارج ہوتا ہے جس سے موت یقینی ہوجاتی ہے۔ سیلان خون سے نظام دوران خون متاثر ہوتا ہے۔ خون جمنے کا عمل دیر سے ہوتا ہے۔ اس مرض کا عرصۂ حیات دو دن سے لے کر تین یا سات ہفتے ہے۔ اس کی

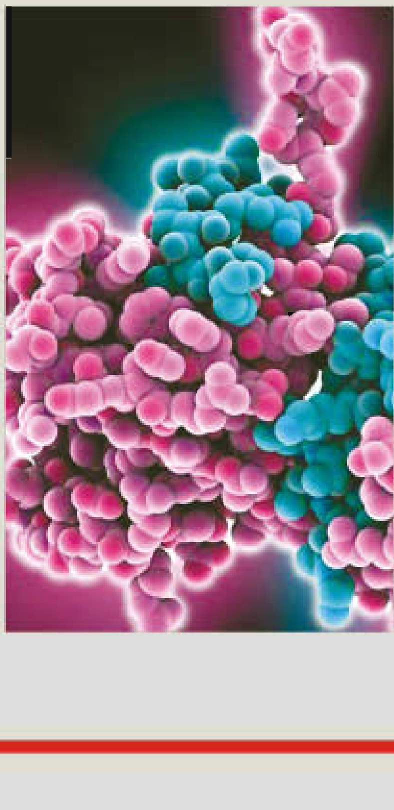

ابتدائی علامات ظاہر ہونے کے 7 سے 16 دنوں میں مریض کی موت ہوجاتی ہے۔

اس مرض کی تشخیص کے دوران اگر مریض کے خون میں ای بولا وائرس پایا گیا تو اسے یقینی بنانے کے لیے RNA یا پروٹین ٹسٹ کیا جاتا ہے۔ ضد حیاتین دے کر یا ELISA ٹسٹ کی مدد سے بھی اس مرض کی تشخیص کی جاتی ہے۔

احتیاطی تدابیر کے پیش نظر مریض سے ملاقات کرنے یا خیروعافیت معلوم کرنے سے گریز کریں۔ ان سے حفاظتی ماسک کے بغیر ہرگز ملاقات نہ کریں۔ مریض کی کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں حتیٰ کہ اس کے استعمال کی ہر چیز سے دور رہیں۔ عالمی صحت تنظیم کے انتباہ کے مطابق متاثرہ چمگادڑ، بندر، بن مانس، لنگور کا گوشت ہرگز نہ کھائیں۔ مباشرت کرنے، ہاتھ ملانے یا بوسہ لینے سے گریز کریں۔ جدید تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ وائرس منی کے ذریعے مادہ میں منتقل ہوکر 7 ہفتوں میں کارگر ہوجاتا ہے۔ اغلام بازی، جسم فروشی کرنے والوں پر سختی سے پابندی لگادی جائے اور ان کی تشخیص ہونے پر مریض کو محفوظ مقامات پر منتقل کردیا جائے۔ اگر مریض فوت ہوجائے تو فوراً اس کو مٹی میں دفن کردیں۔ مریض کی دیکھ بھال کرنے والے کارندے بھی احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔ متاثرہ مریض کی سوئی، تاول یا کوئی بھی سامان کو ہاتھ نہ لگائیں۔ جسم سے جاری سیلان خون یا سیلان سیال کو مس نہ کریں۔ حفاظتی دستانے، لباس، چہرہ کو ڈھاکنے والے ماسک اور چشموں کا استعمال کریں۔ انتہائی حساس اور بند کمروں میں مریضوں کو رکھیں تاکہ دوسرے مریض متاثر نہ ہوں۔

ای بولا وائرس کی روک تھام کے لیے اگر متاثرہ چیزوں کو 60° C پر ایک گھنٹہ گرم کرنے یا ابال دیا جائے وائرس مرجاتا ہے۔ حفاظت کے لیے مصفا، بلیچنگ پاؤڈر یا الکحل آمیز سیال استعمال کرسکتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ والی جگہوں پر جانے سے بچیں۔ اسکول، کالج، بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، سنیما ہال میں نہ جائیں۔

اس مرض کی باقاعدہ کوئی دوا ابھی تک دستیاب نہیں ہے لیکن مریض کو ابتدائی طبی امداد کے طور پر شکر اور نمک پانی میں حل کرکے پلائیں یا اندرون ورید سیال داخل کریں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے شعبۂ ادویات (FDA) نے فی الوقت اس کی روک تھام کے لیے ZMapp اور TKM ebola دوائیں تجویز کی ہیں۔

■

Dr. Mohd. Rafique A.S, Baitulamin, opp. Badi Masjid, Kamptee - 441001 (Dist. Nagpur) (M.S)

تبصرہ وتعارف

ہندوستانی مسلمان

مصنف: محمد مجیب

صفحات: 812، قیمت: 228 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ساجد حسین، شعبۂ اردو، دیال سنگھ ایوننگ کالج، لودھی روڈ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ہندوستانی مسلمان' ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی مفصل و مستند دستاویز ہے۔

مصنف کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی بازیافت، معلومات بہم پہنچانے کے بجائے معاملات کو بتانے اور سمجھانے کی کامیاب سعی ہے۔ اس کے لیے مصنف نے مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار کے نمائندہ اور نمایاں تصورات اور شخصیات کو ہی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ ہندوستانی مسلم تاریخ کو تین ادوار ابتدائی، وسط اور جدید میں تقسیم کیا ہے۔ عہد بہ عہد مذہبی رجحانات، صوفیائے کرام اور تصوف کے کردار و اثرات، شعر و ادب، فن تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ، سیاسی کشاکش اور معاشرتی زندگی کے مختلف عناصر کی روشنی میں مصنف نے مسلمانوں کی تاریخ کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد دونوں قوموں کے پاس سیاسی اور سماجی اطوار و اقدار کے درمیان آویزش و آمیزش کو محمد مجیب صاحب نے بڑے ہی معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی آویزش و آمیزش کے نتیجے میں دہلی سلطنت کے قیام تک ہندوستانی مسلمان ایک الگ تہذیبی شناخت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔

تینوں ادوار کے تاریخی مطالعے سے قبل سیاسی نظام کے عنوان سے قائم باب میں مصنف نے نظم و نسق، دفاع، فوجی تنظیم اور مدنی رویے کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کی مدبرانہ صلاحیتوں، انتظامی استعداد، حربی خوبیوں اور باہمی مساوی رویوں کو بیان کیا ہے۔

ابتدائی دور کے اول باب میں مسلمانوں کے شرعی شعائر کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ سیاست اور مذہب میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ اس دور کے حکمرانوں کی شرعی قوانین سے مطابقت اور مفارقت کے ساتھ ساتھ اس عہد کے علماء کے رول اور رویوں کو بھی مصنف نے ظاہر کرتے ہوئے قدامت پسندی کی تشریح و توضیح کی ہے۔ مدبرین اور ناظم کے عنوان سے قائم باب میں علاء الدین خلجی کو اس دور کا بہترین ناظم اور مہتمم بتایا ہے۔ مذہبی فکر کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے اس دور کے علما کے طور طریقے اور تعلیمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ صوفیائے کرام اور تصوف کے باب میں صوفیاء کے مجاہدے، ریاضتیں، کرامات اور مریدین کا ذکر ہے اور ان کی روحانی دنیا اور تعلیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ شاعر اور مصنف کے باب میں امیر خسرو اور البیرونی کی تصنیفات و تالیفات کی روشنی میں اس دور کی لسانی سماجی اور ذہنی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ فن تعمیر کے باب میں اس دور کی مسجدوں، مقبروں، محراب اور میناروں، حمام اور عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے جمالیاتی اور تعمیری اصول و قدر کا اظہار کیا ہے اور اس تضاد کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا فنون سے کوئی واسطہ نہیں۔ معاشرتی زندگی کے باب میں مصنف نے عہد اول کے مسلمانوں سے شادی بیاہ، ان کے اندر پیدا ہو چکے ذات پات، بھید بھاؤ کے علاوہ ان کے پیشہ ملازمت اور عادات و اطوار کا احاطہ کیا ہے۔

وسطی دور کا مطالعہ بھی انھیں عنوانات کے تحت کیا گیا ہے۔ مذہبی فکر اور معاشرتی زندگی میں بتدریج آئی تبدیلیوں، اعتقاد اور مسلکی اختلافات، شیعہ سنی فسادات اور بادشاہوں کے میلانات کا تفصیلی بیان ہے۔ اکبر کو اس دور کے حقائق و وقائع کی روشنی میں بہتر مدبر اور کامیاب ناظم قرار دیا ہے۔ مذہبی فکر کے باب میں شیخ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ کے مذہبی فکر و خیالات کا تفصیلی ذکر ہے۔

تصوف کے باب میں مختلف سلسلوں کے صوفیائے کرام کے نام اور کام کو زیر موضوع بنایا گیا ہے۔ شاعر و ادیب کے باب میں اس عہد کی زبانوں کے باہمی انسلاک اور دیگر زبانوں کے شاعروں کی شاعری کو پیش کیا گیا ہے۔ فن تعمیر کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے اس عہد کو فن تعمیر کا عہد زریں بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی مصوری اور دستکاری کے نمونوں کو عہد مسلم کا شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ معاشرتی زندگی پر دربار، بازار اور خانقاہ کا اثر، سماج میں در آئی تصنع، بناوٹ، فراریت اور امرد پرستی، ہندو مسلمان کے باہمی تعلقات اور قدامت پسندی کے رد کو مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کا تیسرا دور مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جس میں مسلم معاشرے کے اندر مذہبی و مسلکی پھوٹ اور ایک دوسرے کے فکر و اعمال کی سخت گیری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس معاملے کو مصنف نے قدامت پرستی کے باب میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس باب میں اس عہد کی نامور مذہبی شخصیات کی حیات اور کارنامے اور مختلف ذہبی مکتبہ فکر کے خیالات و تعلیمات کو مصنف نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ مذہبی فکر کے باب میں اس دور کے مسلم رہنما و دانشور مثلاً شاہ اسمٰعیل، سرسید، اقبال اور مولانا آزاد کا ذکر ہے جنھوں نے مسلمانوں کے فکر و اعتقاد کو متاثر کیا ہے۔ حیدر علی کو اس دور کا بہتر مدبر اور ناظم بتایا ہے اور اس کے اندر ان تمام خصائص کا ذکر کیا ہے جو اس عہد کے ہندوستان کے حکمراں میں ہونا چاہیے۔ انگریزوں، مراٹھوں، فرانسیسیوں نظام اور میسور کے درمیان سیاسی ریشہ دوانیوں کا بھی ذکر مصنف نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ شاعر اور مصنف کے باب میں میر و غالب، اکبر و اقبال سے فکری و فنی رویوں کا بیان ہے۔ معاشرتی زندگی کے باب میں مسلمانوں کے

اندر عدم تحفظ کے شدید احساس اور معاشی تنزلی کو سامنے رکھتے ہوئے محمد مجیب نے ان کے روزمرہ اور کلچر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں ان ہندوستانی مسلم اکابرین کا بھی تفصیلی ذکر ہے جنھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

کلیاتِ سعادت حسن منٹو (اول، دوم)

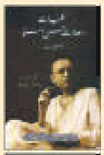

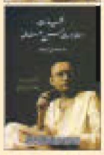

تحقیق، تدوین، ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی
صفحات: 567 (پہلی جلد)، 575 (دوسری جلد)
قیمت: 184 (پہلی جلد)، 186 (دوسری جلد)، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: عمیر منظر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس لکھنؤ

چند برس پہلے جب منٹو کی پیدائش کی صدی تقریبات کا اہتمام کیا جارہا تھا تو سرحد کے دونوں جانب منٹو سے متعلق بے شمار کتابیں منظر عام پر آئیں۔ منٹو کے فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں بے شمار مضامین شائع کیے گئے۔ علمی مذاکروں اور سمیناروں کا اہتمام کیا گیا۔ بہت سے پروگراموں میں دختران منٹو بھی دیکھی گئیں۔ ان پروگراموں سے اندازہ ہوا کہ منٹو کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور آج بھی منٹو کی تحریریں اسی طرح مقبول ہیں جیسا کہ اس کے زمانے میں تھیں۔ منٹو کی یہی مقبولیت بقول شمس الحق عثمانی ''تاجران کتب کے لیے جنت بن گئی کہ کتاب کے ٹائٹل پر منٹو کا نام ہی خریدار کی جیب ہلکی کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔'' اشاعتی گھرانوں نے کبھی یہ دیکھا ہی نہیں کہ ہم جو چھاپ رہے ہیں اس کا متن کتنا درست ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک مرحلہ ایسا بھی آگیا جب ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے منٹو کا کوئی بھی متن ایسا نہیں رہا جس پر وہ اعتماد کرسکے۔ صدی تقریبات میں یوں تو بہت کچھ ہوا مگر تدوین متن جیسے جوکھم بھرے کام پر کسی نے ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کی۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی ادبی دنیا کی طرف سے اجتماعی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس جانب نہ صرف توجہ کی بلکہ کلیات منٹو کی دو جلدوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے تدوین متن کی ایک مثال قائم کی ہے۔

کلیات منٹو کی پہلی جلد میں اشاریے کے علاوہ تین کتابیں شامل ہیں۔ آتش پارے، منٹو کے افسانے اور دھواں جبکہ دوسری جلد میں افسانے اور ڈرامے، چغد، لذت سنگ، 'سیاہ حاشیے' اور 'خالی بوتلیں' کے ساتھ اشاریے بھی شامل کتاب ہیں۔ کلیات میں یہ اطلاع بھی ہے کہ اس کی آخری جلد 'اشاریہ کلیات سعادت حسن منٹو' ہوگی۔ قارئین کو بقیہ جلدوں کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔

کلیات منٹو میں شامل ہر مجموعے سے قبل 'عرض مرتب' کے عنوان سے اس کی اشاعت اول اور اس سے متعلق دیگر امور کی وضاحت درج ہے۔ یہ حصہ قارئین کی معلومات میں صرف اضافے کا سبب ہی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کلیات کی ترتیب میں پروفیسر عثمانی نے کس قدر جوکھم اٹھایا ہے۔ کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیات منٹو کی ترتیب کے لیے انھوں نے منٹو کی کتابوں کے بنیادی نسخوں کے علاوہ شعور، دستاویز، منٹو کے نمائندہ افسانے، دستاویز (ہندی)، سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے، منٹو ڈرامے، منٹو باقیات، منٹونما، منٹونامہ، منٹو کہانیاں، منٹو ڈراما رسالے/کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور بجا طور پر یہ رسالے اور کتابیں کلیات کی ترتیب میں مرتب کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں۔

کلیات میں شامل ہر کتاب سے پہلے عرض مرتب کی تحریر ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب ہی نہیں ہے بلکہ فاضل مرتب نے اصل متن تک کس طرح رسائی حاصل کی ہے اور یہ اس کلیات کا متن کیوں مستند قرار دیا جائے اس کی بھی گرہیں کھلتی ہیں۔ جلد دوم میں شامل کتاب 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' کے چار نسخے مرتب کے پیش نظر رہے ہیں۔ مطبوعہ مکتبہ نو، دہلی، مطبوعہ مکتبہ شعر و ادب لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ساقی بک ڈپو (جدید) اردو بازار، دہلی۔ ان چار نسخوں کی تفصیلات پروفیسر عثمانی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

نسخہ نمبر ایک کے صفحہ دو پر کتاب کی قیمت وغیرہ سے پہلے 'بار دوم' مئی سنہ 1952 بھی درج ہے۔ اس وضاحت اور 'پیش لفظ' کی تاریخ تحریر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'خالی ڈبے خالی بوتلیں' کے اس ایڈیشن میں وہی 'پیش لفظ' شائع ہوا ہے جو منٹو نے پہلے ایڈیشن کے لیے تحریر کیا تھا... دوسرا نسخہ مکتبہ شعر و ادب لاہور کا شائع کردہ۔ اس کے صفحہ چار پر: ناشر مہتمم اور قیمت سے پہلے یہ اطلاع درج ہے ''جملہ حقوق بحق صفیہ منٹو محفوظ ہیں'' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' کا یہ ایڈیشن منٹو کی موت (1955) کے بعد ان کی بیگم کی اجازت سے شائع ہوا ہے۔ اس اڈیشن کے صفحہ پانچ اور چھ پر 'وہی' 'پیش لفظ (مع مقام و تاریخ تحریر)' شائع ہوا ہے جو نسخہ نمبر ایک میں شامل ہے۔ ان دونوں کے متون مساوی ہیں 'علاوہ آخری پارے میں ایک لفظ کے نسخہ نمبر ایک کا جملہ: 'پیش لفظ کی کوئی ضرورت نہیں تھی' دوسرے نسخے میں یوں ہے: 'پیش لفظ کی کوئی ضرورت نہ تھی'... تیسرا نسخہ 'منٹو ڈرامے' کے صفحات 11 تا 126 کو محیط ہے۔ اس میں صرف افسانے ہیں انتساب اور پیش لفظ شامل نہیں۔ چوتھا نسخہ سال اشاعت اور پیش لفظ سے محروم ہے۔ چاروں نسخوں میں افسانوں کی تعداد اور ترتیب مساوی ہے۔ کلیات منٹو دوسری جلد 432 تا 433

ان سطور سے واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر عثمانی نے کلیات سعادت حسن منٹو کے متن کو مستند اور معتبر بنانے میں کوئی کسر نہیں باقی رکھی ہے۔ افسانے اور افسانوی تنقید سے انھیں گہرا شغف رہا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی حسیت منٹو متن کی ترتیب و تحقیق اور تدوین میں کام آگئی ہے۔ اس عمدہ اور بہتر کام کی طباعت بھی اگر روشن ہوتی تو سونے پر سہاگہ ہوجاتا لیکن بوجوہ ایسا نہ ہوسکا۔ دوسری جلد میں بہت سی جگہوں پر حروف مٹے ہوئے ہیں۔

فاضل مرتب اور ادارہ دونوں لائق مبارک باد ہیں۔ اردو دنیا کو اس طرح کی کتابوں کا نہ صرف استقبال کرنا چاہیے بلکہ ایسے ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہیے کہ انھوں نے خود کو جوکھم میں ڈال کر ایک تخلیقی متن کو درست کیا ہے۔ جواں سال ادیبوں اور نئے مرتبین کو اس نوع کے کاموں کو اپنے لیے مشعل راہ بنانا چاہیے۔

ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت

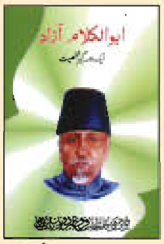

مرتب: رشید الدین خان
صفحات: 684، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر ٹی آر رینا

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے تیسری مرتبہ 2013 میں شائع کی ہے۔ اس کی پہلی اشاعت 1989 میں ہوئی تھی کیونکہ 1988 مولانا ابوالکلام آزاد کا صد سالہ یوم پیدائش تھا۔ صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں ملک کے طول و عرض میں مختلف اقسام کے پروگرام اور سیمینار منعقد کیے گئے۔ ان سیمیناروں میں ملک کی علمی شخصیات نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ رشید الدین خان نے بہترین مقالات کا انتخاب کرکے انھیں کتابی شکل عطا کی تاکہ ملک کی نئی نسل مولانا آزاد کی شخصیت سے پوری طرح آگاہ ہوسکے۔

رشید الدین خاں نے ان مقالات کو چھ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ان سے قبل فہرست مضامین میں تعارف، مقدمہ اور صدی تقاریب کے آغاز کے قومی جلسہ منعقدہ 11 نومبر 1988 میں دیے گئے تین خطبات از عزت مآب شیوشنکر صاحب وزیر ترقی انسانی وسائل

حکومتِ ہند، عزت مآب راجیو گاندھی صاحب وزیر اعظم ہند اور عزت مآب راما سوامی وینکٹ رمن صاحب صدرِ جمہوریہ ہند کے شامل ہیں۔

رشید الدین خان نے کتاب کی شروعات مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب 'غبارِ خاطر' کے ایک اقتباس سے کی ہے۔

مقدمے میں رشید الدین خان نے تمام مقالات کو سامنے رکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حصہ 'الف' میں 'ذہن و فکر' کے عنوان کے تحت چار مقالات شامل ہیں۔

حصہ 'ب' تغیر و تفہیم کے تحت بھی چار مقالات شامل ہیں۔

حصہ 'ج' کے عنوان 'صحافت اور ادارت' کے تحت سید مظفر حسین برنی کا 'مولانا آزاد کا مقام ہندوستانی صحافت میں اور احمد سعید ملیح آبادی کا 'ابوالکلام آزاد– ادیب اور صحافی' دو مضامین شامل ہیں۔ حصہ 'د' 'انشا و اسلوب' میں چار مضامین ہیں: 'مولانا آزاد کا اسلوبِ نثر'، آل احمد سرور 'جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر– صدیق الرحمن قدوائی 'مولانا آزاد کا اسلوبِ نگارش' عصمت جاوید اور 'ابوالکلام آزاد اپنے مضامین کے آئینے میں' سیدہ جعفر۔

اس کتاب کا ہر مضمون اپنی ہی نوعیت کا ہے، مگر بہت سی باتوں کی تکرار ہوئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عام مضمون نگاروں کو مولانا ابوالکلام آزاد کے چند اخبارات، رسائل اور کتب کی ہی جان کاری تھی۔ صرف سعید ملیح آبادی ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے مولانا آزاد کے 14 رسائل اور 39 کتب کا ذکر کیا ہے جو ان کے قلم کی نوک سے نکلے ہیں۔ اس کے علاوہ ملیح آبادی صاحب نے ان اخبارات اور رسائل کے نام بھی درج کیے ہیں جن میں ان کے مضامین یا کلام شائع ہوئے ہیں۔ ان عربی رسائل کا بھی ذکر ہے جو مولانا آزاد کے مطالعے میں رہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اِس کتاب کا تیسرا اڈیشن شائع کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن ایک بات سامنے آتی ہے کہ اس صدی اڈیشن میں محمد ضیاء الدین انصاری، ریاض الرحمن شروانی اور مشیر الحق کے دو دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اگر ایسے کارنامے میں تین اور شخصیات کو جگہ مل جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

راقم اِس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب میں شامل 29 مضامین کے ذریعے مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ لیکن ایک بات کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ ہر مضمون نگار نے مولانا آزاد کی ادبی و صحافتی زندگی کی شروعات کا ذکر ان کی شاعری سے کیا ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں ان کی پہلی غزل 'ارمغانِ فرخ' بمبئی میں شائع ہوئی۔ 1899 میں آزاد نے 'نیرنگِ عالم' ماہنامہ شعری جریدہ کلکتہ سے جاری کیا جو تین چار شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ ان شماروں میں بھی مولانا کا کلام شائع ہوا ہوگا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جتنے مضامین اور خطبات تحریر کیے ان میں بھی انھوں نے اپنے اشعار درج کیے ہیں۔ 'غبارِ خاطر' کے مضامین میں تو ان کے درج اشعار نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کئی مقامات پر دو تین طرز کے املے میں نظر آتا ہے۔ اِس کے علاوہ پروف کی بھی غلطیاں بھی ہیں۔

کتاب کے صفحہ اوّل تا آخر مطالعے کے دوران نظر بعض الفاظ کے املا پر آ کر رکتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان برِّصغیر کا ایک مثالی ادارہ ہے جس کی طرف اردو دنیا کے حضرات کی نگاہیں لگی رہتی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ایسا ادارہ ہے یہاں اچھے سے اچھے کمپوزر اور پروف ریڈر موجود ہیں۔ ان کی خدمات بہتر طور پر لی جاسکتی ہیں۔ حرکات و سکنات کا دھیان بھی نہیں رکھا گیا، مثلاً تشدید اور اضافت کے زیر کا کم سے کم استعمال ہوا ہے۔ ہمزہ کے استعمال کا بھی دھیان نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً: اچھّا، اچّھے، سچّا، سچّے، مسرّت اور رکھّا وغیرہ۔ جن حروف پر تشدید کی ضرورت ہو وہاں اس کا لگانا ضروری ہے۔ تشدید کی طرح اضافت کا زیر بھی لگانا ضروری ہے ورنہ معنی میں بعض اوقات فرق آ جاتا ہے۔ اسی طرح چائے، گائے، اور رائے، پر ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔ ایک تو یہ اسم ہیں دوسرے الف اور ے دونوں حروفِ علت ہیں مگر ان کی آواز ایک ہو کر نکلتی ہے الگ الگ نہیں اس لیے چاے، گاے اور راے پر ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔

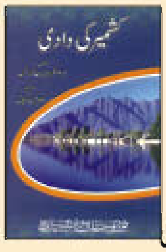

کشمیر کی وادی

مصنف: سر والٹر روپرٹ لارنس، مترجم: غلام نبی خیال
صفحات: 587، قیمت: 217 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: خالد حسن، 69-273، گراؤنڈ فلور، گلی نمبر: 10، غفار منزل، نئی دہلی

وادی کشمیر اور اہل کشمیر کے طرزِ زندگی، رسم و رواج، بود و باش اور رہن سہن پر کئی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان میں سب اپنی جگہ اور اپنے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔

واضح ہو کہ یہ کتاب دراصل لارنس کے ذریعے انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ اس سے قبل کئی مترجمین اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

غلام نبی خیال جو خود قابل مصنف و صحافی کے علاوہ کشمیری باشندے بھی ہیں وہ اس ترجمے کے لیے مناسب تھے کہ وہ نہ صرف اصل عبارت بلکہ طرز معاشرت سے بھی بھرپور آگہی رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے وہاں کے حکمرانوں کے اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کے دور میں عوام جن مشکلات سے گزر رہی تھی اس کو وضاحت سے بیان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

لارنس کی یہ تاریخی ضخیم کتاب مختلف نوع کے انیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائیہ، بیانیہ، ارضیات، نباتات، حیوانات، آثارِ قدیمہ، سیاسی تاریخ، مادی تاریخ، اعداد و شمار، سماجی زندگی مذاہب نسلیں اور قبیلے زراعت اور کاشتکاری، مال اور مویشی، صنعتیں اور کاروبار، تجارت، قدیم انتظامیہ جدید بندوبست اور زبان ولسانیات۔

لارنس نے ان ابواب کی تقسیم میں پورے کشمیر نیز وہاں کی ہر چیز کو اپنی کتاب میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے جو کافی دل چسپ اور معلومات سے پر ہے۔ تاریخی نوعیت کی یہ ضخیم کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔ لارنس نے یہاں کی زبان، کردار، رسم و رواج کے علاوہ اہل کشمیر کے مخصوص لباس اور بود و باش کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ کشمیر کی سلطنتیں ہمیشہ تنازعہ کا شکار رہی ہیں۔ مصنّفین کے ذریعے یہاں کے ناقص انتظامی امور کا ذکر بڑی وضاحت اور صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔ نااہل سلطنت کی سزا بے قصور عوام کو جھیلنی پڑی۔

لارنس نے بھی اپنی تصنیف میں حکومت کی خامیوں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے لیکن عوام کو بے قصور اور دیانت پسند تحریر کیا ہے۔ چھل وغیرہ کو بھی لارنس نے اپنی کتاب میں دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

فن تعمیر یوروپی طرز پر ہے۔ کشیدہ کاری بھی مثالی ہے۔ ہندوستان میں کشمیر کی تاریخ سے متعلق ہمیشہ تضاد رہا۔ لیکن یوروپی علما نے اس پر گہری نظر رکھی اور وہاں کے تاریخ دانوں نے کافی محنت و لگن یہاں کی قدیم تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ ان میں لارنس ایک عظیم نام ہے جنھوں نے اپنی تصنیف میں جس بصیرت سے کشمیر کی تاریخ کو پیش کیا ہے وہ قابل غور امر ہے۔ علاوہ ازیں یوروپی دانشور نے کشمیر کے تاریخی پہلوؤں کو منظر عام پر لانے میں کشادگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر ہوریس ہیمین ولسن نے 1825 میں کشمیر کی ہندو قدیم تاریخ پر اپنا مقالہ شائع کیا جو کشمیر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعداد و شمار، ارضیات کی تقسیم اور اس کا نظم و نسق کشمیری زمین پر معدنیات کے علاوہ نباتات

میں کستوری، زعفران جیسی بیش قیمت شے اور جڑی بوٹیاں، کشمیریوں کا رہن سہن و بود و باش اور ان کے پیشے سے متعلق اطوار کو بھی بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ایسے ہی ذاتی تفریق ہندو اور مسلمان دونوں میں موجود مثلاً ہندوؤں میں چھتری، برہمن، دلت اور مسلمانوں میں شیخ، سید، مغل اور پٹھان کے علاوہ شیعہ مسلم اور سنی مسلم کا ذکر بھی خوبصورت اور دل چسپ انداز میں ہے۔

حیوانات جن سے نہ صرف روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں بلکہ لباس کے لیے ریشم اور اون، کھانے میں عمدہ شہد بھی حیوانات سے ہی میسر آتا ہے۔

طوالت سے قطع نظر باقی تمام طرح سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے جو اہل اردو اور محب زبان کے لیے قیمتی معلومات کے ساتھ سچائی، جاں نثاری اور قوت ارادی کا درس دیتی ہے۔

غلام نبی خیال نے بھی اپنی مترجمانہ صلاحیت کے ذریعے اس کتاب کو جو جلا بخشی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ غلام نبی خیال نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے عظیم فنکاروں اور دانشوروں کی صف میں اپنی موجودگی ہی درج نہیں کرائی بلکہ اردو ترجمہ کو ایک نئی جہت بھی عطا کی ہے۔ امید ہے کہ اس سے اہل اردو کشمیر کی تاریخ اور حالات سے باخبر ہوسکیں گے قومی کونسل بھی مبارکباد کی مستحق ہے جس نے عظیم نایاب نسخے کا ترجمہ کرانے میں ایک بہترین مترجم کا انتخاب کیا۔

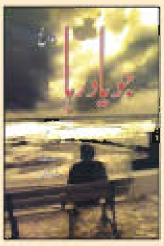

جو یاد رہا (سوانح)

مصنف: عابد سہیل

صفحات: 712، قیمت: 600 روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی

مبصر: صادقہ نواب سحر، صدر شعبہ ہندی، کے ایم سی کالج، کھپاولی، رائے گڑھ، مہاراشٹر 410203

’جو یاد رہا‘ عابد سہیل کی خودنوشت ہے، جس میں انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز کا نقشہ بڑے ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔ ’جو یاد رہا‘ کا پیش لفظ، جس کا عنوان ’زندگی، خوشی اور معنویت‘ ہے، بہت سے صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس عنوان سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ کتاب میں قاری کے ذہن و دل کو جھنجھوڑنے والی اور ہلچل پیدا کرنے والی طاقت ہے۔

مصنف اپنی زندگی کے ساتھ دھیرے دھیرے ستر پچھتر برس پرانے گھر، شہر، گاؤں اور ملک کا نقشہ کھینچتے ہوئے آج کی تہذیب تک پہنچ جاتا ہے۔ واقعات کے ساتھ وہ روتا ہے، ہنستا ہے اور بڑے مزے سے بے اطمینانی اور اطمینان کے پینڈولم کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ گھریلو رسم و رواج، شادی بیاہ، عید بقرعید وغیرہ کا اس کتاب میں تفصیلی بیان نہیں ہے البتہ مسلم سماج کے ایک باغی نوجوان کا ذکر ضرور ہے جو اپنے والد کے انتقال تک موج مستی اور شرارتوں کی حدیں پار کرتا رہتا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی اس کی سوچ میں پختگی آجاتی ہے۔ وہ گھر کا بڑا بیٹا ہے۔ ذمے داری کے احساس کو تو بیدار ہونا ہی تھا۔ پڑھائی کے شوق نے اسے اسی قسم کے کاموں کی جانب کھینچا، جس میں اس کے ذہن کی افتاد تھی۔ ٹیوشن لیتے ہوئے، کتابیں بیچتے ہوئے، ریڈیو اور ادبی پرچوں کے لیے لکھتے ہوئے وہ ادبی دنیا کا ایک مضبوط ستون بنتا گیا۔ یہاں تک کہ حالات اسے اپنے جوہر فطرت کو منوانے کا ایک اور موقع عطا کرتے ہیں۔ ’کتاب‘ نامی رسالے کا جنم ہوتا ہے اور پس پردہ مدیر کے روپ میں اس کی ایک نئی پہچان بن جاتی ہے۔ اس خودنوشت میں ایک طویل مدت کے حالات جھلکتے ہیں۔ مصنف کو اپنی لمبی عمر میں اپنے کئی ساتھیوں کے بچھڑنے کا دکھ ہے۔ کہتے ہیں ایک نوحہ گر باقی ہے۔ دیکھیے کب تک رہے۔ اس طرح مصنف ایک راوی دکھائی دیتا ہے۔ راوی جو نوحہ گر بھی ہے۔

’حرفِ آخر‘ میں مصنف نے اپنے ہمزاد کے بارے میں بتایا ہے اور یقین کے ساتھ اپنی یادداشت کے سوفی صد سچ ہونے کا دعویٰ بھی پیش کرتا ہے اور بالکل پہلی بار وہ اپنے بعض اعزا کے دیے ہوئے ایک زخم کو اپنے ساتھ قبر تک لے جانے کی بات کرتا ہے۔ صفحہ 677 پر وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس سے اپنی زندگی میں غلطیاں بھی ہوئیں لیکن اپنے اندر پیدا ہونے والی فطری کمزوریوں پر اس نے ہمیشہ فتح پائی۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ تحریر کسی خاص قسم کے قاری کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی ہے۔ مصنف پر جو کچھ اچھی یا بری بیتی وہ اس نے ایمانداری کے ساتھ بیان کردی۔ اس کو جو غم اور خوشیاں اس دنیا نے دیں، وہ انھیں شاید اسی طرح قارئین کے سامنے رکھ سکتا تھا۔

اس کتاب کے ایک باب ’جستہ جستہ‘ میں برسہا برس کے اہم اور دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔ کہیں ’نولکھا ہار‘ ہے تو کہیں ترقی پسند مصنفین کا ذکر۔ ابھی نظیر اکبرآبادی کا شعر سنایا جارہا ہے اور ابھی ایمرجنسی کا۔ کہیں دلیپ کمار کا ذکر ہے تو کہیں گیان چند جین کا۔ یعنی باتیں سلسلہ وار نہیں ہیں یا تاریخی پہلو سے بے ربط ہیں۔ ایک بات کا سرا آگے کہیں اور جا کر ملتا ہے۔

یہ کتاب مجھے دوسری خودنوشتوں سے مختلف لگی۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سچائی نظر آئی، ویسے اگر کوئی بات صناعی کی جھلمل کے ساتھ اس طرح پیش کی جائے کہ سچ لگے تو یہ بھی تو فن کاری ہی ہوئی۔ اس کتاب کی کرافٹنگ یہی ہے کہ اس میں صناعی دکھائی نہیں دیتی۔

’جو یاد رہا‘ آپ بیتی ہے، جو جگ بیتی کے ساتھ گھل مل گئی ہے، جس میں ادبی سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔ جیسے ’’ریڈیو کے سالانہ مشاعرے کا موسم آیا تو خیال کے گھوڑے دوڑائے جانے لگے کہ اس بار کون کون سے شعراء آئیں گے۔ جوش، جگر، فراق، اثر لکھنوی اور ساغر نظامی تو خیر آئیں گے ہی۔‘‘ مصنف آج کی ادبی دنیا کے تجارتی ماحول سے اپنے عہد کا موازنہ کرتا چلتا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے، ’’یادش بخیر، کیا دن تھے کہ شعرا کے ناموں پر بحث ہوتی تھی، اشعار زیر بحث آتے۔ اب شعرا فیس پر جھگڑتے ہیں۔‘‘ (597)

المختصر یہ کتاب عابد سہیل کی زندگی کا نچوڑ ہے جسے ایک بار پڑھنا شروع کردینے کے بعد ختم کیے بنا نہیں رہا جاسکتا۔

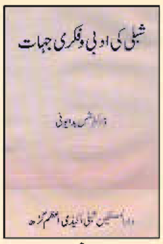

شبلی کی ادبی وفکری جہات

مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی

صفحات: 200، قیمت 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: دارالمصنفین، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ

مبصر: محمد زبیر خان سعیدی بدایونی

تصنیفی دنیا میں دارالمصنفین ایک باوقار ادارہ ہے جو بالکل محتاج تعارف نہیں ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ ادارہ اپنی مطبوعات میں روز بروز اضافہ دراضافہ کا قطعاً قائل نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سلسلہ دارالمصنفین کی 202 ویں تصنیف ہے۔ معیارِ انتخاب کتب دارالمصنفین کی ایسی ندرت ہے جو دیگر تصنیفی و اشاعتی ادارہ جات سے اسے منفرد کرتی ہے۔ بیت الحکمت بغداد اور دائرۃ المعارف حیدرآباد کے بعد عالم اسلام کا یہ تیسرا مایہ ناز علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ دارالمصنفین کے قیام کو آج پورے سو سال ہوگئے ہیں، سیرت نگاری میں دارالمصنفین کو امام کی حیثیت حاصل ہے اور جس طرح یہ ادارہ محتاج تعارف نہیں بعینہٖ زیر نظر تصنیف کے مصنف ڈاکٹر شمس بدایونی بھی اب ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ لیکن اس وقت مجھے مصنف اور ناشر پر نہیں بلکہ تصنیف پر تبصرہ کرنا ہے۔

زیر نظر تصنیف کے مشمولات شبلی سے متعلق ہیں۔ مصنف نے اس تصنیف میں بڑی ہمت سے مدلل گفتگو کرتے ہوئے اشارات و کنایات اور سوالات و جوابات کے ذریعے بہت

سی ان کہی جہتیں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے اس بنیادی سوال سے موضوع کا آغاز کیا ہے کہ ''مولانا شبلی اپنے تمام تر مورخانہ شعور وآگہی، مختلف فنون پر فاضلانہ دست رس، تصنیفی وتالیفی مہارت، نادر موضوعات کے انتخاب، مواد کی ترتیب و تنظیم، عالمانہ استدلال، نایاب وکم یاب مراجع ومصادر کی تلاش وشناخت جیسی خصوصیات اور بعض صورتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود کیا ابتدائی دور کے محققین کی صف میں بھی جگہ پانے کے مستحق نہیں؟

کیا وجہ ہے کہ حالی وشبلی جو ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں اور شبلی جن کی ادبیات شریک غالب کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن پھر بھی اردو کے کسی بھی نامور محقق نے ادبی تحقیق کے ظہور و شیوع میں بھی ان کی حصہ داری کا اعتراف نہیں کیا؟ کیوں رشید حسن خاں مولانا شبلی کو محقق نہیں مانتے؟ اور سب سے بڑا سوال جب بڑے محققین نے مولانا کو محقق گردانا ہی نہیں ایسے میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا اختیار کردہ عنوان 'اردو تحقیق میں مولانا شبلی کی اولیات' کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟ یہ تمام سوالات واجب اور جائز ہیں۔

مصنف نے حوالوں کے ساتھ اس کی وجوہات بھی بیان کی ہیں جن کا خلاصہ مختصراً یہ ہوسکتا ہے کہ اس عہد کی ایک لابی (جماعت) ایسی تھی جو مولانا کو خالصتاً اسلامی ذہن کا غماز ہونے کے سبب پسند نہیں کرتی تھی۔ مولانا شبلی کی تمام تصانیف تو بہت دور کی بات ہے صرف اور صرف سیرۃ النبیؐ کی ابتدائی 2 جلدیں ہی اچھے اچھے لوگوں کے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر ادب میں مولانا شبلی کی تحقیقات پر عدم توجہی دکھائی گئی وہ یہ کہ انھیں سرسید کے حریف کے طور پر پیش کیا گیا۔ مصنف نے اس جانب اپنی تصنیف میں اشارہ کیا ہے اور کچھ چبھتے ہوئے سوالات بھی پوچھے ہیں۔ کیا محمود شیرانی سے قبل اردو تحقیق کا رجحان بالکل مفقود تھا؟ کیا تحقیق صرف مذہبی اور تاریخی کتب تک محدود تھی؟ اور کیا مذہبی، تاریخی اور سوانحی تحقیقات ادبی تحقیق کے زمرے میں نہیں آتیں؟

بنیادی طور پر تحقیق کے دو مراحل ہیں، انکشاف حقائق اور استخراج حقائق۔ شبلی دونوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف نے اولیات کی اس بحث کا اختتام شیخ محمد اکرام کی 'موج کوثر' کے اس اقتباس پر کیا ہے ''... مخالفین کو تو ان کے کمال فن میں بھی عیب نظر آتے ہیں اور معتقدین انھیں سرسید سے جاملاتے ہیں۔''

تصنیف کے دوسرے مقالے میں مصنف نے مولانا شبلی کے خطوط پر بحث کی ہے، جس کے ضمن میں اردو ادب کے مکتوباتی سرمایے سے لے کر مکتوب نگاری، اس کے ادوار، تاریخ، تاریخی اہمیت، سوانحی اہمیت اور اس کی علمی وادبی اہمیت تک سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تیسرے مقالے میں مصنف نے شبلی کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت مولانا نے بہ زبان فارسی جو مثنوی پیش کی وہ شبلی کے اولین اشعار ہیں۔ شبلی نے ابتداً عربی و فارسی میں طبع آزمائی کی، بعد میں اردو کی طرف راغب ہوئے، مصنف نے باقاعدہ تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے کہ مولانا نے کب کب اور کن کن موضوعات پر اشعار کہے۔ مصنف نے باقاعدہ شبلی نعمانی کے مکاتیب کے حوالے سے دانشوری کی روایت کو ایک الگ مضمون (باب) کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے مولانا شبلی کے غیر مدون اردو کلام کو الگ سے جگہ دی ہے۔

'جہانِ شبلی' کے عنوان سے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ماجد دریابادی کے خطوط سے استفادہ کیا گیا ہے، دوسرے حصے کے اقتباسات مولانا کے ایک شاگرد رشید میر محفوظ علی بدایونی سے متعلق ہیں اور تیسرا حصہ ان اطلاعات ومعلومات پر مبنی ہے جو شبلی سے غیر متعلق کتب ومضامین سے حاصل کی گئی ہیں۔

مصنف نے ضمیمہ کے طور پر شبلی کے خطوط کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے اور اختتام ایک رفیق دارالمصنفین، کلیم صفات اصلاحی کے ذریعہ مرتب اشاریہ پر کیا ہے۔

کم از کم 10 صفحات پر مشتمل اشاریہ میں موصوف نے تمام شخصیات کے اسما، کتب اور رسائل کو صفحہ نمبر کے ساتھ درج کیا ہے۔ یہ ایک قابل تحسین عمل ہے۔ امید ہے کہ یہ تصنیف قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

رنگا رنگ پھلواری

شاعر وناشر: ڈاکٹر محبوب راہی
صفحات:180، قیمت:150 روپے، سنہ اشاعت دوم:2014
مبصر: جاوید اختر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'رنگا رنگ پھلواری' (بچوں کے لیے رنگا رنگ نظمیں) ڈاکٹر محبوب راہی کی تازہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر راہی محتاج تعارف نہیں بلکہ ادبی حلقوں میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ڈاکٹر راہی کو بنیادی طور پر بچوں کا شاعر قرار دینا، شاید غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے اب تک بچوں کے لیے کل 7 کتابیں تحریر کی ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ڈاکٹر راہی کی بچوں کی چند نظمیں صوبہ مہاراشٹر کی بال بھارتی، درجہ چہارم میں پڑھائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے کئی صوبے کی درسی کتابوں میں بھی ان کی نظمیں شامل نصاب ہیں۔ ناگپور یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کے نصاب میں آپ کی کئی غزلیں شامل ہیں۔

'رنگا رنگ پھلواری' کو بچوں کی نظموں کا گلدستہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک سو اسی صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ کل 118 نظموں تین غزلوں اور 13 رباعیات پر مبنی ہے۔ بقول شاعر اس شعری مجموعے میں چند نظموں کے سوا بیشتر نظمیں سابقہ مجموعوں سے لی گئی ہے۔

اس شعری مجموعے میں سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ، پھر مناجات، نعت ودعا استاد، دیش، یوم آزادی، یوم جمہوریہ، ہندستان کے موسم، ایکتا اکھنڈتا، تہوار، مذہب، عقیدہ جیسے موضوعات پر نظمیں شامل اشاعت ہیں جس سے بچوں کی ذہنی نشوونما میں اضافہ اور بھارت کی گنگا جمنی تہذیب کو جلا ملتی ہے۔ چند نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ایکتا کے گیت، ہمارا وطن میرا بھارت، 15 اگست جشن یوم آزادی، حب وطن، 26 جنوری، قومی نشان وغیرہ ہیں جو حب الوطنی سے شرابور ہیں۔ چند نظمیں مجاہدین آزادی کے نام سے منسوب ہیں جیسے مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، پیارے چاچا نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ علاوہ ازیں چند نظمیں ہندوستانی تہواروں کا عنوان لیے ہوئے ہیں، جن میں عید اور ہولی جیسے تہوار ہیں، 3 غزلیں شامل اشاعت ہیں، رباعیات بھی ہیں۔ جو کہ بچوں کی ذہنی تربیت اور محبت و بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کا پیغام دیتی ہیں۔ نظموں میں موضوعات کا تنوع ہے اور ان کی شاعری عام فہم ہے۔

غرض بچوں کے محبوب شاعر ڈاکٹر راہی نے بچوں کے لیے نظموں کی شکل میں تحفہ پیش کیا ہے، جس میں بچوں کی زبانی، ان کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ملٹی کلر طباعت اور کمپوزنگ کی خوبصورتی اور نفیس کاغذ وخوبصورت ٹائٹل نے اس کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ قیمت زیادہ معلوم پڑتی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر راہی کی یہ کوشش بچوں کے ادب کا سرمایہ بنے گی۔

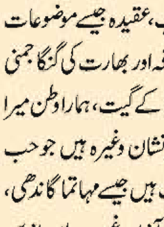

فکشن کی بازیافت

مصنف: ڈاکٹر ہمایوں اشرف
صفحات: 360، قیمت: 162 روپے، سنہ اشاعت:2013
ناشر: ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاؤس دہلی
مبصر: مولا بخش، صدر شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی

ہمایوں اشرف بنیادی طور پر فکشن کے نقاد ہیں جنھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں افسانہ نگاری میں بھی دلچسپی لی تھی اور بدلتے وقت کے ساتھ صحافت سے بھی ان

کا رشتہ ہنوز مضبوط ہوا۔

'فکشن کی بازیافت' فکشن کی عملی تنقید پر مبنی کتاب قرار دے سکتے ہیں۔اس کتاب میں چار مضامین ناول کی تنقید کے حوالے سے،دو مضامین ڈراما تنقید اور چودہ مضامین افسانہ تنقید نیز چار مضامین فکشن کے اہم نقادوں کے محاکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمایوں اشرف نے بہار اسکول سے وابستہ سہیل عظیم آبادی کے ریڈیو ڈرامے ،شین مظفر پوری، وہاب اشرفی، منظر کاظمی، انور امام، رحمان شاہی، اختر آزاد اور کہکشاں پروین کے متون کے تجزیے جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب میں اہم یہ نہیں کہ کون پہلے سے بڑا شاعر یا افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ بڑائی تب ظاہر ہوتی ہے جب ہمایوں اشرف جیسا نقاد ان پر توجہ دے اور ان کے متون کا خلوص اور متانت کے ساتھ مطالعہ کرے۔

ہمایوں اشرف نے بہار اسکول کے بعض ان افسانہ نگاروں کو بھی اپنی تخلیقی قرات کا حصہ بنایا ہے جن پر کسی حد تک گفتگو ہوتی رہی ہے جیسے غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، شفیع مشہدی نیز اس کتاب میں منٹو کی ناول نگاری پر ہمایوں اشرف کا مضمون بھی ہمارے لیے نیا ہے۔ان فکشن نگاروں کے علاوہ انہوں نے قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس کے حوالے سے بھی اپنا تجزیاتی مضمون اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ وہ فن پاروں کی جانچ پڑتال کے وقت ترقی پسندوں کی طرح مصنف کے ذہن اور ان کے اپنے طبقے پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ چاہے وہ قرۃ العین حیدر کا مطالعہ کر رہے ہوں یا غیاث احمد گدی کے افسانوں کا مطالعہ تقابل اور موازنے کے اسلوب کو نہیں بھولتے جو ادبی تنقید کا ایک اہم اصول رہا ہے۔

وہ ترقی پسند نقادوں کی طرح فن پاروں میں استحصالی نظام کے تجزیے اور طبقاتی کشمکش سے متعلق توضیح وتشریح کے تناظر میں معنی تلاش کرتے ہیں اور افسانوں کے ان کرداروں کو تجزیے کے عمل سے گزارتے ہیں جن کے ذریعے معاشرے کے بورژوا طبقے کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا جا سکے لیکن اتنا ہی نہیں وہ نام نہاد ترقی پسند نقادوں سے آگے جا کر کسی بھی متن مثلاً قرۃ العین حیدر کے افسانے ہوں یا غیاث احمد گدی یا الیاس کے افسانے ہوں یا کسی بھی افسانہ نگار کے متن سے متعلق رائے قائم کرنے سے پہلے اس متن کی سابقہ جملہ قراتوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور اپنی قرات کی توثیق کرتے ہیں یا اس کی تنسیخ کرتے ہوئے اپنی قرات کے ذریعے سابقہ تنقیدی رایوں کو پلٹ دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ایک ایماندار ناقد اسی طرح سے اپنے پڑھنے والوں کے ذہن اور اس کے حافظے میں معلومات کا ایک خزانہ بھر دیتا ہے۔ بعض فکشن نگاروں کے فن کو جن بنیادوں پر کمزور قرار دیا جاتا رہا ہے یا ان پر کسی غیر ضروری قسم کے اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں ان اعتراضات کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے ہمایوں اشرف نے ان کا دفاع کرنے کے بجائے اس کی اصل وجہ تلاش کر کے قاری کے سامنے رکھ دی ہے۔ مثلاً 'علی پور کا ایلی' جیسے ناول کو جنسیات کے حوالے سے لتاڑا گیا ہے لیکن ہمایوں اشرف کے نزدیک یہ موضوع کا مطالبہ ہے۔ ہمایوں اشرف نے اپنی اس کتاب میں افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، ڈراما نگاروں اور فکشن کے نقادوں مثلاً وارث علوی، گوپی چند نارنگ اور عظیم الشان صدیقی کے علاوہ اپنے ایک مضمون 'منٹو اپنے معاصرین کی نظر میں' میں ابوسعید قریشی، محمد حسن عسکری، عبادت بریلوی، ممتاز شیریں، ڈاکٹر محمد حسن، مظفر علی سید وغیرہ کا محاکمہ جس تنقیدی ژرف نگاہی سے کیا ہے اس کی داد انھیں ضرور ملے گی۔ ہمایوں اشرف کے پسندیدہ افسانہ نگار دراصل منٹو ہی ہیں اور اس کتاب میں منٹو کے حوالے سے چار مضامین شامل ہیں یہ اس امر کا بین ثبوت ہے۔ ہمایوں اشرف کے تجزیے وتنقیدی رویے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمایوں اشرف اچھی کہانی کے اوصاف، کہانی کہنے کی شعریات، بیانیہ جمال کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد فکشن کے اسالیب میں در آئی تبدیلیوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ہمایوں اشرف کا اسلوب انتہائی آسان، سہل رواں اور مطمئن کرنے کے ساتھ متاثر کرنے کا وصف بھی رکھتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے پوری کتاب میں کسی طرح کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے اور خود کو ایک عام قاری کے روپ میں پیش کیا ہے۔امید کی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب وقت کے بدلتے سروں کے ساتھ خود کو زندہ رکھے گی۔

تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ : ایک تحقیقی مطالعہ

تصنیف: خوشتر نورانی

صفحات: 256، قیمت: 250 روپے،

سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

مبصر: نورین علی حق

(کاپی ایڈیٹر: اردو نیوز چینل، دوردرشن، نئی دہلی

تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ معروف ناقد و محقق مولانا خوشتر نورانی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔خوشتر نورانی کی اس سے قبل بھی کئی اہم تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ کسی موضوع کی گہرائی تک پہنچ کر دوسرے موضوع کی تلاش اور تحقیق سے تحقیق کے در وا کرنا مولانا کا شغل ہے اور یہ جملہ برائے جملہ نہیں ہے، نہ ہی کسی کی نثری قصیدہ خوانی ہے۔اس بات کا ادراک کسی بھی قاری کو ان کی تصانیف کے مطالعے سے بآسانی ہو سکتا ہے۔

ان کی نئی کتاب تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ دراصل علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات کی توسیع ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اور تحریک جہاد کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ گوکہ ایک طرف فرد واحد ہے تو دوسری طرف افراد کا مجموعہ۔ لیکن بعد میں دونوں کو دو گروپوں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔اس صورت حال سے تحقیقی دنیا کو باہر لانے کی خوشتر نورانی نے کامیاب کاوش کی ہے۔انھوں نے جہاں علامہ فضل حق خیرآبادی پر اہم تحقیق پیش کی تو تحریک جہاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریک جہاد سے متعلق کتابیں کافی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں۔اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا نام اہمیت کا حامل ہے، جنھوں نے اپنی پوری توانائی اس موضوع پر صرف کی اور وہ اس تحریک کو جس مقام پر پہنچانا چاہتے تھے، وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

مولانا خوشتر نورانی کی کتاب تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعے نے وہ سب کچھ کر کے دکھا دیا، جو اب تک نہیں ہو سکا تھا۔انھوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد صرف ان کتابوں کو نہیں بنایا، جو تحریک جہاد سے اختلاف کی بنیاد پر لکھی گئی تھیں۔ یہ کتاب اس موضوع سے متعلق تمام ممکنہ وسائل سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اس نتیجے تک پہنچتی ہے کہ تحریک جہاد کا بنیادی مقصد سکھوں سے زور آزمائی تھا۔البتہ سکھ حکومت کے برٹش حکومت میں انضمام کے بعد چند جھڑپیں انگریزوں سے بھی ہوئیں۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں خوشتر نورانی کو تین سال کا عرصہ لگا اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ خوشتر نورانی کا تحقیقی رویہ پوری طرح غیر جانب دار اور حقائق پر مبنی ہے۔اس میں کسی عصبیت اور مسلکی خلش کو کہیں دخل نہیں ہے۔

یہ کتاب تحقیق کے تمام تر اوصاف سے متصف ہے، اس کو گراں قدر علمی حواشی، اشاریے ضمیمے اور کتابیات سے مزین کیا گیا ہے۔مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتابوں کے علاوہ خال خال ہی اردو کی کتابوں میں اشاریہ سازی کا التزام کیا جاتا ہے۔اس کتاب میں تحقیق کے ہر اس طریقہ کار کو اختیار کیا گیا ہے، جس کے ذریعے کتاب درجہ استناد حاصل کر سکے۔ خوشتر نورانی نے اشاریہ سازی کر کے مخالفین وموافقین دونوں کی دشواریوں کو سہل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا بہت ہی قیمتی حصہ (باب) 'ایک اہم قلمی مخطوطے کی بازیافت' ہے۔ دراصل سید احمد رائے بریلوی کے مرید اور معروف عالم دین مولانا سید محبوب علی دہلوی کی 924 صفحات میں عربی زبان میں نایاب قلمی کتاب تاریخ الائمۃ فی ذکر خلفاء الامۃ کی مصنف نے بازیافت کی ہے، یہ قلمی مخطوطہ 1835 کا ہے اور اب تک اس تحریک کی تاریخ نویسی میں کسی مؤرخ نے اس سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ مصنف نے پہلی بار اس کو علمی دنیا سے متعارف کراتے ہوئے تحریک سے متعلق اس کے اُن 20 صفحات پر مشتمل عربی متن کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے نقل کیا ہے، جن میں محبوب علی صاحب نے تحریک جہاد کے سلسلے میں کلام کیا ہے۔ تحریک جہاد کی تاریخ میں مولانا دہلوی کی یہ تحریر انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس باب میں مذکورہ مخطوطے کی بازیافت اور اس کے متن پر تفصیلی محاکمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ ان چند صفحات سے قاری کو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ تحریک جہاد کس طرح اپنے مقاصد سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ 256 صفحات پر مشتمل کتاب 'تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ: ایک تحقیقی مطالعہ' سید احمد رائے بریلوی سے متعلق تمام غلو پسندانہ اور عقیدت مندانہ تواریخ پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر جانب دارانہ، حقائق سے لبریز، سید صاحب کے حقیقی جہد مسلسل کا اعتراف کرنے والی کتاب کا ہندوستان و پاکستان کے مورخین و مصنفین کس طرح استقبال کرتے ہیں۔

متھلانچل اردو (بہار کی ایک نئی بولی کا لہجہ)

مصنف: محمد جہانگیر وارثی

صفحات: 80

مبصر: سلمان عبدالصمد

N-106 فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

میتھلی مشرقی ہندوستان کی ایک قدیم زبان ہے، جو شمالی بہار کے اکثر علاقے اور مغربی بنگال و نیپال سے ملحق چند علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ بہار کے متعدد اضلاع میں یہ زبان متاثر ہوئی ہے اور علاقائیت کے اثرات اس پر مرتب ہوئے۔ یہ زبان سب سے زیادہ دربھنگہ، سمتی پور، مظفر پور، سیتا مڑھی، بیگوسرائے اور مدھوبنی میں متاثر ہوئی۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر ایم جے وارثی نے ان اضلاع میں متاثر ہونے والی میتھلی زبان کو ایک نیا نام 'میتھلی اردو' دیا ہے اور اس کے اسباب و علل پر بھی گفتگو کی ہے کہ آخر یہ نام کیوں دیا جا رہا ہے۔ جن علاقوں میں میتھلی کا بول بالا ہے، ان کو ترہت یا متھلا کہا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم میں اسے 'ودیہہ' کہتے تھے۔ جیوتر شیور ٹھاکر اور ودیا پتی دو ایسے بڑے نام ہیں، جو ابتدائی اور سنہرے دور کے میتھلی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زبان میں فکشن کا بھی سرمایہ موجود ہے اور شاعری کا بھی، اسی طرح اس زبان کے جاننے والوں نے ڈرامہ کے میدان میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ میتھلی ڈرامہ کا فروغ بہار کے مذکورہ علاقوں کے علاوہ نیپال میں فروغ پایا ہے۔ متعدد سماجی و سیاسی اسباب کی بنا پر نیپال کے راجاؤں نے میتھلی ہی کو اپنی تہذیبی اور شاہی زندگی کی زبان قرار دیا۔ 1500 سے تقریباً 1768 تک کے عرصے میں مل راجاؤں نے ہر مبارک موقع پر یکے بعد دیگرے متعدد ڈرامے لکھے اور انھیں برابر اسٹیج کراتے رہے۔

ڈاکٹر وارثی نے 'میتھلانچل اردو' نامی کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے، جس کا ترجمہ آئندہ چند مہینوں میں منظر عام پر آجائے گا۔ ڈاکٹر وارثی کے ذریعے کی جانے والی نئی زبان کی شناخت ہم سب کے لیے ایک خوش آئند خبر ہے۔

ڈاکٹر وارثی میتھلی اردو کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''چونکہ میری تربیت لنگوسٹک میں ہوئی تھی، اس لیے زمانہ طالب علمی سے ہی میرے دل میں یہ سوال ہمیشہ رہتا تھا کہ شمالی بہار کے کچھ ضلع جیسے، دربھنگہ، سمستی پور، مدھوبنی، مظفر پور اور بیگوسرائے کے اقلیتی مسلم کمیونٹی جو زبان بولتے ہیں وہ اس علاقے میں بولی جانے والی عام بول چال کی زبان 'میتھلی' سے بالکل مختلف ہے۔ اس بولی کا نہ تو اپنا کوئی رسم الخط ہے اور نہ ہی کوئی تحریری ادب۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زبان کا علم رکھنے والوں کی توجہ اب تک اس طرف نہیں گئی۔ جب جب میں اپنے گاؤں جاتا ہوں اور لوگوں سے بات کرتا ہوں تو میرے دل میں ایک عجیب سی بے چینی رہتی ہے، کیونکہ مجھے خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کس زبان میں بات کر رہا ہوں۔ کئی برسوں سے اپنے ملک سے دور واشنگٹن یونیورسٹی میں رہتے ہوئے ہمیشہ سوچتا رہا کہ آخر اس زبان کی ساخت اور پیدائش کس طرح ہوئی۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید میتھلی کی ہی ایک الگ شکل ہے۔ لیکن جب میں نے اس 'نئی زبان' کا میتھلی، ہندی اور اردو سے تقابلی مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس زبان کے عمل کی ساخت میتھلی، ہندی اور اردو سے الگ ہے لیکن الفاظ کے انتخاب استعمال میں اردو کے قریب ہے۔ اسی لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ شاید اردو کی ہی ایک مختلف 'زبان' ہے۔ اس بولی کی ساخت مختلف ہے۔ مثلاً ہندی جملہ: ہم خبریں سن رہے ہیں۔ میتھلی جملہ: ہم خبریں سوئن رہل چھی۔ اردو جملہ: ہم خبر سن رہے ہیں۔ نئی زبان: ہم خبر سن رَہلیے ہے۔'' ڈاکٹر وارثی کے اس وضاحتی انداز سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیش نظر کتاب میں کیا کیا بحث ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی اس باریک بینی اور بیدار مغزی سے ان کی لسانی فہم و فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت سہی کہ آج میتھلی اردو میں تحریری کوئی سرمایہ موجود نہیں ہے، مگر ڈاکٹر وارثی نے جس انداز سے میتھلی اردو کی صوتیات سے بحث کی اور چند قاعدے بیان کیے ہیں، ان سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب تحریری سرمایہ بھی میتھلی اردو میں موجود ہوگا۔ ڈاکٹر وارثی موجودہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ ایم جے وارثی کو واشنگٹن یونیورسٹی کی طرف سے 2011-2012 کے جیمس ای میلکیا ڈ فیکلٹی ایوارڈ دیا گیا ہے، یہ ایوارڈ خاص طور پر ان کو دیا جاتا ہے جنھوں نے یونیورسٹی کے طالب علموں میں تعلیمی تجربات کو مثبت طور پر متاثر کیا ہو۔ 2000 میں ڈاکٹر وارثی کو مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ، 2003 میں فری مین فاؤنڈیشن گرانٹ، 2005 میں برکلے یونیورسٹی کی طرف سے ٹیچنگ ایوارڈ اور سال 2007 میں مشہور 'گلور آف انڈیا' ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔ سال 2010 میں امریکہ کے جنوبی ایشیا لنگویجز ریسرچ سینٹر کی طرف سے ان کو جنوبی ایشیائی زبانوں کا نصاب تیار کرنے کی اہم ذمے داری دی گئی تھی۔ 27 مئی 2012 کو لکاتا میں منعقد بہار صدی تقریب میں 'بہار گورو سمان' اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر وارثی کی تصنیفات میں 'میتھلی اردو' ایک اہم اضافہ ہے، کیونکہ کسی نئی زبان کی شناخت غیر معمولی کام ہے، سرسری طور پر کتاب کے موضوعات کی فہرست یا ابواب اس طرح تیار کیے جاسکتے ہیں۔ چار ابواب پر یہ کتاب مشتمل ہے، پہلے باب میں قواعدی صوتیات (Phonology) سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں صرفی قواعد (Morphogy) کی تصریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تیسرے باب میں نحوی (Syntax) بحث ہے اور آخری باب نمونہ نصوص (Sample texts) پیش کیے گئے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں جن موضوعات کو پیش کیا گیا ہے، ان سے میتھلی اردو کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کا دائرہ وسیع ہوگا، نہ کہ صرف ہندوستان میں بلکہ کتاب کے انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے دوسرے ممالک میں بھی اس زبان کے تئیں دلچسپی بڑھ سکتی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر وارثی کی یہ کاوش بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اس کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کے اردو ترجمہ کا قارئین کو انتظار رہے گا۔

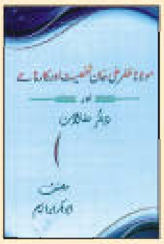

مولانا ظفر علی خان شخصیت و کارنامے اور دیگر مقالات

مصنف/ ناشر: ابوبکر ابراہیم

صفحات: 175، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت 2013

مبصر: ابراہیم نثار،

بی ایڈ، ایم اے، جمال پورہ، مئوناتھ بھنجن 275101

زیر نظر کتاب مولانا ظفر علی خان شخصیت اور کارنامے اور دیگر مقالات کے مصنف جنا ابوبکر ابراہیم عمری صاحب ہیں۔ ان کا تعلق سرزمین مدراس سے ہے اور یہ سرزمین درس و تدریس کے لیے معروف و مشہور ہے۔ دراصل جامعہ دارالسلام عمر آباد میں طالب علمی کے دوران لکھے گئے مضامین کو انھوں نے ایک کتابی شکل دی ہے۔ بظاہر اردو زبان و ادب تنقید و تحقیق سے ان کا عمیق رشتہ رہا ہے۔ بچپن سے پڑھنے لکھنے کے شوق نے حوصلہ افزائی کی جس کا تحفہ ہمارے سامنے موجود ہے۔

کتاب مولانا ظفر علی خان شخصیت اور کارنامے میں چھ حصے ہیں اور سب سے پہلے حصے میں مولانا ظفر علی خان کی شخصیت اور کارنامے کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ پیدائش ابتدائی تعلیم کے زمانہ علی گڑھ کا ذکر بڑے پراثر انداز میں کیا ہے۔ مولانا کے معمولات، حالات و اطوار، رفاقت، صحافت، خطبات، شاعری، طنز نگاری اور خاص ان کی سیاسی رہنمائی کا بڑے اچھے انداز میں جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد سید احمد شہید کی نمایاں دعوتی خدمات اور ان کی امتیازی خصوصیات کو مرتب کیا ہے اس مضمون میں سب سے پہلے مختصر طور پر مقدمہ لکھا ہے اور ان کے کارنامے کو الگ فصل میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں سید احمد شہید کی پیدائش ابتدائی تعلیم اور وفات کو لکھا ہے۔ دوسری فصل میں ان کی دعوتی خدمات کو پرکشش انداز میں لکھا ہے، ان میں وعظ 'ارشادات' دعوت و اصلاح کو بیان کیا ہے اور تیسری فصل میں دین کی اشاعت کے سلسلے میں بنارس اور لکھنؤ کے قیام کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ تحریری دعوت کو بھی پیش کیا گیا ہے اور آخری فصل میں سید احمد شہید کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ ہے۔

اسلامی اخوت کے نام سے تیسری حصے کا آغاز ہوتا ہے جو کہ اس کتاب کا بہت ہی اہم اور جامع باب ہے جس میں مصنف نے اسلامی بھائی چارگی، سماج و معاشرہ اور محمدؐ کے زمانے کے معاشرہ کو بڑے اچھے انداز میں مرتب کیا ہے اور اس میں تمام اسلامی ممالک کے معاشرہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھا حصہ حدیث اور مستشرقین کے حوالے سے ہے جبکہ پانچواں ہندوستان کی موجودہ اسلامی تحریک اور چھٹا انسان اور فرشتہ کی تلخیص پر مبنی ہے۔

آخر میں اردو ادب کے حوالے سے محمد منشایاد اور ان کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں مصنف نے ان کی افسانہ نگاری، کردار، پلاٹ، منظر کشی، ڈرامہ نگاری پر تنقید و تحقیق کیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مضمون ہے مولانا ثناء اللہ عمری کی خاکہ نگاری کے سلسلے میں مضمون ہے اور اس مضمون میں مصنف دیگر خاکہ نگاروں کی روشنی میں مولانا کی خاکہ نگاری کا موازنہ کیا اور حوالوں کے ذریعے سے ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک خاکہ نگار کے لیے کسی شخصیت پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے کیا کیا اصول ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں علامہ اقبال کے خطوط بنام شمس العلماء شاطر مدراسی کے نام سے ہے اس میں علامہ اقبال کے تمام خطوط کو جمع کیا ہے۔ ان خطوط میں اقبال نے شاعری کی تنقید و تحقیق کے سلسلے میں گفتگو کی ہے۔

زیر نظر مصنف کی یہ کتاب ان چند نامور شخصیات اور تحریکات کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان بہت ہی آسان اور عام فہم ہے۔ انھوں نے ہر مضمون کے شروع میں تعداد اور آخر میں خلاصہ کلام پر مضمون کو ختم کیا ہے اور تقریباً ہر مضمون کا اختتام اشعار پر کرتے ہیں اور اس کتاب کو دیکھنے کے بعد کوئی بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے۔ یہ مصنف کی کامیابی کا راز ہے۔

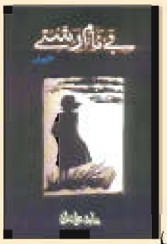

بے نام رشتے

مصنف: عابد علی خان

صفحات: 128، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد اشرف محمد یاسین روم نمبر 102، ہاسٹل جامعہ اسلامیہ سنابل، نئی دہلی

افسانوی مجموعہ 'بے نام رشتے' پہلے بھی عابد علی خان کی دو کتابیں 'کوشش' (بچوں کی کہانیوں پر مشتمل) اور 'خوابوں کی خوشبو' (افسانوں پر مشتمل) شائع ہو کر ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن 128 صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق کل 13 افسانے ہیں۔

افسانہ نگار عابد علی خان پیشے سے کمپیوٹر ڈزائنر ہیں لیکن انھوں نے تخلیقی اعتبار سے صفحہ قرطاس پر نفسیاتی ڈیزائن بھی کر ڈالی ہے ان کے اس افسانوی مجموعے میں ہمیں تقریباً زندگی کے عنوانات سے متعلق سارے ہی پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ خواہ وہ اخلاقی ہوں، سماجی، ہوں، معاشرتی ہوں، وطنی ہوں، نفسیاتی ہوں، مذہبی ہوں، تہذیبی و ثقافتی ہوں، وراثتی ہوں یا پھر جنسی۔ ہر موضوع پر وہ سنجیدگی اور ثابت قدمی سے اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چونکہ فکشن کی ایک اہم صنف سماجی حقیقت پسندی بھی ہے، جس میں کردار اور اس کے افعال قاری کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہوگا۔ اس وقت بیشتر افسانے جو لکھے جا رہے ہیں وہ سماجی حقیقت پسندی کے ہی عکاس ہیں۔

عابد علی خان نے 'بے نام رشتے' کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ "میرا ہر افسانہ انسانی شخصیت کی ایک الگ تصویر پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور انسان کو انسان سے جوڑنے کا درس دیتا ہے" عابد علی خان کی اس بات کی عکاسی ان کی کتاب کے پہلے ہی افسانے 'ایک زخم اور سہی' میں نظر آتی ہے۔

ایک گھریلو عورت کی نفسیاتی زندگی کو انھوں نے اپنے افسانہ 'دروازہ ابھی کھلا ہے' میں استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے جبکہ انھوں نے ایک عام انسان کی زندگی اور اس کی ٹوٹتی بکھرتی تمناؤں کو 'سپنوں کا محل' میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے کیونکہ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ کمسنی میں کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن سے کوئی تعلق نہ ہو تب بھی وہ اپنے ہو جاتے ہیں جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے کہ "بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے نہیں ہوتے ہیں نہ ہی زندگی بھر ہمارا ان سے کوئی رشتہ ہوتا ہے پھر نہ جانے کیوں وہ عمر بھر ہمارے ذہن پر چھائے رہتے ہیں اور تا عمر ہزار کوششوں کے باوجود ہم انھیں بھلا نہیں پاتے۔" (ص 72)

زیر نظر مجموعے کے بقیہ افسانے بھی قابل فہم اور قابل مطالعہ ہیں جو ہر پڑھنے والے کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسلم جمشید پوری "عابد علی خان کی کتاب 'بے نام رشتے' کے افسانے ایسے ہیں جو آپ سے کچھ کہتے ہیں۔ ان میں آپ کو اپنا بنا لینے کا جذبہ ہے۔ ان کے افسانوں کا کردار ہمارے آس پاس کا انسان ہے۔ اکثر عابد علی خان کردار کے اندر سما جاتے ہیں اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ کردار حقیقی ہیں یا افسانہ نگار اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے۔

المختصر 'بے نام رشتے' افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جسے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ ■

عالمی اردونامہ

14 جون، 2014 ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی میں معروف شاعرہ، مصورہ اور ادیب، پروین شیر کی نئی دولسانی (اُردو-انگریزی) کوفی ٹیبل کتاب کی تقریب ہوئی۔ اس سے قبل اس کتاب کا اجرا کنیڈا کے مشہور مکنالی رابنسن (McNally Robinson) کتب فروش نے وِنی پیگ میں بتاریخ 27 اپریل 2014 کیا تھا اور یہ کتاب Best Sellers کی فہرست میں آ گئی تھی۔

روس کی پروفیسر ڈاکٹر لڈمیلا وسی لی ایوا، (جو روسی زبان کے علاوہ اُردو زبان کی بھی بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر ہیں)، فروغ اُردو ماسکو، ہندوستانی شعبۂ علم لسان، نامور محقق، مشرقی تعلیمی ادارے، اور روسی اکیڈمی آف سائینس ماسکو میں ادب کی معروف پروفیسر ہیں۔ فیض احمد فیض پر ان کی معلوماتی تصنیف 'پرورش لوح و قلم فیض: حیات اور تخلیقات' اُردو ادب کے لیے ایک اہم اضافہ ہے۔ اُردو زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف حکومت پاکستان نے کرتے ہوئے انھیں 'ستارۂ امتیاز' کا اعزاز عطا کیا۔

ڈاکٹر لڈمیلا کے بعد پروفیسر نتالیا کووٹون (Natalia Kovtoun) نے پروین شیر کا بھرپور تعارف پیش کیا اور پھر ڈاکٹر لڈمیلا نے کتاب 'چند سیپیاں سمندروں

اُردو میں گفتگو کر رہے تھے۔ روس کے ممبر پارلیامنٹ، جناب گناڈی اوڈیو (Genady Avdeev) اور ان کی بیگم محترمہ لڈمیلا اوڈیوا (Ludmila Avdeeva) بھی موجود تھیں۔ بیگم لڈمیلا اوڈیوا ایک معروف روسی شاعرہ ہیں۔ انھوں نے اپنا شعری مجموعہ (Betep Ctpahctbuu) پروین شیر کو پرخلوص تحریر کے ساتھ دیا۔ ڈاکٹر لڈمیلا خوخلووا (Ludmila Khokhlova) جو ایشین افریقن تعلیمی ادارے سے منسلک ہیں، کو ماسکو اسٹیٹ لائبریری کے لیے اور ماریا خیت سیوا (Maria Khaytsva)، جو

IAAS ماسکو اسٹیٹ یونیورسیٹی اور پاکستان سوسائیٹی ماسکو نے مل کر اس تقریب کا انعقاد کیا۔ یہ تصنیف 'چند سیپیاں سمندروں سے' اُن احساسات کا فلسفیانہ اظہار ہے جو پروین شیر نے ساؤتھ افریقہ، سوآزی لینڈ اور پیرو (ساؤتھ امریکہ) کے اسفار کے دوران محسوس کیا تھا۔ ساؤتھ امریکہ کی قدیم انکا تہذیب Inca civilization اور ساؤتھ افریقہ کے ہولناک اپارٹ ہائیڈ کی داستان ان کے قلم اور موقلم سے ادا ہوئی ہے۔ یہ تقریب ماسکو اسٹیٹ یونیورسیٹی میں ہوئی اور اس کتاب کی شاندار عزت افزائی ہوئی۔ یہ قدیم یونیورسیٹی 1755 میں قائم کی گئی تھی۔ دنیا کی اس مشہور جامعہ میں چالیس ہزار طالب علم اور چھ ہزار اساتذہ ہیں۔ اس موقع پر معروف علماء، معزز افسران، مشرقی تعلیم کا ادارہ، روسی Humanitarian یونیورسیٹی، اور ماسکو اسٹیٹ یونیورسیٹی نے بھی حصہ لیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر لڈمیلا نے تمام معزز مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر لڈمیلا روسی اور اُردو زبانوں کی سے' کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس کو ایک بہت اہم تصنیف قرار دیا۔ اس کے علاوہ پروین شیر کے سابق شعری مجموعوں پر بھی گفتگو کی۔ پروین شیر نے اپنی خوش نصیبی کا اظہار کیا کہ اس تاریخی اور دنیا کی مشہور ماسکو اسٹیٹ یونیورسیٹی نے انھیں یہ اعزاز بخشا۔ انھوں نے اپنی شاعری، مصوری اور نثری تخلیقات کے محرکات کے متعلق باتیں کیں۔ اپنے پرانے خواب کے حقیقت ہو جانے کا ذکر کیا کہ وہ لیوٹولسٹوئے Leo Tolstoy، پشکن Alexander Pushkin، چیخوف Anton Chekhov اور پاسٹرنیک Boris Pasternak جیسے عظیم شعرا اور ادبا کی سرزمین پر قدم رکھ سکیں۔ ان کے لیے پشکن شہر (جو سینٹ پیٹرس برگ سے 24 کیلومیٹر کی دوری پر ہے) میں اُس کے مجسمہ کو چھو لینا خواب نما حقیقت تھی۔ حاضرین محفل کے اصرار پر پروین شیر سے اُن کی نظمیں اور غزلیں سنی گئیں جو بے حد پسند کی گئیں۔ اس تقریب میں اُردو ادب کے روسی طلبا موجود تھے جو بہت دل چسپی اور انہماک سے سن رہے تھے اور

روسی ریاستی کتب خانے (Russian State Library) کی ڈپٹی ہیڈ ہیں، کو پروین شیر نے اپنی کتاب پیش کی۔ ماسکو اسٹیٹ یونیورسیٹی کی لائبریری روس کے سب سے بڑے کتب خانوں میں سے ایک ہے جہاں 9 ملین کتابیں ہیں جن میں 2 ملین غیر ملکی زبانوں کی ہیں۔

محترمہ آئی رینا میکسی مینکو (Irina Maksimenko)، ریڈیو ساؤتھ ایشین سیکشن 'Voice of Russia' کی سربراہ (Head) نے پروین شیر کی گفتگو ریڈیو ماسکو کے لیے ریکارڈ کی۔ ریڈیو ماسکو دنیا کا سب سے پہلا بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشن ہے۔ دوران گفتگو پروین شیر نے خصوصاً اس بات پر اس خوشی کا اظہار کیا کہ روس کی کچھ نئی پود اُردو تعلیم حاصل کر رہی ہے اور یہ دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ یہ نوجوان روسی طلبا اُردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ دوران طعام پس منظری موسیقی کے لیے پروین شیر کے ستار کی CD آن تھی اور ان کی مصوری کی کچھ پرنٹس کا مظاہرہ ہوا جنھیں بہت سراہا گیا۔

پریس ریلیز، پروین شیر، کناڈا، 3 ستمبر 2014

محمد صبیح الدین بزم اردو قطر کے چیئرمین منتخب

قطر: قطر کی قدیم ترین (قائم شدہ 1959) اور اہم اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر نے معروف محبِ اردو علمی و ادبی شخصیت جناب محمد صبیح بخاری کو چیئرمین منتخب کیا ہے۔ بزمِ اردو قطر کے صدر جناب شادا کولوی اور جنرل سکریٹری جناب افتخار راغب نے تمام اراکینِ بزم کے اتفاقِ رائے سے بزم کے فعال سرپرست سید عبدالحی و ڈاکٹر فیصل حنیف کے باہمی اتفاق سے محمد صبیح بخاری کو چیئرمین منتخب کرلیا گیا۔ بزم نے اراکین کی ایک میٹنگ 15 اگست کو بلائی اور طے کیا کہ بزمِ ماہانہ طرحی و غیر طرحی مشاعروں اور سیمینار کے علاوہ ہر چار ماہ میں ایک شام ایک شاعر/ادیب کے نام، سالانہ بیت بازی، اردو کانفرنس، ایک کلاسیکی شاعر/ ادیب کا تعارفی پروگرام، تمثیلی مشاعرہ، بچوں میں پینٹنگ مقابلہ اور مشاعرے کا اہتمام کرے گی۔ بزم کے نئے چیئرمین جناب محمد صبیح بخاری نے اردو کے دائرے کو وسیع کرنے اور نئے افراد کو جوڑنے کو سراہا اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دامے درمے قدمے سخنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ بزمِ اردو قطر خلیج کی ایک فعال اور قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم ہے جو 1959 سے ادبی خدمات انجام دے رہی ہے۔ ماہانہ طرحی مشاعرے اور دیگر ادبی نشستوں کے علاوہ کئی دہائیوں سے بزم نے نامور شعرا و ادبا پر سالانہ مشاعرے کے ساتھ کئی عالمی سیمینار منعقد کیے ہیں جن میں میر تقی میر، علامہ اقبال، مرزا غالب، امیر خسرو، میر انیس، اکبر الہ آبادی، الطاف حسین حالی، ابراہیم ذوق، نظیر اکبر آبادی اور بہادر شاہ ظفر سیمینار شامل ہیں۔ بزمِ اردو قطر کا نعرہ ہے ''اردو لکھیے، اردو پڑھیے اور اردو بولیے۔'' اس موقعے پر صدرِ بزم جناب شادا کولوی نے کہا کہ بزم کو پورا یقین ہے کہ جناب محمد صبیح بخاری کی چیئرمین شپ میں بزم ترقی کی نئی منزلیں طے کرے گی۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 22 اگست 2014

بہادر شاہ ظفر کا مزار

ینگون: میانمار کی سابق راجدھانی ینگون کی فوجی چھاؤنی میں مغل سلطنت کے آخری فرمارو ا بہادر شاہ ظفر کی قبر پر باقاعدگی سے چراغ جلانے کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ ینگون کی چھاؤنی کے آس پاس رہنے والے اور کام کرنے والے لوگ قبر سے متصل مسجد میں پابندی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور جمعہ کو تو اتنا مجمع ہو جاتا ہے کہ پوری مسجد بھر جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو اپنی زندگی ہی میں اس بات کا احساس ہو گیا تھا ان کو کوئے یار میں دو گز زمین بھی نہیں ملے گی، لیکن ان کو شاید یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ان کی قبر وطن سے تین ہزار میل دور بننے

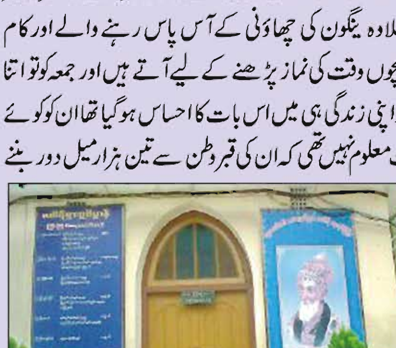

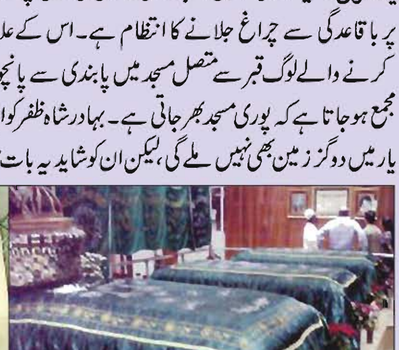

کے باوجود بے نور نہیں رہے گی۔ ینگون میں دفن ہندوستان کے سب سے چہیتے اور ہر دل عزیز بادشاہ کی قبر کا انتظام دیکھنے کے لیے باقاعدہ طور پر ایک کمیٹی قائم ہے جس کو ہندوستان، پاکستان اور برما کی حکومت سے عطیات ملتے ہیں۔ گزشتہ روز ہندوستانی صحافیوں کے ایک وفد نے شاہ ہندوستان بہادر شاہ ظفر کے مزار پر گلہائے عقیدت پیش کیے۔ اس موقعے پر ینگون میں ہندوستانی سفارت خانے کے کچھ عہدے دار اور وزارت خارجہ کے افسران بھی موجود تھے۔ بہادر شاہ کی وفات ینگون چھاؤنی کے ایک کمرے میں 7 نومبر 1862 کو ہوئی تھی ان کے مزار کے پاس ان کی بیگم زینت محل کی قبر موجود ہے جن کا انتقال بہادر شاہ ظفر کی وفات کے 14 برس بعد 1886 میں ہوا تھا۔ مزار میں ایک تیسری قبر بھی ہے جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کی صاحب زادی کی قبر ہے۔ ظفر اور ان کے خاندان والوں کی قبر پر سبز رنگ کی چادریں پڑی رہتی ہیں جن پر پنجتن کے نام تحریر ہیں۔ قبر پر سرہانے کی طرف ایک تاج بنا کر بھی رکھا گیا ہے، مزار کے اردگرد شاہ ظفر اور ان کی بیگم کی وہ تصاویر بھی لگی ہیں جو قید کے دوران انگریز کیمرہ مینوں نے کھینچی تھی۔ مزار کا انتظام دیکھنے والے کمال الدین نے بتایا کہ ظفر کا اصلی مزار تہہ خانے میں ہے جہاں انگریزوں نے ان کو بہت خاموشی سے دفن کر دیا تھا اور برسوں تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہندوستان کا آخری حکمراں کہاں دفن ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اگست 2014

امریکہ میں افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری کو استقبالیہ

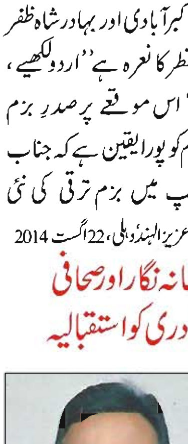

امریکہ: شوگر لینڈ (ہیوسٹن) کی معروف ادبی اور سماجی شخصیت جناب احتشام الدین ذکی کی رہائش گاہ پر 9 اگست بروز سنیچر کی شام ایک مخصوص اعزازی نشست کا اہتمام ہندوستان کی ریاست بہار سے امریکہ تشریف لائے ہوئے اردو کے نامور افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری کے اعزاز میں کیا گیا جس میں شوگر لینڈ کے ساتھ ساتھ ووڈلینڈ، اسپرنگ، ہیوسٹن، کیٹی، کامن ویلتھ اور ڈاؤن ٹاؤن سے کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس خصوصی نشست کی صدارت جناب شاکر نعمانی نے کی اور نظامت ڈاکٹر عرفان قدوس نے کی۔ اس موقعے پر سب سے پہلے ڈاکٹر عرفان قدوس نے ڈاکٹر سید احمد قادری کا حاضرین جلسہ سے تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے تین افسانوی مجموعے اور کئی تنقیدی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آکر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ قادری صاحب کی ایک تحقیقی کتاب 'اردو صحافت بہار میں' بہار کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے ڈاکٹر قادری کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ ان کی مقبولیت کا ہی یہ اثر تھا کہ ان کے ہیوسٹن آتے ہی یہاں کے اور نیویارک اور نیوجرسی وغیرہ کے اخبارات میں ان کی آمد کی خبریں پہلے صفحے پر شائع ہوئیں اور وائس آف امریکہ نے اپنے ایک خصوصی پروگرام میں آدھے گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا۔ اس تمہیدی تعارف کے بعد ناظم جلسہ نے ڈاکٹر سید احمد قادری سے گزارش کی کہ وہ امریکہ کے سفر کے تعلق سے اپنے تاثرات بیان کریں۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے سب سے پہلے تمام حاضرین جلسہ اور خاص طور پر جناب احتشام ذکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تفصیل سے اپنے سفر امریکہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہاں کی زندگی اور طرز رہائش سے بہت متاثر ہوا ہوں، اپنی مصروف ترین زندگی میں یہاں کے لوگ جس طرح اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے تشخص کے ساتھ زندگی کو گزارتے ہیں یہ ایک قابل تعریف پہلو ہے۔ اپنی جذباتی تقریر کے بعد حاضرین جلسہ کی فرمائش پر ڈاکٹر سید احمد قادری نے تہذیبی اقدار کے زوال پر مبنی اپنا بے حد معیاری اور خوبصورت افسانہ 'پت جھڑ' سنایا، جسے سن کر لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ جلسے کا اختتام جناب احتشام الدین ذکی کے شکریہ اور ان کی شاندار ضیافت کے ساتھ ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 اگست 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

مولانا خوشتر نورانی کی تصنیف "تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ" کی رسم رونمائی

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام 14 اگست کو ماہنامہ جام نور کے چیف ایڈیٹر اورمعروف ناقد ومحقق مولانا خوشتر نورانی کی اہم تحقیقی کتاب 'تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس خصوصی تقریب میں معروف فکشن رائٹر اورکولکاتہ کے چیف انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف، لسانی اقلیات کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام، دارالقلم کے بانی مولانا یاسین اختر مصباحی اوردہلی یونیورسٹی کے ڈپٹی پروکٹر ڈاکٹر محمد کاظم نے شرکت کی۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں سید محمد اشرف نے کہا کہ تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ سو سال بعد غیر جانب دارانہ انداز میں اس موضوع کو دیکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اس سے پہلے اس تحریک پر کام تو کافی ہوا لیکن کہیں نہ کہیں جانب دارانہ رویہ حائل رہا۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ خوشتر نورانی جس کام کو اپنے سر لیتے ہیں اس کا بھرپور حق ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب سے پہلے بھی وہ علامہ فضل حق خیرآبادی پر کام کر چکے ہیں۔ جس سے ہم سب مستفید ہوئے۔

اس کتاب کو لکھنے میں خوشتر نوارانی نے تاریخ اور تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ میں قاری محسوس کرے گا کہ اس کتاب کا مقصد تلاش حق ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا خوشتر نورانی کی تمام کتابیں اور مضامین اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن یہ کتاب لکھ کر خوشتر نورانی نے زلزلوں کی زمین پہ قدم رکھا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر حقائق پر توجہ دلائی ہے، آپ

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں خوشتر نورانی کی کتاب 'تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ' کا اجرا

ان کے کام سے مخالفت تو کر سکتے ہیں مگر نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ثابت کردیا ہے کہ معروضیت صرف دانش گاہوں میں ہی نہیں بلکہ مدارس میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ ایک تحقیقی مطالعہ مولانا خوشتر نورانی کی اب تک کی سب سے اہم کتاب ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر وافر مقدار میں کتابیں موجود ہیں اور دیگر مصنفین نے بھی اپنے اپنے انداز میں کام کیا ہے۔ مجھے اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کی جانب داری سے احتراز کیا گیا ہے اور سید احمد بریلوی اوران کی تحریک جہاد سے متعلق حقائق پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مولانا خوشتر نورانی کے محققانہ اور غیر جانب دارانہ اسلوب کی ہی کشش تھی کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ان کی کتاب علامہ فضل حق خیرآبادی :چند عنوانات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی تصانیف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی مقبول عام ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ خوشتر نوارانی اپنے تحقیقی کاموں کو آگے بڑھا رہے ہیں اور آثار یہ بتاتے ہیں کہ یہ دیر تک اوردور تک تحقیق کے میدان میں سفر کریں گے۔

یاسین اختر مصباحی نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب قدیم تاریخ کا اضافہ ہے، یہ موضوع نہایت اہم بھی ہے اور نازک بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ ابھی میں نے کتاب کے مندرجات دیکھے۔ عنوانات کافی اہم ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے کئی مضامین نظر سے گزر چکے ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی اہم ہے۔ اس کتاب سے تحقیق کے مزید گوشے وا ہوں گے کیونکہ جدید تحقیق کے تمام گوشوں کو اس میں برتا گیا ہے۔

کتاب کے مصنف مولانا خوشتر نورانی نے کہا کہ دراصل یہ کتاب علامہ فضل حق خیرآبادی :چند عنوانات کی تصنیف کا نتیجہ ہے چونکہ علامہ فضل حق خیرآبادی پر ورک کرتے ہوئے ہی مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اس موضوع پر بھی مسلکی اورجانب دارانہ رویوں سے ہٹ کر بڑا کام کیا جاسکتا ہے اوراس موضوع کے حوالے سے ہندوپاک کے محققین کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے جتنی دانش گاہیں اور لائبریریاں تھی میں نے وہاں سے استفادہ کیا ہے تاکہ حق ادا کیا جاسکے۔ میں نے کہیں تفریق بھی نہیں کی ہے اور سبھی جگہوں سے ماخذ حاصل کیا ہے۔

رسم رونمائی کے شرکاء حضرات میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، معید رشیدی، تالیف حیدر، مولانا ابرار مصباحی، محمد قاسم انصاری، محمد قاسم مصباحی، رحمان مصور، یامین انصاری، مولانا نورین علی حق وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 اگست 2014

بچوں کی دنیا کوئز مقابلے کی تقریب

اورنگ آباد: بچوں کی دنیا کوئز انعامی مقابلہ کے جلسۂ تقسیم میں مہاراشٹر کی وزیر مملکت برائے اسکولی تعلیم فوزیہ خان اور قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ہاتھوں انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس موقعے پر فوزیہ خاں نے کہا کہ 'بچوں کی دنیا' کوئز مقابلے میں لڑکیوں

کو انعامات، جلسہ میں لڑکیوں اور خواتین کی کثیر تعداد میں شرکت ہمارے معاشرے میں مثبت اور امید افزا تبدیلیوں کی غمازی کرتی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی معاشرے کی نشوونما اور پرورش کا آغاز ماں کی گود سے ہی ہوتا ہے۔ آج کا یہ مقابلہ یہ دیکھنے کے لیے ہی تھا کہ ان بچوں نے ابھی تک جو کچھ 'بچوں کی دنیا' میں پڑھا ہے اس کو جانچا جائے ان کی معلومات میں اضافہ اور قابلیت کو پروان چڑھایا جائے۔ 7000 ہزار بچوں کی اس مقابلہ میں شرکت ان کی ذہانت کو پروان چڑھانے کی کوشش ہے۔ ان کے سرپرست اور اساتذہ قابل مبارکباد ہیں۔ انھوں نے بچوں کی دنیا کے مہاراشٹر کے تقسیم کار مرزا عبدالقیوم ندوی کو مبارکباد دی۔ اس جلسے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے ڈائریکٹر بچوں کی دنیا، اردو دنیا، فکر و تحقیق کے ایڈیٹر خواجہ محمد اکرام نے اورنگ آباد کے بچوں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ کے شہر اور ریاست میں 'بچوں کی دنیا' سب سے زیادہ خرید اور پڑھا جاتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں دنیا کے کسی بھی ملک کے، کسی ایک شہر میں کسی رسالے کو یہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ میں اورنگ آباد کے بچوں اور ان کے سرپرستوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ دنیا میں بھر میں اردو کا کوئی رسالہ آج تک اپنی اشاعت میں اس تعداد تک نہیں پہنچا۔ جتنی تعداد میں 'بچوں کی دنیا' شائع ہو رہا ہے۔ آپ کی ریاست مہاراشٹر میں اس کی توسیع و فروخت کا سہرا آپ کے شہر کے مرزا عبدالقیوم ندوی کے سر ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے اعلان کیا کہ اورنگ آباد کے باشندوں میں مطالعہ اور اردو کتب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے اور یہاں کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی بنا پر میں یہاں قومی اردو کونسل کی جانب سے اردو کتب میلہ کا اعلان کرنے والا تھا لیکن آپ تمام کے ذوق کو دیکھتے ہوئے میں یہاں مہاراشٹر اسمبلی کے انتخابات کے فوری بعد 'تہذیبی میلہ' کے انعقاد کا اعلان کرتا ہوں۔ اس موقعے پر پروفیسر انیس چشتی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بچوں کی کثیر تعداد میں شرکت اور مقابلہ کی اس قدر کامیابی پر مرزا عبدالقیوم ندوی کو مبارکباد پیش کی۔ کوئز مقابلہ کے آرگنائزر، مرزا ورلڈ بک ہاؤس کے ڈائریکٹر اور مہاراشٹر میں 'بچوں کی دنیا' کے تقسیم کار مرزا عبدالقیوم ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس مقابلہ کی تفصیلات اور انعامات کے دیے جانے کے طریقہ کار سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ اس مقابلے میں 7000 بچوں نے حصہ لیا، جن بچوں نے 18 سوالات کے صحیح جوابات دیے انھیں اس قرعہ اندازی میں شامل کیا گیا ہے اور تمام انعامات قرعہ اندازی کے ذریعے دیے جارہے ہیں۔ اس جلسے میں جس میں 5000 ہزار کے آس پاس شرکا کی تعداد موجود تھی، دو اہم شخصیات کو ایوارڈس بھی پیش کیے گئے۔ ایک ایوارڈ دیہی علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کرنے والی شخصیت سید محی الدین حسینی، سلوڑ کو محسن اردو وعبدالعظیم ایوارڈ دیا گیا۔ دوسرے ابوبکر رہبر کو بہترین نظامت کا بیسٹ اینکر ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ جس اسکول سے سب سے زیادہ طلباء وطالبات نے اس مقابلہ میں شرکت کی یعنی 'النسا اردو پرائمری وہائی اسکول کو بیسٹ اسکول ایوارڈ اور ذوالفقار حسین ٹرافی دی گئی۔ جبکہ مقابلہ میں پہلا انعام سروش اردو ہائی اسکول کی طالبہ ریما ناز بنت محمد رؤف نے حاصل کیا۔ دوسرا انعام صائمہ فردوس بنت اسد پٹیل معین العلوم ہائی اسکول نے حاصل کیا۔ تیسرا انعام اقرا اردو اسکول کے طالب علم شازیب قادری ولد ادریس قادری کے حصہ میں آیا۔ چوتھا انعام سروش ہائی اسکول مٹمٹہ کی طالبہ سیدہ عائشہ بنت سید پاشاہ کو تفویض کیا گیا۔ انعام پنجم 104 الگ الگ طلبا کو دیا گیا جن میں مصفرہ ایمن بنت ساجد خان، سروش ہائی اسکول، سیدہ تبسم، بنت سید قیوم، ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن اور انعم بیگم بنت جہانگیر خان طلعت ہائی اسکول نے حاصل کیا۔ ان کے علاوہ 100 طلبا کو سال بھر 'بچوں کی دنیا' دنیا مفت اور 200 کو 6 ماہ کے لیے بچوں کی دنیا مفت، قرعہ اندازی کے ذریعے دیا جائے گا۔ ان میں سے کچھ ناموں کا اعلان جلسہ میں کر دیا گیا۔ بقیہ قرعہ اندازی کر کے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع کر دی جائے گی اور مزید 200 بچوں کو قرعہ اندازی کے ذریعے کتابیں ان کے اسکولوں میں پہنچائے جائیں گے۔ اس مقابلے کے تمام شرکا کو سرٹیفکیٹ ان کے اسکولوں میں پہنچائے جائیں گے۔ اس جلسے تقسیم انعامات کی صدارت روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز کے مدیر اعلیٰ شعیب خسرو نے کی جبکہ نظامت ابوبکر رہبر نے کی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 2 ستمبر 2014

حسن پور میں اردو عربی اسٹڈی سینٹر کا افتتاح

حسن پور: 10 اگست 2014 کو صوبائی وزیر کمال اختر کے دست مبارک سے اردو عربی اسٹڈی سینٹر کا افتتاح کیا گیا۔ یہ سینٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی نگرانی میں چلایا جاتا ہے۔ جو منسٹری آف ایچ آر ڈی کے تحت کام کرتا ہے۔ اردو عربی اسٹڈی سینٹر میں ایک سال کا ڈپلوما کورس کرایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر صوبائی وزیر کمال اختر نے طلبا وطالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کورس کے بعد آپ کو روزگار کے بہترین مواقع ملیں گے۔ ساتھ ہی اردو زبان جو ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ وزیر موصوف نے اس موقعے پر طلبا وطالبات کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات پیش کرتے ہوئے سینٹر کے انچارج شبن خان کو بھی مبارک باد دی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 اگست 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اردو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان

نئی دھلی: سپریم کورٹ نے اتر پردیش میں اردو کو سرکاری کام کاج کی دوسری زبان بنانے کے فیصلے پر اپنی مہر لگا دی ہے۔ عدالت عظمیٰ نے دوررس نتائج کے حامل اپنے تاریخی فیصلے میں کہا کہ اس ملک کے لسانی قوانین بے رحم اور سخت نہیں بلکہ لسانی غیر جانبداری کا ہدف

حاصل کرنے کے لیے کافی معتدل ہیں۔ چیف جسٹس آر ایم لوڈھا کی سربراہی والی پانچ رکنی آئینی بنچ نے یوپی ہندی ساہتیہ سمیلن کی اپیل پر اپنے فیصلے میں کہا کہ آئین میں ایسا کچھ نہیں ہے جو ریاست میں ہندی کے علاوہ ایک یا اس سے زائد زبانوں کے استعمال کے اعلان سے ریاستی حکومت کو روکتا ہو۔ آئینی بنچ نے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے والے، اتر پردیش سرکاری بھاشا (ترمیمی) قانون 1989 کو جائز اور درست قرار دیا۔ عدالت عظمیٰ کی مذکورہ بنچ کے مطابق کسی ریاست کی سرکاری زبان یا زبانوں سے متعلق آئین کی دفعہ 345 میں ایسا کچھ نہیں ہے جو ہندی کے علاوہ ریاست میں ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کو دوسری زبان بنانے کی راہ میں حائل ہو۔ بنچ کے دیگر اراکین میں جسٹس دیپک مشرا، جسٹس مدن بی لوکور، جسٹس کورین جوزف اور جسٹس ایس اے بوبڑے شامل تھے۔

سپریم کورٹ نے کہا کہ بہار، ہریانہ، جھارکھنڈ مدھیہ پردیش، اتراکھنڈ اور دہلی جیسی کئی ریاستوں نے ہندی کے علاوہ دوسری زبان کو بھی سرکاری کام کاج کی زبان کے طور پر استعمال کرنے کا درجہ دیا ہے اور انھیں تسلیم کیا ہے۔ عدالت نے کہا کہ اگر آئین اس کی اجازت نہیں دیتا تو یہ ممکن نہیں تھا۔ دہلی میں ہندی کے علاوہ اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آئینی بنچ نے کہا کہ ہندی کو واضح طور سے یا الگ سے ریاست میں سرکاری زبان کے طور پر اپنائے جانے کا تذکرہ ہونے کی وجہ سے اسے نہیں لگتا کہ آئین کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان کے طور پر اپنانے کے ریاست کے متبادل کو بند کرتا ہو۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 ستمبر 2014

مدارس کو معیاری تعلیم کی اسکیم کے تحت 41,18273 لاکھ روپے کی مالی مدد

نئی دھلی: مرکزی حکومت نے مالی سال 2013-14 میں ملک بھر کے 14859 مدارس کو معیاری تعلیم کی فراہمی کے تحت مالی امداد کے طور پر 41.18273 لاکھ روپے دیے ہیں۔ یہ اطلاع فروغ انسانی وسائل کی وزیر محترمہ اسمرتی ایرانی نے لوک سبھا میں ایک سوال کے تحریری جواب میں دی۔ ملا پلی رام چندرن کے سوال کے جواب میں محترمہ ایرانی نے بتایا کہ مالی سال 2012-13 میں ملک بھر کے 9905 مدارس کو معیاری تعلیم کی فراہمی کے لیے 41.18280 لاکھ روپے اور 2011-12 میں 6276

مدارس کو 43.13952 لاکھ روپے دیے گئے۔

مرکزی وزیر نے بتایا کہ مدارس میں معیاری تعلیم کی فراہمی (ایس پی کیو ای ایم) اسکیم کے تحت یہ رقم جدید مضامین یعنی سائنس، ریاضی، سماجیات، ہندی اور انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کو اعزازیہ کے طور پر دی جاتی ہے۔ محترمہ ایرانی نے مزید بتایا کہ مدارس کو یہ مالی امداد سائنس اور ریاضی کے آلات، بک بینک قائم کرنے اور سائنس وکمپیوٹر لیباریٹری کے لیے بھی دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد مدارس کے طلبہ کو عصری اسکولوں کے درجہ اول تا یازدہم کے نصاب سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

اسمرتی ایرانی نے واضح کیا کہ ایس پی کیو ای ایم کی یہ اسکیم متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذریعے نافذ کی جاتی ہے۔ مرکزی وزیر کی طرف سے پیش کردہ اعداد وشمار کے مطابق 2013-14 میں سب سے زیادہ 5.7351 لاکھ روپے کی رقم اتر پردیش کے 10704 مدارس کو 25851 اساتذہ کے لیے اعزازیہ کے طور پر دی گئی۔ اس فہرست میں کیرالہ دوسرے نمبر اور مدھیہ پردیش تیسرے نمبر پر ہے جنھیں بالترتیب 9.7117 لاکھ روپے اور 02.1912 لاکھ کی مدد دی گئی۔ ان ریاستوں میں یہ رقم بالترتیب 1462 اور 1743 مدارس میں 4258 اور 2632 اساتذہ کو اعزازیہ دینے کے لیے دی گئی۔ محترمہ ایرانی نے بتایا کہ اقلیتی امور کی وزارت بھی اقلیتوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے اور سماجی واقتصادی بنیادی ڈھانچہ اور بنیادی سہولیات کو بہتر بنانے کے لیے ملٹی سیکورل ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت مالی مدد دیتی ہے۔ اسمرتی ایرانی نے بتایا کہ ایم ایس ڈی پی کے تحت یہ امداد اسکول کی عمارت، کلاس روم، ہاسٹل، ہیلتھ سینٹر کی تعمیر اور بہتر بنانے، مکانات، پینے کا پانی کی فراہمی، آئی ٹی آئی اور پالی ٹیکنک وغیرہ کھولنے کے لیے دی جاتی ہے۔ مرکزی وزیر نے بتایا کہ ایم ایس ڈی پی کے تحت مدارس کو اضافی کلاس روم، ہاسٹل کی تعمیر اور پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے 2011-12، 2012-13 اور 2013-14 بالترتیب 3.10 کروڑ روپے اور 11.73 کروڑ روپے کی منظوری دی گئی۔ جبکہ رواں مالی سال بھی 2014-15 کے لیے اس مد میں 3.22 کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اگست 2014

ورلڈ ایجوکیشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس کا انعقاد

نئی دھلی: اقلیتی طلبا کو بھی ایس سی/ ایس ٹی طلبا کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ اقلیتی طلبا کو ابھی جو وظائف دیے جارہے ہیں وہ ایس سی طلبا کو دی جارہی اسکالرشپ کی رقم سے بہت کم ہے۔ ان خیالات کا اظہار ورلڈ ایجوکیشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس کے دوران 'اقلیتوں کی تعلیم: مواقع اور مشکلات' کے موضوع پر منعقد خصوصی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کیا۔ اس موقعے پر مسلم

ورلڈ ایجوکیشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جسٹس سہیل اعجاز صدیقی

تعلیمی اداروں پر انگریزی جریدہ ڈیجیٹل لرننگ Digital Learning Magazine کے خصوصی شمارے کا اجرا بھی عمل میں آیا جس میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مسلم تعلیمی اداروں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں توصیفی سند سے بھی نوازا گیا۔ اس 2 روزہ کانفرنس کا انعقاد قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، کمیٹی آن گرلز ایجوکیشن اور آل انڈیا کنفیڈریشن فار ویمنس امپاورمنٹ تھرو ایجوکیشن اور ای لیٹس تنظیم کے زیر اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے مزید کہا کہ اگر کوئی طبقہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے تو ملک کی ترقی نہیں کرسکتا چنانچہ موجودہ حکومت مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی دور کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکالرشپ کی رقم میں اضافہ کے لیے وزیر خزانہ سے بات کی گئی ہے اور جلد قدم اٹھایا جائے گا۔ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نے آئین میں فراہم کردہ اقلیتوں کے تعلیمی حقوق پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن نے اپنے تاسیس سے لے کر اب تک 10 ہزار سے زائد اقلیتی تعلیمی اداروں کو اقلیتی درجہ عطا کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مسلمان اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے اور اقلیتی درجہ حاصل کرنے والے 90 فیصد تعلیمی ادارے عیسائی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جسٹس صدیقی نے کہا کہ آئین کی دفعہ 30 (1) کے تحت عدالت نے اقلیتوں کے اس حق پر مہر ثبت کردی کہ انھیں اپنے ادارے قائم کرنے نیز انھیں چلانے کا حق ہے۔ حیدرآباد کے مسلم ایجوکیشنل سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (میسکو) کے صدر ڈاکٹر فخرالدین محمد نے مسلم بچوں میں ترک تعلیم (ڈراپ آؤٹ) کی شرح اور مسلم نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی کے سلسلے میں جامع سروے کی ضرورت پر زور دیا۔ اقلیتی تعلیمی کمیشن کی ذیلی انجمن تعلیم نسواں کمیٹی کی سربراہ ڈاکٹر شبستان غفار نے کہا کہ گزشتہ 2 دہائیوں میں مسلمانوں نے ملک کے مختلف حصوں میں بنیادی اور اعلیٰ تعلیم کے بڑے اور معیاری ادارے قائم کیے ہیں جو ملک کی تعلیمی ترقی میں اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس موقعے پر شیلانگ میں واقع سائنس اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے بانی اور چانسلر محبوب الحق، آسام کے اجمل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے نمائندہ نوراشکر، مرادآباد کے مے فیئر کالج کے بانی ایم اے منصور، سمبا انسٹی ٹیوٹ کے عثمان سعید، ای لیٹس تنظیم کے صدر نارائن اور دیگر ذمے داروں نے بھی اظہار خیال کیا۔

'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اگست 2014

قومی یکجہتی کے فروغ میں شعرا کا اہم کردار

علی گڑھ: لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی پروفیسر فرانسسکا اورسنی نے اودھ کی کثیر اللسانی ادبی تاریخ پر اپنا خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ملک محمد جائسی اور تلسی داس جیسے شعرا نے اپنی زبان اور تہذیب کو فروغ دیا اور پدماوت جیسی محبت کی داستان رقم کرکے آپسی محبت اور ہم آہنگی کو فروغ دیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف پرشین اسٹڈیز میں اودھ کی ادبی تاریخ پر اپنے خیالات کا اظہار کررہی تھیں۔ انھوں نے ہندی، سنسکرت، فارسی، اردو، برج بھاشا اور انگریزی زبان کا استعمال کرتے ہوئے کہا کہ صوفی سنتوں نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ محبت کی زبان تھی اور فارسی طویل عرصہ تک اس ملک کی زبان رہی ہے۔ انھوں نے چنتامنی ترپاٹھی، غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں شعرا کی سوانح لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے جبکہ ہندی میں ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ مہاویر پرساد دویدی اور رام چند شکلا نے ہندی ادب کی جو تاریخ مرتب کی ہے وہ آج بھی پڑھی جاتی ہے لیکن اس میں مسلمانوں کے تعاون کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جبکہ مسلمان شعرا اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں کثیر اللسانیت اور کثیر ثقافتی مظاہر کو فروغ دیا ہے۔ خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ مغلیہ دور کے زوال کے بعد اودھ تہذیب وثقافت اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور اودھ نے ملک کی مختلف زبانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کی تہذیب وثقافت پر بھی صوفی ازم کا اثر پڑا۔ پرووائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) نے کہا کہ وہ پروفیسر فرانسسکا کے خطبہ سے کافی متاثر ہوئے ہیں کہ لندن سے آکر انھوں نے کس طرح کا تحقیقی کام کیا ہے۔ ہندی کی معروف ادیبہ ڈاکٹر نمیتا سنگھ نے کہا کہ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی لہر بنگال سے شروع ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ رحیم مثال ہیں جنھوں نے برج، اودھی اور اردو میں لکھا اور تلسی داس نے عوامی زبان میں لکھا اسی لیے گھر گھر میں یہ زبان پہنچی۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہندی اور اردو کو ہندوستانی کی شکل میں دیکھتی ہیں۔ اس سے قبل غیرملکی مہمان کا خیرمقدم کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف پرشین اسٹڈیز کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کہا کہ ہندوستان کی سبھی زبانیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر فرانسسکا کئی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی عمل کے تعلق سے آچکی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اگست 2014

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور توسیعی خطبات

(1)

نئی دہلی: ٹیگور کا تصور عشق متصوفانہ اور مثالی نوعیت کا بھی ہے اور حسیاتی نوعیت کا بھی۔ وہ جسم کی خواہشات اور ضرورتوں سے فرار کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان کے متوازن روحانی تقاضوں کے ادراک کی ضرورت پر بیک وقت اصرار کرتے ہیں کہ انسانی صداقت کا سب سے اہم پہلو عشق ہے۔ خالق کائنات کے پیدا کردہ اس پھیلے ہوئے فطرت کے نظام اور زندگی میں جو چیز ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے اور ایک دوسرے میں سرایت پذیر ہے اس لافانی چیز کا نام ٹیگور کی لغت میں عشق ہے۔ یہی جذبہ ٹیگور کو زندگی اور دنیا سے محبت کے لیے مہمیز کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر اور معروف نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے ٹیگور کے یوم وفات کے موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو جامعہ کے زیر اہتمام منعقد ٹیگور توسیعی خطبے میں کیا۔ اس توسیعی خطبے کا موضوع 'ٹیگور کا عشق اساس وژن' تھا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ٹیگور کسی ایک ملک کسی ایک شہر یا کسی ایک علاقے کے شہری نہیں تھے۔ بلکہ ان کے تصور انسان یا

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور پر توسیعی خطبے کا منظر

وحدت انسانیت یا یونیورسل مین کے تصور نے انھیں دنیا کا شہری بنا دیا تھا۔ اس معنی میں اقبال اور ٹیگور دونوں کے نظام فکر میں عشق کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ جامعہ ملیہ کے شعبۂ انگریزی کے استاد پروفیسر انیس الرحمٰن نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ٹیگور نے مشرق و مغرب کی قدروں سے استفادہ کیا اور ان سے نئے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ ٹیگور نے حافظ و رومی سے استفادہ کیا۔ ان کی فکر کی تہہ میں وہ افکار و نظریات پنہاں ہیں۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور توسیعی خطبہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ گزشتہ دنوں ٹیگور پروجیکٹ کے زیر اہتمام دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ پہلی کتاب 'میری یادیں' ہے جو ٹیگور کی خودنوشت سوانح ہے اور جس کا ترجمہ فہیم انور نے بنگلہ سے اردو میں براہِ راست کیا ہے۔ دوسری کتاب 'ٹیگور اور اقبال' ہے جو ریسرچ اسکالرز کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر ندیم احمد نے مرتب کیا ہے۔ مہمانان شرکا کا شکریہ پروفیسر شہپر رسول نے ادا کیا۔

(2)

نئی دھلی: رابندر ناتھ ٹیگور سماج کی ترقی کے لیے سائنس کو اہم قرار دیتے تھے۔ وہ بے حد روشن خیال اور وسیع النظر انسان تھے۔ جن کی نظر سائنس، مذہب، ادب اور فطرت پر گہری تھی۔ موجودہ عہد میں رابندر ناتھ ٹیگور کے افکار و خیال اور ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو سمجھنے اور جاننے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز سائنس داں پروفیسر سید احتشام حسنین نے ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ ٹیگور توسیعی خطبے میں کیا۔ انھوں نے ''سائنس، صداقت، فطرت، مذہب اور گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور: ایک عام آدمی کا زاویہ نظر'' کے موضوع پر پیش کرتے ہوئے اپنے خطبے میں کہا کہ ٹیگور کا زمانہ ممتاز سائنس دانوں اور فلسفیوں کا تھا۔ جن میں بیشتر سے ٹیگور کے ذاتی مراسم تھے۔ ٹیگور ادب کے ساتھ ساتھ سائنس کو بھی بے حد اہم قرار دیتے ہیں۔ ان کا فطرت سے لگاؤ والہانہ تھا۔ اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر طلعت عزیز کارگزار وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ کائنات اور فطرت کو سمجھنا سائنس ہے۔ سائنس اور آرٹ کو جدا کر کے مطالعہ کرنا درست نہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔

مہمان اعزازی پروفیسر شمیم حنفی نے پروفیسر سید احتشام حسنین کے خطبے کو ایک یادگار خطبہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ کائنات ایک بہت بڑا بھید ہے۔ کسی ایک ذریعے سے چل کر اسے سمجھنا اور جاننا مشکل ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے انسان کو کئی راستے دکھائے گئے ہیں۔ سائنس اور ادب میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ اس موقعے پر مہمانوں کا استقبال صدر شعبہ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے کیا جبکہ پروجیکٹ کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے ٹیگور پروجیکٹ کی رپورٹ پیش کی اور پروفیسر سید احتشام حسنین کی سائنسی خدمات کا مفصل ذکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اگست و 4 ستمبر 2014

ناصر عباس نیر کی کتاب 'مابعد نوآبادیات' پر مذاکرہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شامِ شہرِ یاراں کے موقعے پر پاکستان کے ممتاز نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب 'مابعد نوآبادیات-اردو کے تناظر میں' پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ناصر عباس کی یہ کتاب ہماری علمی دنیا میں اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کی پہلی کتاب ہے۔ اس جلسے کے مہمانِ خصوصی پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ نئے خیال کے بارے میں سوچنا نئی زندگی کا پتہ دینا ہے۔ 19 ویں صدی اتنی پیچیدہ صدی ہے کہ اس سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا۔ ناصر عباس نیر نے اپنی ادبی روایت کو جدید عناصر کی روشنی میں سب سے عمدہ طریقے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بہت غیر معمولی اور پختہ ذہن رکھنے والے اسکالر ہیں۔ فرحت احساس نے کہا کہ ناصر عباس نیر نے مغربی چیزوں کو ہو بہو پیش کرنے کے بجائے شفافیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جب کچھ لکھتے ہیں تو وہ ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ خالد علوی نے ناصر عباس کی کتاب میں شامل مضامین پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ناصر عباس نیر نے آزاد کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے کہا کہ مابعد نوآبادیات کے بنیادی نکات پر ناصر عباس نیر کی جیسی گہری نظر ہے وہ اردو میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے جلسے کی نظامت کرتے ہوئے کتاب کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں 19 ویں صدی کے اردو زبان و ادب کے ان محرکات کو معروضی طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق نوآبادیاتی ذہن سے ہے۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں اہل علم موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 3 ستمبر 2014

غالب کی شاعرانہ عظمت

حیدر آباد: مرزا اسداللہ خان غالب ترقی اور ثبات کے شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتے دور نے ان کی شاعرانہ عظمت کو بڑھاتے ہوئے شاعری کے نئے زاویوں کو وا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار حسن عبداللہ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں 27 اگست کو ایک خصوصی نشست کے دوران کیا۔ پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے اِس تقریب کی صدارت کی۔ حسن عبداللہ (دہلی) بہ اعتبار پیشہ انجینئر ہیں، لیکن غالب سے ان کو دور طالب علمی ہی سے شغف رہا ہے۔ ان کی انگریزی تصنیف 'The Evolution of Ghalib' (غالب کا ارتقا) بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ انھوں نے کال داس گپتا رضا کی تحقیق کی مدد سے مرزا غالب کی شاعری کا تاریخی ادوار پر مبنی مطالعہ کیا ہے۔ پاور پوائنٹ کے ذریعے پیش کردہ لکچر۔ انھوں نے غالب کی اردو شاعری کے 4 نمایاں ادوار کی 'آغاز، تلاش، نکھار اور شفق' کی حیثیت سے نشاندہی کی۔ غالب کے فلسفیانہ عروج کا حوالہ دیتے ہوئے حسن عبداللہ نے بتایا کہ یہ دور 28-1826 سے قبل تقریباً 30 سال پر محیط ہے، جس میں غالب ایک جدلیاتی مفکر کے طور پر نظر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں نشست کا منظر

آتے ہیں۔ وہ دوام کے بجائے تبدیلی اور ارتقا کے حامی ہیں اور کہتے ہیں 'نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا' وہ نفی سے اثبات کی تلاش کرتے ہیں۔ غالب کی نظر میں انسان تضادات کا مجموعہ اور ارتقا کا حامل ہے۔ انسان اور دنیا ہی ان کی فکر کا مرکز ہیں۔ حسن عبداللہ نے غالب کے شاعرانہ عروج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ دور مابعد 1847-51 کا ہے یعنی 50 سے 53 سال پر محیط ہے۔ یہ غالب کے فنکارانہ عروج کا دور تھا، جہاں وہ کہتے ہیں 'نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا: ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا' غالب کی نظر میں انسانی وجود ہی خدا کے وجود ازلی و ابدی کو اہمیت بخشتا ہے۔ غالب نے اپنی شاعری میں غم جاناں اور غم روزگار دونوں کو جگہ دی ہے۔ ان کا دل دونوں کے دکھ سمجھتا ہے۔ حسن عبداللہ نے لکچر کے آخر میں کہا کہ غالب کی یہی خصوصیات انھیں اردو کا مقبول ترین شاعر بناتی ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر محمد میاں نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کیا اور ان کا خیر مقدم کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 29 اگست 2014

استنبول فاؤنڈیشن کے مندوبین کی اساتذہ اور اسکالرس سے ملاقات

نئی دھلی: استاد سعید نورسی بیسویں صدی کی عظیم شخصیت تھے۔ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں ترکی کو

اسلامی خطوط پر آگے بڑھایا جب اسلام مخالف لہر اپنے شباب پر تھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع نے کیا۔ استنبول فاؤنڈیشن ترکی کے جنرل سکریٹری استاد فارس کایا کی سربراہی میں فاؤنڈیشن کے ایک وفد نے پروفیسر اختر الواسع کی رہائش پر اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ اور اسکالرس سے ملاقات کی۔ اس موقعے پر پروفیسر واسع نے استاد سعید نورسی پر اسلام اور عصر جدید کا خصوصی شمارہ وفد کی خدمت میں پیش کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اقتدار محمد خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ اسلام اور عصر جدید کا شمارہ (معلم عصر: استاد سعید نورسی) پروفیسر واسع کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ خصوصی شمارہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد سعید نورسی پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے اردو مقالے اور حکومت ہند کے مؤقر وزرا کی اس موقعے پر ہونے والی تقریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ استاد سعید نورسی کا ایک اہم رسالہ 'عقیدہ اور انسان' بھی شامل اشاعت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 25 اگست 2014

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالرس سیمینار

نئی دھلی: اردو زبان کا جب تک تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں مطالعہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہم اچھی طرح اردو زبان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اردو زبان ایک تہذیب وثقافت کی زبان ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالرس سیمینار میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے مذکورہ باتیں کہیں۔ ریسرچ اسکالر سیمینار میں بدر عالم نے اور عزیر احمد نے مقالے پیش کیے۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ابن کنول نے شعبۂ اردو میں علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے پی ایچ ڈی اسکالروں کی حاضری کو لازمی قرار دیا۔ ریسرچ اسکالر اب آفس میں رکھے رجسٹر میں اپنی حاضری درج کرائیں گے۔ انھوں نے مہینہ میں دو ریسرچ اسکالر سیمینار بھی منعقد کرانے کا اعلان کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان اقدامات کا مقصد شعبے کی علمی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 15 اگست 2014

دہلی یونیورسٹی میں جاپان کے اردو اسکالرز کو استقبالیہ

نئی دھلی: جاپان کا ہندوستانی زبانوں کے ساتھ بہت قدیم تعلق ہے، اردو زبان و ادب کی شیرینی کی وجہ سے طلبہ اردو کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ جاپان میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں جاپان سے آئے اردو اسکالرز کے ایک وفد نے کیا۔ وفد نے جاپان کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم پر بھی اظہار خیال کیا۔ اپنے استقبالیہ خطبے میں صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کا کوئی شاذ ونادر ہی ملک ہوگا، جہاں اردو نہ بولی جاتی ہو۔ پروفیسر کینسو ماميا نے اپنی تقریر میں کہا کہ جاپان میں اردو زبان وتہذیب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج سے ایک سو دس سال قبل ہندوستانی زبان کا شعبہ قائم ہوا جہاں اردو اور ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہی نہیں بلکہ اردو کے تراجم جاپانی زبان میں کیے گئے۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں

ہر سال اردو ثقافتی میلہ کا انعقاد ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم دہلی یونیورسٹی میں ایک معاہدہ کے تحت اردو سیکھنے اور تہذیب و ثقافتی روابط کے خواہاں ہیں، انھوں نے کہا کہ دنیا کا ساتواں حصہ اردو سے واقف ہے اور خاص طور سے مشرق وسطیٰ میں رابطہ کی زبان اردو ہوگئی ہے۔ پروفیسر ساچیو کوما کی نے کہا کہ اردو سیکھنے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور یوپی کے مختلف شہروں میں سفر اور قیام کرکے اردو زبان وتہذیب سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ تصوف پر تحقیق کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ جس خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو کی گئی ایک جاپانی ہونے کے باوجود اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مقررین نہ صرف اردو زبان سے واقف ہیں، بلکہ اردو تہذیب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کلمات تشکر ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے پیش کیے جبکہ نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 3 ستمبر 2014

دھلی:

دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیل نو

نئی دھلی: دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے

غالب اکادمی میں ایک روزہ سمپوزیم کا منظر

دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیل نو کر دی۔ اردو اکادمی دہلی کی طرف سے جاری کردہ ایک پریس ریلیز کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر خالد محمود کو گورننگ کونسل کا وائس چیئرمین بنایا گیا ہے۔ پریس ریلیز کے مطابق پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، شکیل حسن شمسی، سید اسد رضا نقوی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، حاجی میاں فیاض الدین، شاہد علی حان، عطاء الرحمان قاسمی، انجم عثمانی، کے کے کوہلی، مرغوب حیدر عابدی، محترمہ منور مادیوان، محترمہ کامنا پرشاد، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ڈاکٹر عفت زریں، ڈاکٹر عقیل احمد، معصوم مرادآبادی، سلیم صدیقی اور تحسین منور اردو اکادمی گورننگ کونسل کے اراکین ہوں گے جبکہ اکادمی کے سکریٹری انیس احمد اعظمی اس کے رکن بھی ہوں گے۔ خیال رہے کہ سابقہ گورننگ کونسل کی میعاد کار 19 جولائی 2014 کو ختم ہوگئی تھی لیکن دہلی میں کوئی منتخب حکومت نہ ہونے کی وجہ سے نئی کونسل کی تشکیل کا معاملہ اب تک زیرالتوا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اگست 2014

غالب اکادمی میں ایک روزہ سمپوزیم کا اہتمام

نئی دھلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے زیراہتمام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک روزہ سمپوزیم بعنوان 'یونانی ڈاکٹروں کی فلاح و بہبود' اور سی سی آئی ایم کی نومنتخب صدر ڈاکٹر ونیتا مرلی کمار کے استقبال کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن پروفیسر افضال احمد کی زیرصدارت ہونے والے اس پروگرام میں یونانی ڈاکٹروں کے مسائل اور ان کے حل پر اظہار خیال کیا گیا۔

صدر جلسہ پروفیسر افضال احمد نے کہا کہ پوری دنیا میں یونانی طریقہ علاج کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں یونانی ڈاکٹر اور حکما اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر ونیتا کمار نے اپنی تقریر میں یونانی پیتھی کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ چند ملکوں میں یونانی طریقہ علاج کی تعلیم دی جاتی ہے تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا بھر میں اس پیتھی کو مقبول بنانے اور اسے تسلیم کیے جانے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے یونانی طریقہ علاج کو رائج کرانے اور یونانی ڈاکٹروں کو درپیش مسائل کو دور کرانے کے سلسلے میں حکومت کی ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا اور حکیم اجمل خاں کے نام پر ایک ایوارڈ شروع کرنے کا بھی اعلان کیا۔

سی سی آئی ایم کے نائب صدر ڈاکٹر راشداللہ خاں نے ملک کے یونانی کالجوں کی ابتر صورت حال پر اظہار تشویش کیا اور کہا کہ پورے ملک میں یونانی کے صرف 42 کالج ہیں جبکہ آیورویدک کالجوں کی تعداد تین سو ہونے جارہی ہے۔ انھوں نے درخواست کی کہ یونانی کالجوں کی تعداد بڑھائی جائے اور موجودہ کالجوں کے مسائل حل کیے جائیں۔ ہمالیہ ڈرگس کے ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ آج جبکہ نئی نئی بیماریاں پیدا ہورہی ہیں، یونانی حکما کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ یونانی طبی کانگریس کے اعزازی سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ اس سمپوزیم کا مقصد یونانی ڈاکٹروں کو احساس کمتری سے نکالنا اور ان کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ونیتا کمار کا شال اوڑھا کر اور ایک توصیفی سند دے کر سی سی آئی ایم کی صدر منتخب ہونے پر مبارکباد دی گئی۔

پریس ریلیز حکیم سید، نئی دہلی، 20 اگست 2014

جامعہ ملیہ میں حضرت نظام الدین اولیا یادگاری خطبہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لنگویجز کے زیراہتمام منعقدہ دوسرے حضرت نظام الدین اولیا یادگاری خطبہ میں خصوصی خطاب کے دوران کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند پدم شری اخترالواسع نے کہا کہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا ہندوستان کے ان صوفی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے ہندوستان کی سیکولر اقدار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے انسانیت کی خدمت کو ایک کائناتی تصور قرر دیا۔ انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ذات پات، رنگ و نسل، زبان و علاقہ اور ہر طرح کے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر پوری انسانیت کو تصوف کے دھارے سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آج کے ہندوستان میں جس طرح کے حالات ہیں ان میں صوفی روایات کو جس کے تحت ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی، پہلے کے مقابلے زیادہ ضرورت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کے دور میں خواجہ نظام الدین کے کے کردار اور اخلاق کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اقتدار محمد خان نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اگست 2014

الحکمہ فاؤنڈیشن کے زیراہتمام سمپوزیم

نئی دھلی: معروف سماجی تنظیم الحکمہ فاؤنڈیشن کے زیراہتمام یوم آزادی کے سلسلے میں ایک سمپوزیم ڈاکٹر سید فاروق کی صدارت میں منعقد کیا گیا جس میں چوتھی دنیا کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر اے یو آصف عمر نے تحریک آزادی میں دانشوروں اور صحافیوں کے رول پر اور مولانا آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر کے صدر محمد رحمانی نے تحریک آزادی میں علما اسلام کی قربانیوں پر روشنی ڈالی۔ خطاب سے پہلے فاؤنڈیشن کے سکریٹری سید شعیب احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور فاؤنڈیشن کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر اے یو آصف نے دانشوروں اور صحافیوں کے رول پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری موجودہ نسلیں ان کی تاریخ سے نابلد ہیں اور اگر کہیں کچھ ذکر ہوتا بھی ہے تو بات مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، خان عبدالغفار خان اور علی برادران کے سرسری ذکر کے آگے بمشکل ہی بڑھ پاتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا کہ اصل حقائق جاننے کے لیے سراج الدولہ اور میر قاسم کے مرشدآباد اور قلعہ منگیر کی تاریخ تک واپس جانا پڑے گا۔ فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ضیاء الدین ندوی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، یکم ستمبر 2014

نوہورائزن اسکول میں 'علامہ اقبال کا پیغام' کے اسٹیج کا ایک منظر

علامہ اقبال کا پیغام

نئی دہلی: اس سال شعبۂ اردو، نیوہورائزن اسکول اور علامہ اقبال اکادمی کے اشتراک سے جناب پروفیسر عبدالحق صاحب کے زیرنگرانی 'علامہ اقبال کا پیغام' انٹراسکول و انٹرکالج اردو تقریر اور نظم، غزل سرائی کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کا مقصد طلبا و طالبات میں اقبال شناسی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ افتتاحیہ تقریر میں پرنسپل محترمہ سلیکھا مہرا نے علامہ اقبال کو عظیم اور آفاقی شاعر بتایا اور کہا کہ اسی طرح کے پروگرام میں اقبال کے پیغام کے ذریعے ہم طلبا میں کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید ظفر محمود نے بطور مہمانِ خصوصی تشریف فرما کر علامہ اقبال کی تعلیمات و پیغام سے متعلق انتہائی اہم معلومات کو سلائڈ کے ذریعے پیش کیا۔

پروفیسر عبدالحق نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ اقبال کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی پیغام پنہاں ہے اور میری خواہش ہے کہ طلبا و طالبات اقبال کی نظموں اور غزلوں میں پوشیدہ جذبات سے آشنا ہوں اور ان میں اقبال شناسی کا جذبہ پیدا ہو۔ اردو تقریری پروگرام میں پہلا انعام کریسنٹ اسکول کی بسمہ سلیم، دوسرا انعام نیوہورائزن اسکول کی منوسلوا اور تیسرا انعام رابعہ اسکول کی شمیم کو ملا۔ نظم غزل سرائی پروگرام میں پہلا انعام اینگلوعربک سینئر سکنڈری اسکول کے محمد فیض، دوسرا انعام کریسنٹ اسکول کے محمد ندیم اور تیسرا انعام نیوہورائزن اسکول کی حبا صدف کو ملا۔ اسکول کے منیجر کمال فاروقی نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 29 اگست 2014

طبیہ کالج قرول باغ کو سینٹرل یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ

نئی دہلی: حکیم اجمل خان میموریل سوسائٹی کے بانی و جنرل سکریٹری ڈاکٹر (حکیم) اسلم جاوید نے کہا ہے کہ سوسائٹی طب یونانی کی ترقیات سے متعلق کئی مطالبات پر مشتمل اپنا ایجنڈا مکتوب کی شکل میں وزیراعظم نریندر مودی اور مرکزی وزیر صحت و خاندانی بہبود ڈاکٹر ہرش وردھن کو بھیج چکی ہے۔ چونکہ موجودہ بی جے پی حکومت اور وزیراعظم نریندر مودی کی دیسی طریقہ علاج کی جانب خاص توجہ ہے، لہٰذا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ کو سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ علاوہ ازیں سوسائٹی نے مطالبہ کیا ہے کہ ایمس کے طرز پر پورے ملک میں کم از کم یونانی کے لیے 5 ریسرچ اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مطالبہ میں یہ گزارش بھی وزیراعظم نریندر مودی سے کی گئی ہے کہ محکمہ آیوش کی کوششوں سے ایک یونانی کے ایمس ادارہ کی تیاری کر لی گئی تھی، جس کے لیے غازی آباد میں ایک بڑی قطعہ اراضی بھی مختص کر لی گئی تھی مگر یہ کام تعطل کا شکار ہو گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اگست 2014

آندھرا پردیش:

عصر حاضر کی اردو شاعری، رجحانات و امکانات

حیدرآباد: شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی جانب سے 8 اگست 2014 کو اردو ہال حمایت نگر میں ایک روزہ قومی سمینار 'عصر حاضر کی اردو شاعری، رجحانات و امکانات' کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ سیمینار کی نظامت نذیر احمد صاحب صدر شعبہ اردو ویمنس کالج کوٹھی نے کی۔ پروفیسر فاطمہ پروین نے جامعہ عثمانیہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور سیمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ پہلے مقالہ نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم نے 'عصر حاضر کا گوشہ نشین شاعر قطب سرشار' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ قطب سرشار نے اپنے تخلیقی سفر کے 50 سالوں کی تکمیل کی ہے۔ ان کا لب ولہجہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

دوسرے مقالہ نگار رؤف خیر نے 'عصر حاضر کی اردو شاعری رجحانات و امکانات' کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ تیسرے مقالہ نگار معروف شاعر ڈاکٹر محسن جلگانوی نے اپنا مقالہ 'عصر حاضر میں اردو شاعری کے رجحانات و امکانات' پر پڑھا۔ چوتھا مقالہ صدر شعبہ پروفیسر مجید بیدار نے 'عصری اردو شاعری رجحانات اور امکانات' کے موضوع پر پڑھا۔

اس سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے جناب م ن سعید سابق صدر نشین کرناٹک اردو اکادمی نے کہا کہ سیمینار میں شرکت سے ہماری محدود معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ عصر حاضر میں اردو شاعری کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں مقالوں کا تجزیہ پیش کیا۔ سیمینار کے اختتام کے بعد ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعری مجموعہ 'دل کہہ رہا ہے' کا رسم اجرا ہوا۔ اس تقریب کی نظامت پروفیسر تاتار خان نے انجام کی۔ 'دل کہہ رہا ہے' کا اجرا بدست پروفیسر اشرف رفیع و عزت مآب جناب محمود علی صاحب ڈپٹی چیف منسٹر تلنگانہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے بطور مہمان شرکت کی اور ڈاکٹر معید جاوید کے فن شاعری اور کلام پر اظہار خیال فرمایا۔

رپورٹ: ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل، حیدرآباد، 10 اگست 2014

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی جانب سے منعقدہ ایک روزہ قومی سیمینار 'عصر حاضر کی اردو شاعری، رجحانات و امکانات' کا منظر

اترپردیش:

اردو ہندوستان کی زبان ہے

بہرائچ: اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے اور اسی زبان سے ہندوستان کو جوڑنے، اتحاد پیدا کرنے کا کام ہوا اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پوری دنیا میں جس زبان سے محبت وخلوص کا پیغام ملا ہے وہ اردو

زبان ہی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ریاستی وزیر مملکت یاسر شاہ نے بروز اتوار کو شہر کے محلہ ناظر پورہ میں اتر پردیش اردو اکادمی کے تعاون اور قومی ایکتا سوسائٹی کے زیر اہتمام مفت اردو کوچنگ اسکول کی تقسیم اسناد تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی کہلانے کے لیے ہم کو اردو زبان کو زندہ رکھنا ہوگا۔ نیز اردو اکادمی اتر پردیش کے سکریٹری مہمان معزز ڈاکٹر شمیم احمد نے اکادمی کے منصوبوں و موجودہ ریاستی حکومت کے ذریعے اٹھائے گئے اقدامات کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی ایکتا سوسائٹی کی طرح ریاست کے 47 اضلاع میں مفت اردو کوچنگ جاری ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2014

علی گڑھ کا جیوتی کرن لرننگ سینٹر

علی گڑھ: یہ ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے، جو غریبوں کی چوکھٹ پر تعلیم کا چراغ جلا رہی ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں کے تجربات نے یہی بات تصدیق کی ہے کہ ناخواندگی، غربت اور جرائم کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ غربت سے اتحاد تبھی ٹوٹے گا، جب تعلیم ملے گی۔ اس خاتون نے وطن لوٹ کر سماج کے ان کونوں کو روشن کرنا شروع کیا، جنھیں تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ سیتاپور ضلع میں پیدا ہوئیں پروین مختار خود تعلیم کے لیے لڑ کر آگے بڑھی ہیں۔ 1966 میں اے ایم یو کے عبداللہ گرلز اسکول میں 11 ویں میں داخلہ ملا۔ 1970 میں اے ایم یو سے بی ایس سی الیکٹریکل کر کے یہاں کی پہلی مسلم خاتون الیکٹریکل انجینئر بنیں۔ اسی سال ایک تاجر گھرانے کے شخص خالد مختار سے نکاح ہو گیا۔ شوہر نے بھی اے ایم یو سے ہی بی ایس سی میکینکل کیا تھا۔ 10 سال دونوں نے امریکہ میں نوکری کی۔ ملک لوٹی پروین نے گھر کے ارد گرد غریب بچوں کو دیکھا۔ غریبوں کو پڑھانے کی خواہش میں انھیں 2008 میں 1500 گز کی اپنی کوٹھی کے گیسٹ روم میں اسکول کھول دیا۔ نام رکھا 'جیوتی کرن لرننگ سینٹر' سات بچے سے شروعات کی تو چند روز میں تعداد 30 پہنچ گئی۔ آج گھر کے آٹھ کمرے اسکول کا حصہ ہیں۔ 130 بچے آٹھویں تک مفت پڑھ رہے ہیں۔ پروین بچوں کو خود بھی پڑھاتی ہیں۔ آٹھ اساتذہ پر ماہانہ خرچ ہے 40 ہزار۔ شوہر خالد امریکہ میں رہ رہے دونوں بیٹے سلیم اور سلمان اور کچھ رشتہ داروں کے تعاون سے رقم جٹاتے ہیں۔ اے ایم یو ایلو مینائی ایسوسی ایشن کیلی فورنیا کی مدد سے 15 کمپیوٹر کی لیب بن چکی ہے۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 11 اگست 2014

مرکز برائے قرآنی مطالعات کے زیر اہتمام صوفی ازم پر خطبہ

علی گڑھ: عالمی شہرت یافتہ دانشور اور امریکہ کی یونیورسٹی آف نورتھ کیرولینا کے پروفیسر کارل ڈبلیو ارنیسٹ نے کہا کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ سے صوفی ازم عالمی سطح پر پھل پھول رہا ہے اور برصغیر ہند کے ساتھ ساتھ امریکہ اور یوروپین ممالک کی عوام اس سے متاثر ہو رہی ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کے اے نظامی مرکز برائے قرآنی مطالعات کے زیر اہتمام 'صوفی ازم، اسلام اور عالمگیریت: ہم عصر دنیا میں' موضوع پر خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں مذہبی مطالعہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں شیخ نظام الدین اولیا اور بابا فرید گنج شکر نے اس کو بڑی حد تک فروغ دیا اور ملک میں صوفی سنتوں کی روایت کو آگے بڑھایا تاکہ انسانی اقدار کو بڑھاوا دیا جا سکے اور آپسی یگانگت اور ہم آہنگی سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ پروفیسر ارنیسٹ نے کہا کہ صوفی موسیقی بھی غیر ممالک میں کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور پاکستان کے نصرت فتح علی نے موسیقی کے توسط سے جو صوفیانہ کلام پیش کیا ہے وہ امریکہ میں کافی مقبول ہے۔ پروفیسر ارنیسٹ نے کہا کہ عظیم صوفی سنت جلال الدین رومی کے شعری کلام کو دیپک چوپڑا نے انگریزی میں ترجمہ کر کے مغربی ممالک تک پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ بلھے شاہ کے پنجابی نغمے بھی کافی مقبول ہوئے۔ توسیعی خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ ہندوستان میں صوفی ازم کی جڑیں کافی گہری ہیں اور اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ چشتی سلسلہ کی علامت ہے۔ پرووائس چانسلر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ایس احمد علی نے کہا کہ صوفی ازم انسانیت کو فروغ دیتا ہے اور صوفی ازم نے قرآن، حدیث اور سیرتِ طیبہ کو آگے بڑھایا۔ کے اے نظامی مرکز برائے قرآنی مطالعات کے ڈائرکٹر پروفیسر احتشام احمد نظامی نے مہمان مقرر کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر ایف ایس شیرانی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 8 اگست 2014

ادارہ 'تہذیب الاخلاق' کی تقریب

علی گڑھ: اردو شیریں زبان ہے جس کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے رسم الخط کو سکھانے پر اساتذہ کو توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پرووائس چانسلر سید احمد علی نے ادارہ تہذیب الاخلاق میں منعقد یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کی تقریب سے خطاب میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تہذیب الاخلاق کے ساتھ ساتھ نور الآفاق اور نور الانوار جیسے رسالہ شائع ہونے شروع ہوئے، لیکن یہ اب باقی نہیں ہیں جبکہ تہذیب الاخلاق آج بھی اپنی چمک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ انھوں نے فروغ اردو کے لیے اے ایم یو میں اردو کو لازمی قرار دینے کے فیصلہ کو اہم موڑ بتایا۔ اس موقع پر ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ نئی اور آنے والی نسلوں کے لیے آنے والی صدیاں بے حد مشکل ہوں گی، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ سرسید نے یہ بڑا اہم کام انجام دیا جس سے قوم و ملت کو فیض حاصل ہوا۔ پروفیسر سید محمد ہاشم نے فکر و نظر کے بارے میں معلومات فراہم کراتے ہوئے کہا کہ یہ جریدہ 1960 میں شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس کے سبھی شماروں کا اشاریہ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اگست 2014

علی گڑھ میں بزم افسانہ کا انعقاد

علی گڑھ: کہانی لکھنا مشکل فن ہے۔ کہانی سننے اور سنانے کا دور واپس لوٹ آئے تو تہذیبی زوال رک سکتا ہے اور کہانیاں بہتر معاشرہ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد پروفیسر

صغیر افراہیم نے عظیم اسٹیٹ سرسید نگر میں بزم افسانہ میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ناول اور افسانہ نگار بے حد حساس ہوتے ہیں اور وہ زمانے کے درد کو پہلے خود پر طاری کرتے ہیں تب جا کر کوئی فن پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ بزم افسانہ کے مہمان خصوصی چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اس موقع پر اپنا تازہ افسانہ، انجان راہوں کا مسافر، پیش کیا جس میں انھوں نے شہروں کی تاریخ کے ساتھ نیا تجربہ

پیش کیا۔ پروفیسر نجمہ محمود نے علامتی افسانہ، غار، پیش کیا جس کی فضا فلسفیانہ خیالات، روحانیات اور عرفانیات سے پُر نظر آتی تھی۔ پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے نئے ناول کے ایک باب، آسان منزل، کو پیش کیا جس میں نہ صرف زبان و بیان کی لطافتوں نے محظوظ کیا۔ آصف اظہار علی، ڈاکٹر افشاں ملک اور انجینئر محمد فرقان سنبھلی نے بھی اپنے اپنے افسانے پیش کیے۔

پریس ریلیز، فرقان سنبھلی، علی گڑھ، 3 ستمبر 2014

مفتی ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلی پر سیمینار

لکھنؤ: مولانا مفتی ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلی کا اردو کی ترقی میں کافی اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے اردو کی ترقی اور اس کی ترویج اور تشہیر میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم سبھی کو انھیں کے بتائے طریقے پر عمل پیرا ہوکر اردو کی ترقی کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے یہاں غنی تعلیمی مرکز کی جانب سے مفتی ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ کا اردو کی ترقی میں رول کے موضوع پر منعقد سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ حاجی عبدالنصیر ناصر کی صدارت میں منعقد سیمینار کے مہمان خصوصی و ریٹائرڈ آئی ایس و سابق وائس چانسلر انیس انصاری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تین سو سال سے موصوف کے آباو اجداد مذہب، ادب اور اردو کی خدمات انجام دیتے آرہے ہیں، اپنے بزرگوں کی طرز پر ہی موجودہ امام شہر مولانا خالد رشید فرنگی محلی عمل پیرا ہیں اور وہ بھی شہر میں امن کو قائم کرنے میں بھرپور تعاون کررہے ہیں۔ انیس انصاری نے مزید کہا کہ مرحوم اردو کے شیدائی تھے اور ان کی کاوشوں سے اردو کو بہت فروغ ملا ہے۔ ان کے خاندان نے درس نظامی کو رائج کیا۔ صدیقی نے کہا کہ لکھنؤ کی عیدگاہ کو ایک مثالی عیدگاہ بنانے میں ابوالطیب فرنگی محلی کا بڑا کردار رہا ہے۔ انور عالم، انجینئر محمد سمیع خاں، فیض احمد صدیقی، محترمہ رخسانہ لاری اور صدر جلسہ عبدالنصیر ناصر نے بھی اپنے خیالات سے نوازا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 اگست 2014

'آؤ پڑھیں' سوسائٹی کے زیر اہتمام شام غزل

ہاپوڑ: آؤ پڑھیں سوسائٹی کے زیراہتمام ایک شام غزل کا انعقاد شاعر و مصنف اور اداکار فصیح چودھری کی رہائش گاہ پر کیا گیا جس میں عالمی شہرت یافتہ سیکسوفون پلیئر بوخاں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ہندوستان کے مشہور غزل گو مکیش تیواری نے اپنی سحر انگیز آواز کا جادو بکھیرا۔ امریکہ سے تشریف لائے مہمان خصوصی ادبی شخصیت شفاعت علی خان نے گنگا جمنی تہذیب کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے پروگرام کے کنوینر مشرف چودھری اور فصیح چودھری کو دلی مبارکباد پیش کی۔ شاعرہ صبا عزیز، گلزار کاظمی، فراز چودھری اور ریکھا اوستھی نے اپنی مترنم غزلوں سے اس شام کو حسن بخشا۔ نظامت معروف شاعر ملک زادہ جاوید اور شمس رمزی نے مشترکہ طور پر کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اگست 2014

محمد علی جوہر یونیورسٹی میں جشن آزادی کا اہتمام

رام پور: ملک کی 68 ویں جشنِ یوم آزادی کا انعقاد محمد علی جوہر یونیورسٹی میں کیا گیا۔ اس موقعے پر چانسلر محمد اعظم خاں نے پرچم کشائی کی رسم انجام دی۔ وائس چانسلر پروفیسر محمد یونس نے طلبہ کے سامنے ملک کی آزادی کے حصول میں پیش

آنے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا ذکر کیا۔ یونیورسٹی کے انتظامی افسر اکبر مسعود قریشی نے بھی تحریک آزادی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے طلبہ کی جانب سے حب الوطنی سے لبریز ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے گئے۔ تقریب کا اختتام قومی ترانہ پر ہوا۔ اسکول کی پرنسپل زمزم جبیں نے اپنے خطاب میں شہدائے آزادی کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ان کے لاثانی کارناموں کو یاد کیا۔ اس موقعے پر رعنا رحمت نے کہا کہ ہمیں آزادی کا جو بیش قیمت تحفہ اپنے بزرگوں کی قربانیوں کی بدولت حاصل ہوا ہے اس کا تحفظ ہر قیمت پر کرنا ہوگا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر شعائراللہ خاں نے تحریک آزادی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہماری قومی رہنماؤں کی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 19 اگست 2014

بہار:

پریم چند اور دلت مسائل

پٹنہ: ''آج ہندستان میں مسلمانوں سے بڑا کوئی دلت

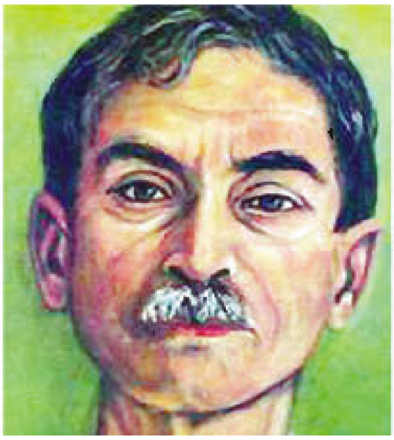

نہیں ہے۔ مسلمان آج حاشیے پر جا چکا ہے۔ آئندہ 25-30 سالوں میں دلت ادب ہی لکھا جائے گا جس کے اہم کردار مسلمان ہوں گے ان خیالات کا اظہار پروفیسر اسلم آزاد، سابق ایم، ایل، سی حکومت بہار نے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر محمود الہٰی کی یاد میں ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں 'پریم چند اور دلت مسائل' پر مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ بنارس کے پروفیسر رفیع اللہ، الہ آباد یونیورسٹی سے پروفیسر شبنم حمید، سلمان بن عبدالعزیز یونیورسٹی سعودی عرب کے ڈاکٹر افروز اشرفی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر اسلم آزاد، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر اشرف جہاں اور ڈاکٹر اسرائیل رضا وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ناظم جلسہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے موضوع کا تعارف کروایا اور بتایا کہ پروفیسر محمود الہٰی اردو تحقیق کا ایک معتبر اور بڑا نام ہے جن کی وابستگی شعبۂ اردو سے بہت گہری تھی۔ ان کی یاد میں اس تقریب کا انعقاد در اصل انھیں شعبے کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنا ہے نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ پریم چند کے یوم پیدائش پر چھٹیوں کی وجہ سے کوئی تقریب نہیں ہوسکی تھی اس لیے 'پریم چند اور دلت مسائل' پر اس مذاکرے کا مقصد انھیں یاد کرنا اور ان کے فکر و فن پر گفتگو کرنا ہے۔ پریم چند اردو میں دلت ادب کے بنیاد گزار ہیں۔ آج جب ہندی و مراٹھی میں اس موضوع پہ بحث آگے تک پہنچ چکی ہے، ضروری ہے کہ اردو میں بھی دلت ادب پر کھل کر گفتگو کی جائے۔

ڈاکٹر افروز اشرفی نے پریم چند کی دلت ہمدردی کو سراہا مگر یہ کہا کہ دلت ادب کی تخلیق اگر دلت شخص کے ہاتھوں کی جائے تو وہ زیادہ موثر ہوگی۔

پروفیسر شبنم حمید، الہ آباد یونیورسٹی نے کہا کہ اردو

میں دلت ادب کو لازمی طور پر شامل کیا جانا چاہیے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جاوید حیات نے اس سے اختلاف کیا کہ دلت ادب اردو میں کم لکھا جا رہا ہے یا دلت ادب صرف دلت کی طرف سے لکھا جانا چاہیے۔ اردو میں بڑی تعداد میں ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دلتوں کی آواز کو بلند کیا ہے یا انھیں موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر اسرائیل رضا نے کہا کہ ادب میں دلت مسائل اس وقت تک بر قرار رہیں گے جب تک دلتوں کی ہمہ جہت ترقی نہیں ہوجاتی اور ان میں بیداری نہیں آجاتی۔

پروفیسر محمود الٰہی کو یاد کرتے ہوئے اردو کے معروف نقاد اور شاعر پروفیسر علیم اللہ حالی نے ان کی تحقیقی کاوشوں کی ستائش کی اور کہا کہ محمود الٰہی نے تحقیق اور تنقید کی دوئی کو دور کیا اور تحقیق و تنقید کو ادب کے مبتدیوں سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ مہمان گرامی پروفیسر رفیع اللہ نے کہا کہ پروفیسر محمود الٰہی نے اپنی تحقیق میں قاضی عبدالودود کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ تقریب کا اختتام سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اشرف جہاں کے اظہار تشکر سے ہوا۔

پریس ریلیز شہاب ظفر اعظمی، بجانب شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، 13 اگست 2014

ہندوستان سماچار نیوز ایجنسی کی اردو خدمات کا افتتاح

پٹنہ: آزادی کے بعد ہی اردو سیاست کی شکار ہوگئی۔ آئین میں زبانوں کے تحفظ کی گارنٹی کے باوجود بیوروکریسی اور سیاست کے پھندے میں پڑ کر اردو کو اس کے جائز حق سے محروم کردیا گیا مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس زبان نے گنگا جمنی تہذیب کو بچائے رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس زبان نے ہمیں آزادی سے ہم کنار کیا۔ گاندھی سنگرہالیہ کے ڈائرکٹر اور گاندھیائی فلسفہ کے ماہر رضی احمد نے یہ باتیں ہندوستانی سماچار قومی کثیر لسانی خبر رساں ایجنسی کی اردو خدمات کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ رضی احمد نے کہا کہ آزادی کے 68 سال بعد بھی اردو اپنے جائز حق سے محروم ہے مگر یہ بات ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اردو کی ترویج و اشاعت اور اس کے فروغ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے گلزار دہلوی اور نول کشور کی مثال پیش کی۔ نامساعد حالات کے باوجود بہار میں اردو دیگر ریاستوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں مل کر ترقی کے منازل طے کررہی ہیں۔ ہندوستان سماچار نیوز ایجنسی کی اردو خدمات کا افتتاح کرتے ہوئے قانون ساز کونسل کے چیئرمین اودھیش نارائن سنگھ نے کہا کہ بہار اور اردو کے لیے یہ انتہائی خوش آئند قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ ہی کونسل کی کارکردگی اور اس کی حصولیابی اردو میں بھی شائع کی جاتی ہے۔ اردو کی نمائندگی دینے کی میں بھرپور کوشش کروں گا۔ اس موقع پر ہندوستان سماچار کے قومی کنوینر لکشمی نارائن بھلا نے کہا کہ آج کا دن ہندوستان سماچار کے لیے یادگار دن ہے۔ ہم عزم کریں کہ ہم اردو کو اس کا جائز حق دلائیں گے۔ اس وقت اس خبررساں ایجنسی میں بشمول اردو 15 زبانوں میں خبریں جاری کی جارہی ہیں۔ اب تک صرف پرنٹ میڈیا کے لیے ہی یہ ایجنسی کام کرتی رہی ہے مگر اب ہم الیکٹرانک چینل کے لیے کام کا آغاز کرنے جارہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 اگست 2014

پنجاب:

عیدملن کے موقع پر طنز ومزاح کی تقریب

افسانہ کلب مالیرکوٹلہ کی جانب سے 16 اگست کو جشنِ آزادی کی فضاؤں میں حسب روایت عید ملن کا اہتمام کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر جناب لیش پال گوئل کو مدعو کیا گیا۔ مہمان ذی وقار جناب اے۔ روجر اور جناب نریندر پال سنگھ نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب کی صدارت جناب امجد علی چیئرمین سہراب گروپ آف کمپنیز کی تھی۔ نظامت کے فرائض ناصر آزاد جنرل سکریٹری کلب نے ادا کیے۔ نائب صدر جناب سالک جمیل براڑ نے مہمانوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کیا۔ افسانہ کلب کے سرپرست اور مہربان جناب اسلم جمشید پوری صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ نے عید کی اہمیت اور قومی یک جہتی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد طنزومزاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے کلب کے ممبر اسحق اور پروفیسر منظور حسن نے اپنے مضامین پڑھے۔ جناب اسلم جمشید پوری نے اپنا مزاحیہ مضمون پیش کیا۔ حاضرین جس شخصیت سے مزاحیہ مضمون سننے کے لیے بیتاب تھے وہ جناب نصرت ظہیر اعزازی مدیر 'اردو دنیا' تھے جنھوں نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا اور محفل کو قہقہہ زار بنادیا۔ خطبہ صدارت کے بعد افسانہ کلب کے روحِ رواں جناب بشیر مالیرکوٹلوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

بذریعہ ڈاک، محمد بشیر مالیرکوٹلوی، مالیرکوٹلہ، 30 اگست 2014

تلنگانہ:

تلنگانہ حکومت کا سروے فارم اردو میں

حیدرآباد: تلنگانہ حکومت کی جانب سے عوام کو سرکاری اسکیموں کے فوائد پہنچانے کے لیے 19 اگست کو کیے جانے والے گھریلو سروے کے فارم اردو داں طبقہ کی سہولت کے لیے اردو زبان میں شائع کیے گئے ہیں۔ یہ فارم گریٹر حیدرآباد بلدیہ کی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ سروے میں حصہ لینے والے اہلکاروں کی تربیتی کلاسز سے خطاب کرتے ہوئے واضح کردیا ہے کہ نئے راشن کارڈس یا وظائف کی منظوری سے اس سروے کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ مستحق افراد تک سرکاری اسکیموں کے فائدے پہنچانے اور مستحق افراد کی نشاندہی کے لیے یہ سروے کیا جارہا ہے۔ تلنگانہ کے ضلع کریم نگر میں سروے میں حصہ لینے والے اہلکاروں کو تربیت دی گئی دیواروں پر پوسٹرس لگاتے ہوئے عوام میں سروے کے تعلق سے بیداری پیدا کی گئی۔ ٹی آر ایس کے رکن اسمبلی سی رمیش نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس سروے میں حصہ لیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 18 اگست 2014

تانڈور میں اردو یونیورسٹی کی تشکیل کے لیے 10 ایکڑ اراضی کا مطالبہ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، نوتشکیل شدہ ریاست تلنگانہ میں اپنے نیٹ ورک کو وسعت دینے کے لیے اقدامات کررہی ہے۔ ریاست میں ایسے کئی علاقے ہیں جہاں قابل لحاظ اردو آبادی ہے۔ ان مقامات پر موجود اردو آبادی اور عوامی نمائندوں کی جانب سے بھی اس تعلق سے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن، تانڈور نے ٹاؤن میں یونیورسٹی کورسز کے آغاز کے لیے 10 ایکڑ اراضی الاٹ کروانے میں ریاستی حکومت سے نمائندگی کا فیصلہ کیا ہے۔ صدر ایسوسی ایشن جناب خورشید حسین کے بموجب وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں کو اس سلسلہ میں دورۂ تانڈور کی دعوت دی گئی ہے۔ پروفیسر محمد میاں نے علاقہ میں اردو طلبا اور طالبات کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے بالخصوص تکنیکی اور پیشہ ورانہ کورسز کی فراہمی میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے فوری طور پر نظامت فاصلاتی تعلیم کے دو اسٹڈی سنٹرس تانڈور اور وقار آباد میں قائم کرنے کا اعلان بھی کیا۔ پروفیسر محمد میاں نے ایسوسی ایشن کے عہدے داروں کے علاوہ مقامی عوامی نمائندوں سے بھی ملاقات کی اور وہاں

اردو یونیورسٹی کے مرکز کے قیام کے امکانات کا جائزہ لیا۔

پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے اعلیٰ تعلیم کے حصول سے محروم طلبہ کے لیے پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو خصوصی طور پر فروغ دینے کا تہیہ کیا ہے۔ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کے عہدے داروں نے تانڈور میں اردو آبادی کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے وہاں پالی ٹیکنیک، آئی ٹی آئی اور ماڈل اسکول قائم کرنے اور لڑکیوں کے لیے ڈی ایڈ کورسز کے آغاز کی درخواست کی ہے۔ پروفیسر محمد میاں نے اس موقعے پر تانڈور اور وقار آباد میں نظامت فاصلاتی تعلیم کے 2 اسٹڈی سنٹرس کے قیام کا اعلان کیا اور کہا کہ آئندہ مارچ تک آئی ٹی آئی بھی قائم کیا جائے گا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 25 اگست 2014

امامیہ کمیونٹی سینٹر چنئی میں ادبی تقریب کا انعقاد

نئی دھلی: بزم ادب کرشنا گری اور تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز کے زیر اہتمام، امامیہ کمیونٹی سینٹر، چنئی، میں ایک شاندار ادبی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ تقریب ان معنوں میں انفرادیت کی حامل تھی کہ اس میں بیک وقت پانچ کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ تقریب کا ایک اور قابل قدر پہلو یہ تھا کہ شعرا اور ادبا کو ان کی ادبی، علمی اور سماجی خدمات کے صلے میں تمغات سے نوازا گیا۔ حضرت العلام مولانا مولوی عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی ایوارڈ، بدست الحاج ایچ اے عبدالعزیز، مولانا قاضی سید شاہ انواراللہ، قاضی ویلور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ فیض احمد فیض ایوارڈ، بدست الحاج ایچ اے عبدالعزیز، ڈاکٹر کوی کو عبدالرحمٰن، تمل زبان وادب کے مستند ومعتبر شاعر وادیب، کو دیا گیا۔ قائد ملت جناب محمد اسماعیل ایوارڈ، الحاج ایچ محمد افضل صاحب، ڈاکٹر حیات افتخار صاحب اور جناب چنگم عبدالجبار کو پیش کیا گیا۔ نواب محمد علی والا جاہ ایوارڈ، بدست جناب ارشد بینا نگری، مختار بدری، ڈاکٹر سید سجاد حسین، جناب حسن فیاض ڈاکٹر ایس محمد یاسر، ڈاکٹر قاضی حبیب احمد کو دیا گیا۔ قلندر دکن حضرت کاوش بدری ایوارڈ، جناب منیر احمد جامی کو دیا گیا۔ اجلاس کی صدارت جناب مختار بدری نے کی۔ نظامت کے فرائض جناب اشفاق الرحمٰن مظہر نے انجام دیے۔ الحاج ایچ اے عبدالعزیز نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر کوی کو عبدالرحمٰن صاحب، جناب داؤد میاں خان، مولانا مولی سید شاہ انواراللہ صاحب، الحاج ایچ محمد افضل صاحب اور جناب چنگم عبدالجبار شریکِ تقریب تھے۔ جناب علیم صبا نویدی نے مہمانان کا استقبال کیا۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 4 ستمبر 2014

ریختہ کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے کا منظر

تہذیب و ثقافت

ریختہ کے زیر اہتمام مشاعرے کا انعقاد

نئی دھلی: اردو شاعری کا سب سے بڑا آن لائن ذخیرہ 'ریختہ' کے زیر اہتمام آج انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں 'شام شعر' کے نام سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، 'ریختہ' کا یہ پہلا مشاعرہ ہے جس میں نہ تو سامع اور نہ ہی شاعر کی بلکہ شاعری کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ ریختہ کے بانی سنجیو صراف نے مشاعرے کے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے 'ریختہ' کا تفصیلی تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ 'ریختہ' کا مقصد اردو شاعری کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ اردو شاعری کو ان لوگوں تک پہنچایا جائے جو اس شاعری سے محبت تو کرتے ہیں لیکن رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری کوشش رہی ہے کہ اردو زبان کے رسم الخط اور اس کی شاعری کو عام کریں۔ انھوں نے کہا کہ دو سال کے مختصر عرصے میں 172 ملکوں میں ہماری ویب سائٹ سے لوگ استفادہ کررہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہت جلد ہم اردو کا آن لائن لرننگ کورس شروع کرنے والے ہیں۔ مشاعرہ کی صدارت معروف نقاد اور ادیب پروفیسر شمیم حنفی اور نظامت نعمان شوق نے کی۔ مشاعرے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی، سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی، کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند پدم شری پروفیسر اختر الواسع کے علاوہ بڑی تعداد میں ادبا اور شعرا موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2014

عروج ادب کے زیر اہتمام جشن آزادی کا انعقاد

نئی دھلی: دہلی کی ادبی تنظیم 'انجمن عروج ادب' کے زیر اہتمام مشاعرہ جشن آزادی ایوان غالب اڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے اس مشاعرے کی ادبی اور تہذیبی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد لوگوں کے اندر بہت زیادہ خوف و ہراس تھا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے سے بہت دور تھے، تو اس وقت اس انجمن کے ذریعے اس مشاعرہ کی داغ بیل ڈالی گئی جس میں سبھی طبقے کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرے کا دہلی کے اندر گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں اہم رول ہے۔ مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے ہریانہ اور پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس وجیندر جین نے کہا کہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم اردو

تہذیب کے پروردہ ہیں جہاں اسکول میں اردو اور انگلش کی تعلیم ہوتی تھی اور ہندی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ عورتوں کی زبان ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہماری تہذیب ختم ہوتی جارہی ہے اور مشاعرہ کے دلدادہ لوگ بھی کم ہوتے جارہے ہیں، لیکن ایسے دور میں امید کی کرن ہے کہ ہماری زبان سمجھنے والے کچھ لوگ زندہ ہیں۔ سابق الیکشن کمشنر آف انڈیا ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے عروج ادب کے جشن مشاعرہ آزادی پر روشنی ڈالی۔ مشاعرہ کی نظامت معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اگست 2014

اردو کے کلاسیکی شاعر ولی دکنی پر ڈرامہ

نئی دھلی: اردو کے معروف کلاسیکی شاعر ولی دکنی کی حیات اور فن پر ایک خصوصی ڈاکیو ڈرامہ تیار کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں ذاکر حسین دہلی کالج کے سینئر استاد ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ ولی دکنی شاعر اعظم نہیں، خدائے سخن نہیں لیکن اردو شاعری کے محسن اعظم ہیں۔ ولی کے آنے کے بعد ہی لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ اردو زبان میں بڑی شاعری کی جاسکتی ہے۔ انڈین رائٹرس ایسوسی ایشن

کے صدر اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر صادق نے کہا کہ جب تک محبت اور انسانیت باقی رہے گی ولی دکنی کی شاعری اور ان کا نام باقی رہے گا۔ سنیما گرافرس کے تیار کردہ فلم ساز اشوک راول کے اس ڈاکیوڈرامہ میں ہندی کے 2 معروف ادیبوں وریندر برنوال اور ڈاکٹر جانکی پرساد نے بھی ولی دکنی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کی تعریف کی۔ ڈرامہ میں ولی دکنی کا کردار مہدی حسن نے اور ابوالمعالی کا کردار راجیو شرما نے ادا کیا جبکہ مشہور غزل سنگر ستیش بترا اور رانی ببر نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اگست 2014

امیر خسرو کی حیات اور فن پر ڈراما

نئی دهلی: ہندوستان کے عظیم شاعر، صوفی، مؤرخ اور موسیقار حضرت امیر خسروؒ کے 710 ویں یوم وفات کے موقعے پر امیر خسرو کی حیات اور فن پر مشتمل ایک خصوصی ڈاکیو ڈرامہ تیار کیا گیا ہے۔ اسے سنیما گرافرس کے بینر تلے فلمساز اشوک

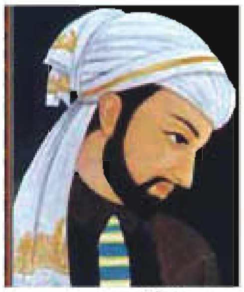

راول نے تیار کیا ہے۔ اس کے ایگزیکٹو پروڈیوسر پروفیسر صادق ہیں۔ اس میں امیر خسرو کا کردار نیر جعفری نے ادا کیا ہے۔ اینکرنگ ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے کی ہے اور پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر صادق، ڈاکٹر یونس جعفری اور استاد اقبال احمد خاں نے امیر خسرو کی حیات اور فن کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہندوستان کے مشہور غزل سنگر ستیش بترا اور رانی ببر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ امیر خسرو کا مشہور گیت 'چھاپ تلک سب چھین لی' اس پروگرام کا خاص حصہ ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2014

امیر خسرو کے عرس کے موقعے پر آل انڈیا مشاعرہ

نئی دهلی: طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ کے 710 ویں سہ روزہ سالانہ عرس کے موقعے پر عرس محل بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں حضرت پیر خواجہ سید احمد بخاری سجادہ نشین درگاہ حضرت نظام الدین اولیا نئی دہلی میں آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان سے حضرت بابا گنج شکر کے سجادہ نشین دیوان عظمت چشتی بطور مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ مہمانِ ذی وقار خواجہ راشد خانونی گوالیر، قادری سلسلہ سے سید عظیم القدر وغیرہ موجود تھے۔ پیرزادہ سراج مدنی نظامی جنرل سکریٹری (عرس تقریبات) کی تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔

نعت و منقبت ایڈوکیٹ سید فرید نظامی نے پیش کیا۔ مشاعرہ میں گلزار دہلوی، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، افضل منگلوری، متین امروہوی، غفران اشرفی، کمال جعفری کے علاوہ دیگر معروف شعرائے کرام نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2014

ایوانِ غالب میں مشاعرہ جشنِ آزادی

نئی دهلی: اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے، ہمیں اردو کے فروغ کے لیے حکومت پر تکیہ کرنے کے بجائے خود اپنی ذمے داری ادا کرنی چاہیے اور اپنے بچوں کو گھر میں ہی اردو کی تعلیم دینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام مشاعرہ جشن آزادی کے دوران مہمان خصوصی کے طور پر دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل نیوز ایس ایم خان نے کیا۔ اس سے قبل ایس ایم خان اور دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین قمر احمد نے مشاعرے کی شمع روشن کی۔ نظامت کے فرائض مقبول ناظم شکیل جمالی نے ادا کیے۔

ایس ایم خان نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ مشاعرے اردو زبان اور ادب کی مقبولیت کا ایک اہم حصہ ہیں اور اردو کے فروغ میں ان کا ایک اہم رول ہے۔ صدارتی تقریر میں اقلیتی کمیشن کے چیئرمین قمر احمد نے کہا کہ آزادی کی خوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ہم مجاہد آزادی کی قربانیوں کو یاد نہیں کریں اور انھیں خراجِ عقیدت پیش نہ کیا جائے۔ اس سے قبل استقبالیہ تقریر میں اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے اکادمی کی کارگزاریوں سے واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب اور تاریخ ہے اور مشاعرے اس تہذیب کو زندہ رکھنے میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔ اکادمی کی مشاعرہ کمیٹی کے کنوینر جی آر کنول نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر موجود دیگر اہم شخصیات میں قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین پروفیسر طاہر محمود، انجم عثمانی، علیم الدین اسعدی، ایس ایم ظفر، شہباز ندیم، شمس رمزی، جاوید قمر، فقیر چند ناشاد، عاقل سحریار اور جاوید مشیری وغیرہ موجود تھے۔ بعد ازاں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اگست 2014

ہندوستان میں فن خطاطی کے فروغ میں

رام پور کا بڑا حصہ

رامپور: کائنات کے ہر ہر ذرہ میں اللہ کی نعمتوں کا ظہور ہے لیکن اس کے لیے نظریات کی پاکیزگی لازم ہے۔ تب ہی انسان اسے محسوس کرسکتا ہے۔ ان احساسات کا اظہار فن خطاطی سے شغف رکھنے والی محترمہ عذرا امین نے ایک خصوصی ملاقات میں کیا۔ رامپور کی سرزمین نے جہاں مجاہد آزادی اور معروف صحافی و ادیب مولانا محمد علی جوہر کو جنم دیا تو وہیں مولانا عبدالوہاب خاںؒ، مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ اور مولانا وجیہ الدین احمد خاںؒ جیسے علماء کرام کو بھی پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی رامپور شاد عارفی، جلیل نعمانی، محشر عنایتی، بدر تسلیمی، خیال رامپوری، طرب ضیائی، ڈاکٹر شوق اثری اور ہوش نعمانی جیسے استاد شعرا کا بھی مادروطن ہے۔ فن خطاطی میں ملک ایران کو خصوصی حیثیت حاصل ہے لیکن ہندوستان میں اس فن کے فروغ میں رامپور کا بڑا حصہ ہے۔ استاد شہزادے خاں جادو رقم، سید احمد میاں خطاط، قیصر شاہ خاں استاد رام پوری کی وراثت کو آگے بڑھاتے ہوئے محترمہ عذرا امین نے بھی فن خطاطی کو اپنی صلاحیتوں سے اعلیٰ مقام تک پہنچایا ہے۔ آج ملک بھر میں ان کی خطاطی کے نمونوں کی ستائش ہورہی ہے۔ دو بچوں کی ماں عذرا امین ایک گھریلو خاتون ہیں۔ عذرا امین نے بتایا کہ فن خطاطی میں ان کی دلچسپی بچپن سے ہی رہی ہے۔ انھوں نے خطاطی کا پہلا نمونہ تقریباً 13 یا 14 سال کی عمر میں تیار کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 27 اگست 2014

بہار اردو اکادمی میں مشاعرہ

پٹنه: بہار اردو اکادمی میں وزیر اقلیتی فلاح نوشاد عالم کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اکادمی کے سکریٹری امتیاز کریمی نے خطاب کرتے ہوئے اکادمی کی علمی و ادبی خدمات کا مختصراً جائزہ پیش کیا۔ صحافی اشرف استھانوی اور افسانہ نگار فخر الدین عارفی نے اردو کے مسائل کی جانب وزیر موصوف کی توجہ مبذول کراتے ہوئے اکادمی کے گرانٹ میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ وزیر موصوف نے خطاب میں کہا کہ بہار میں اردو اور اقلیتوں سے متعلق بے شمار مسائل ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان مسائل کے حل کے تئیں سنجیدہ ہوں۔ اس موقعے پر بزرگ شاعر پدم شری ڈاکٹر کلیم عاجز کی عزت افزائی کی

گئی۔ معروف شاعر شنکر کیموری نے نعتیہ اشعار سنائے۔ استقبالیہ جلسہ سے مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور آئی پی ایس افسر انیل کمار سنگھ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر انیل کمار سنگھ کے شعری مجموعہ 'آدھی روٹی پورا چاند' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' پٹنہ، 18 اگست 2014

اعزاز و اکرام

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

لکھنؤ: 9 اگست مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن دفتر واقع امین آباد میں عظیم ناقد، دانشور، ناول نگار اور میر و غالب کے شرح نگار پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے اعزاز میں ایک پر تکلف استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس استقبالیہ تقریب میں بین الاقوامی شہرت کے حامل پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر انور جلال پوری، رضوان احمد سابق ڈی جی پی اتر پردیش نے شرکت کی۔

جلسے کا آغاز ڈاکٹر سکندر اصلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نظامت ڈاکٹر ہارون رشید نے کی۔ مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے بانی جنرل سکریٹری محمد وصی صدیقی، سینئر صحافی حسین امین، ڈاکٹر حبیب فکری، قمر گونڈوی وغیرہ نے گل پوشی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔

اس موقعے پر مہمان محترم پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مختصر خطاب میں مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن اور اہالیان لکھنؤ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سرزمین لکھنؤ سے میرا گہرا تعلق رہا ہے۔ یہاں میری کئی ایسی شامیں گزری ہیں جن کی حسین یادیں آج بھی میرے ذہن و دل کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہماری تہذیبی تاریخ میں اردو والوں کا بڑا حصہ ہے۔ جوہر فاؤنڈیشن اردو تہذیب و ادب کی جو بھی خدمات انجام دے رہا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے مہمان محترم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ آج ہم جس دانشور کا استقبال کر رہے ہیں اس کے دیدار کا انتظار پوری ادبی دنیا کو رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج بالا اتفاق اردو دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ موجودہ دور میں پروفیسر شمس الرحمن فاروقی اردو کی سب سے بڑی شخصیت ہیں جو تہذیبی رویے پروفیسر فاروقی میں پائے جاتے ہیں وہ کمیاب ہیں۔ بحیثیت انسان وہ اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شمس الرحمن فاروقی سب سے

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے اعزاز میں استقبالیہ کا منظر

بڑے شارح سب سے بڑے نقاد اور اردو کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ انور جلال پوری نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ شمس الرحمن فاروقی یوں تو انگریزی کے استاذ رہے اور سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر بھی فائز رہے لیکن اس کے باوجود اردو کے حوالے سے جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین کے بعد اردو تنقید کا سب سے بڑا نام شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ اس موقعے پر عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ہارون رشید، 9 اگست 2014

سید محمد اشرف کے اعزاز میں ادبی شام کا انعقاد

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ سید محمد اشرف

نے روزمرہ کی زندگی کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے جہاں ایک نئی دنیا آباد ہے اور ان کا انداز منفرد ہے۔ وائس چانسلر جنرل شاہ اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیراہتمام اے ایم یو کے رجسٹرار آفس کے کاؤنسل روم میں منعقدہ 'ادبی شام' کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے صدارتی خطبے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سید محمد اشرف کی کہانی سے کافی متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے بھی زندگی کے ایک سچے واقعہ سے واقف کرایا جو سید محمد اشرف کی کہانی کا عکاس تھا۔ پرووائس چانسلر بریگیڈیر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) نے سید محمد اشرف کی کہانی کی ستائش کی اور اپنے بچپن کی سچی کہانی سنا کر ادبی محفل کو باغ باغ کر دیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی کولکاتا کے چیف انکم ٹیکس کمشنر، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ممتاز افسانہ نگار سید محمد اشرف نے مسلم یونیورسٹی میں ادبی سرگرمیوں کی ستائش کی اور اپنے دور طالب علمی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ وائس چانسلر کی موجودگی میں کہانی سنانے کی 35 سالہ قدیم روایت کا اعادہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی نئی کہانی سنائی جسے کافی سراہا گیا۔ اس سے قبل پروگرام کے کنوینر پروفیسر صغیر افراہیم نے سید محمد اشرف (آئی آر ایس) کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا تعلق خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے صوفی گھرانے سے ہے۔ ان کی کہانیوں کا موضوع قدروں کا زوال، تہذیبی بکھراؤ اور رشتوں کا ٹوٹنا بکھرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کی ابتدا میں تہذیب و ثقافت میں جس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں سید محمد اشرف نے اپنی تخلیقات میں ان کا فن کارانہ اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر کی اہلیہ محترمہ صبیحہ سیمی شاہ، پرووائس چانسلر کی اہلیہ محترمہ رضوانہ علی، پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر فصیح احمد صدیقی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر شافع قدوائی وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 اگست 2014

غلام نبی خیال

سری نگر: سرکردہ کشمیری اور اردو ادیب، شاعر، تحقیق

کار اور صحافی جناب غلام نبی خیال کو گزشتہ دنوں ریاست

اردو اکادمی کے ذریعے 2013 ایوارڈ پروگرام کا منظر

جموں وکشمیر کی حکومت کی طرف سے سالانہ سرکاری ایوارڈ دیا گیا۔ یہ اعزاز گورنر جناب این، این، ووہرا نے وزیر اعلیٰ جناب عمر عبداللہ کے ساتھ خیال صاحب کو اُن کی قابل تحسین ادبی اور صحافتی خدمات کے عوض ایک شاندار تقریب میں دیا گیا۔ یہ باوقار انعام ریاستی حکومت ہر سال مختلف شخصیات کو ادب، صحافت، انتظامیہ، شجاعت، طِب، سپورٹس اور فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں دیتی ہے۔ اس سال کل ملاکر 71 شخصیات کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔

انعام ایک کشمیری شال، توصیف نامہ اور اکیاون ہزار روپے نقد رقم پر مشتمل ہے۔

پریس ریلیز کشمیر کلچرل کانفرنس، سری نگر، 31 جولائی 2014

اردو اکادمی کی تقسیم انعامات برائے کتب

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے ذریعے انعامات کے لیے منتخب 2013 کی بہترین تخلیقات کے خالقین کو ایک پروقار تقریب میں شیلڈ، سرٹیفکیٹ اور نقد انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے تقریب کے مہمان خصوصی جسٹس آفتاب عالم صدیقی نے اردو کو ایک تہذیب یافتہ زبان بتاتے ہوئے کہا کہ اس زبان میں لکھی ہوئی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر پوری اقوام عالم تک پہنچ رہی ہیں۔ انھوں نے اردو اکادمی کے ذریعے ایوارڈ کے لیے منتخب کتابوں کا ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان میں اکثر کتابیں ہماری ماضی سے متعلق ہیں، ماضی ہمارا روشن اور تابندہ ہے، اس لیے اس کی ضرورت ہے، لیکن مستقبل سے پیچھا چھڑانا بھی تشویشناک بات ہے۔ انھوں نے اردو اکادمی کو مشورہ دیا کہ آئندہ برسوں سے اگر قانون، سیاسیات، تاریخ، سیرت اور سوانح جیسے موضوعات کو بھی شامل کیا جائے تو تخلیقات میں مزید توسیع پیدا ہوگی۔ انھوں نے مزید کہا کہ 'بیسٹ سیلر' کا انعام بھی دینا چاہیے تاکہ پتہ چل سکے کہ کون سی کتابیں کتنی فروخت ہو سکی ہیں۔ مجموعی طور سے 28 مصنّفین نے انعامات کے لیے کتاب جمع کی تھی جس میں 21 امیدواروں کو انعامات سے نوازا گیا۔ پہلے زمرے کے لیے انعام کی رقم 9100 جبکہ دوسرے زمرے کے لیے 7100 مقرر کی گئی تھی۔ اس بار منشی نول کشور انعام برائے ناشر سے دلی کتاب گھر کو نوازا گیا۔ انعام یافتگان مصنّفین میں پروفیسر مظفر حنفی (گفتگو: دوبدو)، ڈاکٹر ریاض الہاشم (اودھ میں اردو مرثیہ)، ڈاکٹر عادل حیات (تنقید و تجزیہ)، وسیم احمد سعید (اوراقِ پارینہ)، ڈاکٹر ساجدہ زاہدی (شمالی ہند میں اردو شاعری کی ترقی میں امرا و والیانِ ریاست کا حصہ)، سید ساجد علی ٹونکی (ٹونک میں اردو کا فروغ)، کندن لال کندن (عروضِ پنگل وخلیل)، ڈاکٹر احمد علی برقی (روحِ سخن)، شہباز ندیم ضیائی (عشق ہے)، ڈاکٹر احمد محفوظ (بیانِ میر)، محمد حیات الدین (آتش عہد اور شاعری)، پروفیسر اقبال محی الدین (ہماری کائنات سائنس کی روشنی میں)، ڈاکٹر عبدالناصر (اردو شعر و ادب کا عہد زریں اور لسانی پہلو)، ویریندر پٹواری (لالۂ رخ)، پرویز اشرفی (ماں کی آنکھ سے ٹپکتا خون)، آصف اعظمی (جہانِ تازہ و افکارِ تازہ)، انتظار نعیم (بنے ہیں خواب کچھ میں نے)، ابوالفیض عزم سہریاوی (مشعلِ راہ)، ولی اللہ ولی (آرزوئے صبح)، مجاز امروہوی (دھنک)، سلیم امروہوی (ذکرِ مصطفیٰ) شامل ہیں۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ایوارڈ اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ مزید حوصلہ مندی کے ساتھ آگے بڑھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل روشن ہے، اردو پہلے سے زیادہ پڑھی جارہی ہے، کتابیں بھی چھپ رہی ہیں اور لوگ خرید بھی رہے ہیں، لیکن دوسرا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہم تصانیف اب معدوم ہوتی جارہی ہے۔ پروگرام کی نظامت ریشما فاروقی نے کی۔ قبل ازیں اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے اکادمی کی سرگرمی اور کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے مہمان خصوصی جسٹس آفتاب عالم اور تقریب کے صدر پروفیسر عتیق اللہ کا تعارف پیش کیا۔ اخیر میں ایوارڈ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر جی آر کنول نے تمام مہمانوں اور ایوارڈ یافتگان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اگست 2014

مظفر علی کو راجیو گاندھی نیشنل سدبھاؤنا ایوارڈ

نئی دھلی: عالمی شہرت یافتہ فلم ساز اور سماجی کارکن مظفر علی کو 2013 کے راجیو گاندھی نیشنل سدبھاؤنا ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ کانگریس صدر سونیا گاندھی اور سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ نے ایک پروقار تقریب میں مظفر علی کو سپاسنامہ پیش کرکے اور شال اوڑھا کر اس اعزاز سے سرفراز کیا۔ اس ایوارڈ کے تحت انھیں پانچ لاکھ روپے کا چیک بھی دیا گیا۔ 69 سالہ مظفر علی کو قومی یکجہتی، امن و امان اور خیر سگالی کے شعبہ میں غیر معمولی تعاون کے لیے 22 ویں راجیو گاندھی نیشنل سدبھاؤنا ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ انھوں نے امراؤ جان، گمن اور خزاں جیسی مشہور فلمیں بنائی ہیں۔ انھیں 2005 میں پدم شری سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذریعے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کی یادگار اس ایوارڈ سے اب تک سرفراز کی گئی معزز ہستیوں میں مدر ٹریسا، کے آر نارائنن، استاد بسم اللہ خاں، لتا منگیشکر، سنیل دت، دلیپ کمار، استاد امجد علی خان اور مولانا وحید الدین خان شامل ہیں۔

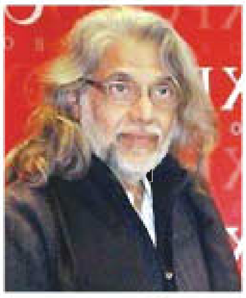

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اگست 2014

اردو میں محبوب راہی کو بال ساہتیہ پُرسکار اور التفات امجدی کو یُووا پُرسکار

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری کی صدارت میں آج گوہاٹی میں ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ ہوئی جس میں مختلف ہندستانی زبانوں کے 'بال ساہتیہ پُرسکار' اور 'یُووا پُرسکار' 2014 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں 'بال ساہتیہ پُرسکار' کے لیے معروف شاعر محبوب راہی کی کتاب 'رنگارنگ پھلواری' (شاعری) جبکہ 'یُووا پُرسکار' کے لیے جواں سال شاعر التفات امجدی کی کتاب 'چھکنے پات' (رباعیاں) کا انتخاب عمل میں آیا۔ محبوب راہی گزشتہ پچاس برسوں سے بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ ان کی

بچوں پر نصف درجن کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'گل بوٹے'، 'پھلواری'، 'مہکتی پھلواری'، 'آئینۂ وطن' قابل ذکر ہیں۔ انھیں بچوں کے حوالے سے مختلف اعزازات وانعامات سے پہلے بھی کئی اداروں نے نوازا ہے۔ التفات امجدی اردو کے جواں سال شاعر ہیں۔ کم عمری میں ہی ان کے رباعیوں کے تین مجموعے 'چار محراب'، 'ٹافیاں' اور 'چکنے پات' شائع ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں۔

'بال ساہتیہ پرسکار' کے دوسرے انعام یافتگان میں دینیش چندر گوسوامی (آسامی)، گوری دھرم پال (بنگالی)، دھیان سنگھ (ڈوگری)، سُبھدرا سین گپتا (انگریزی)، ایشور پرمار (گجراتی)، دینیش چھولا شیلیش (ہندی)، حامد سراج (کشمیری)، کبیر سنگھ سوری (پنجابی)، نیرج دہیا (راجستھانی) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جبکہ 'یُو وا پرسکار' کے دوسرے انعام یافتگان میں کوشک بروا (انگریزی)، انل چاوڑا (گجراتی)، کمار انوپم (ہندی)، ٹیکا بھائی (نیپالی)، گگن دیپ شرما (پنجابی)، راجو رام 'راج' (راجستھانی)، شری یوگ مایا (سنسکرت) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز مشتاق صدف (پروگرام آفیسر)، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 22 اگست 2014

اشرف استھانوی کو آبروئے صحافت ایوارڈ

پٹنہ: بہار کے معروف صحافی اشرف استھانوی کو صحافتی اور تصنیفی خدمات کے اعتراف میں اکبر رضا جمشید آبروئے صحافت ایوارڈ 2014 سے نوازا گیا۔

مقامی اردو بھون میں منعقد ایک باوقار تقریب میں سابق وزیر اعلیٰ اور حکمراں جماعت کے قد آور لیڈر نتیش کمار نے اشرف استھانوی کو آبروئے صحافت ایوارڈ سے نوازا۔ علامتی نشان، رقم کے چیک اور شال پیش کر کے نتیش کمار نے ان کی عزت افزائی کی۔ اس موقعے پر پٹنہ ہائی کورٹ کے جج محفوظ عالم، اکبر رضا جمشید، مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے علاوہ کثیر تعداد میں محبان اردو موجود تھے۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، پٹنہ 9 اگست 2014

پاکستانی شعرا کے اعزاز میں نشست

نئی دہلی: پاکستان سے تشریف لائے ہوئے مہمان دیوان عظمت محمود فریدی چشتی (درگاہ بابا فرید گنج شکرؒ، پاکپٹن شریف) صاحب زادہ سعید احمد صابری اور محمد اعظم صابری (اوکاڑا، پاکستان) کے اعزاز میں دہلی کی ادبی تنظیم 'میزان' کے زیر اہتمام ہند پاک دوستی کے نام محفلِ نعت ومنقبت کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ نگر کے بٹلہ ہاؤس میں واقع سرتاج علی کی رہائش گاہ، میں منعقد اس شعری نشست کی صدارت طاہر نظامی نے اور نظامت میزان کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کی۔ اس موقعے پر پدم شری ڈاکٹر ایم ولی کے ہاتھوں دیوان عظمت محمود چشتی فریدی کو 'میزان بابا فرید ایوارڈ' پیش کیا گیا جبکہ اوکھلا کے ایم ایل اے آصف محمد خان کے ہاتھوں 'مخدوم صابر ایوارڈ' صاحب زادہ سعید احمد صابری کو صفدر حسین خان (نائب صدر انڈیا اسلامک کلچر سینٹر) کے ہاتھوں 'محبوب الٰہی ایوارڈ محمد اعظم صابری کو دیا گیا۔ پاکستان کے مہمانوں نے ہند-پاک دوستی کے حوالے سے اپنے خطاب میں بزرگان دین کی طرف راغب ہونے اور سنت رسول پر چلنے کی تلقین کی اور کہا کہ دنیا اور آخرت دونوں جہان کا سکون صرف اور صرف حضورﷺ کے نقش قدم پر چل کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب آنے کی اشد ضرورت ہے جس سے دلوں کی دوریاں کم ہوسکیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت نظام الدین اولیا کے عرس کے موقعوں پر دونوں ملکوں کے وفود کے آنے جانے سے یہ دوریاں کافی کم ہورہی ہیں۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2014

ناول نگار عبدالصمد کو جے این یو میں استقبالیہ

نئی دہلی: معروف فکشن نگار پروفیسر عبدالصمد نے جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے ہندستانی زبانوں کے مرکز میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ 'دوگز زمین' جیسے مشہور ناول کے خالق پروفیسر عبدالصمد کو جے این یو میں استقبالیہ دیا گیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیع ایوب نے مہمان مصنف پروفیسر عبدالصمد کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے بتایا کہ عبدالصمد نے افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں وہ ناول نگاری کی جانب متوجہ ہوئے۔ پہلا ناول 'دوگز زمین' 1988 میں شائع ہوا۔ 1990 میں اس ناول کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد 'مہاتما'، 'خوابوں کا سویرا'، 'مہاساگر' اور 'دھمک' جیسے ناول لکھے۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی میں علم سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں جن کی اہلِ علم نے پذیرائی کی ہے۔

پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر انور پاشا نے عبدالصمد کو انتظار حسین کے بعد کی نسل کا ایک بہت اہم ناول نگار قرار دیتے ہوئے کہا کہ عبدالصمد کے ناولوں میں دانشوری کا جو عنصر پایا جاتا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے عبدالصمد کے ناولوں کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے قاضی عبدالستار کو یاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ قاضی عبدالستار کی طرح عبدالصمد پر بھی الزام لگتا رہا ہے کہ ان کے ناولوں میں جاگیردارانہ نظام کی طرف داری نظر آتی ہے لیکن یہ ادھورا سچ ہے۔

عبدالصمد نے کہا کہ وہ کسی ازم سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کا کمٹمنٹ صرف ادب سے ہے۔ پروگرام کے آخر میں شعبے کے استاد ڈاکٹر آصف زہری نے مہمان گرامی اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اگست 2014

ریڈیو تہران کے صحافیوں کو لکھنؤ میں استقبالیہ

لکھنؤ: ریڈیو تہران کی اردو سروس کے اناؤنسر صاحبان مولانا حسین اختر رضوی اور ہاشم علی کی ہندوستان آمد کے

موقعے پر شہر ادب لکھنؤ میں ایک استقبالیہ نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نشست ریڈیو تہران کے سینئر سامع انجم زیدی (بہرائچ) کی طرف سے سید قمر عباس زیدی کی رہائش گاہ پر منعقد کی گئی۔ ہاشم علی اور مولانا اختر حسین رضوی صاحبان اس نشست میں مہمان خصوصی تھے۔ نظامت مولانا حسین اختر رضوی نے کی۔ خطیب اہل بیت اور ریڈیو تہران کے سینئر سامع کاظم عابدی نے، جو اس خصوصی نشست کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ریڈیو تہران کے لیے اپنے دلی جذباتِ اور انس ومحبت اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

ریڈیو تہران کے اناؤنسر اور نشست کے مہمان خصوصی حسین اختر رضوی نے اپنے خطاب کے دوران ریڈیو تہران کی اردو سروس کی نشریات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں مہمان خصوصی ہاشم علی نے ریڈیو تہران کی نشریات کی تفصیلات کے بارے میں بتایا اور اس خصوصی نشست کے انعقاد کے لیے انجم زیدی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ریڈیو تہران کی نشریات کافی دن سے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں اور اب موبائل وین پر بھی ریڈیو تہران کی نشریات سنی جاسکتی ہیں جب کہ فیس بک، گوگل پلس اور ٹوئیٹر پر ریڈیو تہران کی نشریات سننے کے لیے پتے بھی انھوں نے بتائے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2014

میسور میں جلسہ تقسیم اسناد

میسور کے مسلم ایمپلائیز ویلفیر اسوسیشن (MEWA) کے تحت چلائے جا رہے ادارۂ ادبیات اردو کے جون 2014 میں منعقدہ امتحان کے کامیاب طلباء کو سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ بطور انعام اُردو کتابیں دی گئیں۔ 'میوا' مرکز، میسور میں منعقد اس جلسہ کی صدارت کیپٹن افضل حسین نے کی۔ مہمانِ خصوصی کرناٹک اُردو اکادمی کے رجسٹرار مرزا عظمت اللہ اور عائشہ چاند میسوری موجود تھے۔ مرزا عظمت اللہ نے اپنے خطاب میں اُردو زبان پر زور دیتے ہوئے تعلیمی قابلیت کو بڑھانے پر روشنی ڈالی۔ وہیں عائشہ چاند نے لڑکیوں کی تعلیم اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کی۔

پریس ریلیز، نعمت اللہ خان میسور، 1 ستمبر 2014

اردو دوست شاعر ناگیش چندرا

نئی دہلی: اردو اور ہندی شاعری میں ناگیش چندرا ایک ایسی شخصیت کے طور پر نیا چہرہ سامنے آیا ہے جس نے عوام کے دلوں میں اپنے ساہتیہ سے جگہ بنائی ہے مگر یہ بات بھی کسی طور نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ شاعری کے ذریعے بھائی چارگی اور آپسی اتحاد کو فروغ دینے کا جو کام (انہد کا یہ دھارا) کر رہی ہے وہ شاید ہی کوئی کر رہا ہو۔ ادارے اور تنظیمیں شعرا کو نوازتی ہیں۔ لیکن کسی بھی ادارے یا تنظیم کے پابند سامعین کے لیے بھی حوصلہ افزائی کا سامان کیا جانا چاہیے تاکہ سامعین کی دلچسپی بنی رہے۔ آئی ٹی او پر واقع اردو گھر میں منعقدہ پروگرام میں یہ مثال دیکھنے کو ملی، جب صف سامعین میں سے جنوبی دہلی کے سنگم وہار میں مقیم معروف اردو دوست شاعر ورندر قمر بدر پوری کے شاگرد ناگیش چندرا کو مومنٹو، شال اور توصیفی سند کے لیے آواز دی گئی اور ان کا استقبال کر کے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ دیگر سامعین اور شرکا نے اس اقدام کو قابل تحسین قرار دیا۔ ویسے اس سے قبل سہ لسانی ادب کے فروغ میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دینے والی تنظیم محفل وگنگ وجمن سے بھی 30 اکتوبر 2012 میں ناگیش چندرا کو ہندی ایوارڈ مل چکا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اگست 2014

رسم اجرا:

ماہنامہ 'نیا دور' کا خمار بارہ بنکوی نمبر

لکھنؤ: بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر خمار بارہ بنکوی نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے عہد کے مختلف مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے

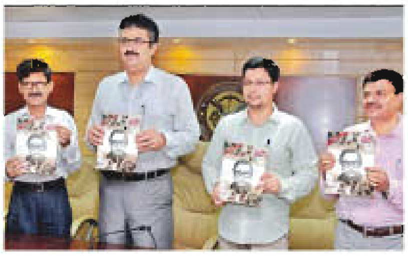

توسط سے جہاں اردو شاعری کو مقبول بنایا وہیں مشاعروں کے اسٹیج سے ریاست اور ملک کا نام روشن کیا۔ ان خیالات کا اظہار پرنسپل سکریٹری اطلاعات نونیت سہگل نے کیا۔ وہ لال بہادر شاستری بھون کے میڈیا سینٹر میں محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا دور' کے خمار بارہ بنکوی نمبر کا اجرا کر رہے تھے۔ ماہنامہ 'نیا دور' ریاستی محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ سے گزشتہ 68 برسوں سے مسلسل پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ 'نیا دور' کے خصوصی نمبر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، جو تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں وزیر اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ پر اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی جس سے وزیر اعلیٰ کی اردو دوستی کا پیغام عوام تک پہنچا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ محکمہ اطلاعات و رابطہ حکومت اتر پردیش کی ویب سائٹ پر ماہنامہ 'نیا دور' پڑھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نیا دور کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تک انھوں نے تقریباً 12 خصوصی نمبر اپنی ادارت میں شائع کیے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ جلد ہی ماہنامہ 'نیا دور' کی جانب سے دوارکا پرساد افق لکھنوی اور علی برادران پر بھی خصوصی شمارے شائع کیے جائیں گے۔ اس موقعے پر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر روپیش کمار، ڈپٹی ڈائریکٹر امجد حسین اور نیا دور کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی سمیت میڈیا کے نمائندے اور افسران موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اگست 2014

کیف عظیم آبادی مقام اور کلام

پٹنہ: اردو کے مشہور و مقبول شاعر کیف عظیم آبادی کی شخصیت اور ان کے کلام پر مبنی کتاب 'کیف عظیم آبادی مقام اور کلام' کا اجرا بہار کے سابق وزیر اعلیٰ جناب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے ہاتھوں اردو بھون میں عمل میں آیا۔ اس موقع پر انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری تہذیب وثقافت کی وراثت ہے۔ جس دن اردو ختم ہو جائے گی، ہماری تہذیب ختم ہو جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ کیف عظیم آبادی اردو کے اہم شاعر تھے، ان کی بیٹی اور کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے یہ کتاب لکھ کر ان کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی نے کہا کہ

کیف کی شاعری موسیقی کا شور وغل نہیں بلکہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ دل میں اتر جانے والا نغمہ ہے، ان کی غزلوں یا قطعات میں عشق و محبت کے رشتوں کا ذکر بے حد احترام کے ساتھ آتا ہے۔ ڈاکٹر زرنگار یاسمین کا تعلق نئی نسل سے ہے مگر اس عمر میں ہی تواتر کے ساتھ ان کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہے یہ فال نیک ہے اور مجھے اس سے بہت طاقت ملتی ہے۔ نوجوان قلم کار نور السلام ندوی نے کہا کہ کیف ایک عظیم شاعر وفنکار تھے مگر مرنے کے بعد ان کو بھلا دیا گیا، زرنگار یاسمین نے یہ کتاب لکھ کر کیف شناسی کا آغاز کیا۔ امتیاز احمد کریمی سکریٹری بہار اردو اکیڈمی نے کہا کہ کیف عظیم آبادی دبستان عظیم آباد کی شعری روایت کے امین تھے۔

مشہور ناقد اور شاعر پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے اپنے والد کیف عظیم آبادی کے کلام کو مرتب کر کے ہم شائقین کو بادۂ شبانہ کی سرمستیوں سے ہمکنار کیا ہے۔

پریس ریلیز نور السلام ندوی، پٹنہ، 28 اگست 2014

ناول 'قلندر نما بندر' اور 'فقر وغنا' کا اجرا

نئی دھلی: متحدہ عرب امارات میں مقیم معروف ادیب اور صحافی ڈاکٹر سلیم خان کی دو نئی تصانیف کا اردو پریس کلب کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اجرا عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف ناول نگار پیغام آفاقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ملک زادہ جاوید نے انجام دیے۔ ڈاکٹر سلیم خان کے ناول 'قلندر نما بندر' کا اجرا پیغام آفاقی اور دوسرے ناول 'فقر وغنا' کا اجرا انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کمشنر برائے لسانی اقلیات پروفیسر اختر الواسع نے ڈاکٹر سلیم خان کی تحریروں میں جرأت مندی اور ان کے قلم کی اثر انگیزی کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سلیم خان کی تحریریں قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل ایس ایم خان نے اس موقعے پر دوردرشن کے اردو چینل پر اس طرح کے پروگرام شروع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ افکار ملی کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر قاسم رسول الیاس نے ڈاکٹر سلیم خان کی سیاسی بصیرت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اس ناول کو ایک بہترین پیش کش قرار دیا۔ صحافی ممتاز عالم رضوی نے 'قلندر نما بندر' ناول کو ایک تاریخی دستاویز قرار دیتے ہوئے کتاب کے فکری اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پیغام آفاقی نے 'قلندر نما بندر' کو اس عہد کا ایک بے مثال ناول قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اہل قلم کو کسی بھی قسم کی مصلحت سے صرف نظر کرتے ہوئے جرأت مندی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اگست 2014

''سہ ماہی محفلِ خوش رنگ کلکتہ'' کا اجرا

'بزم بہاراں' کولکاتا کے زیر اہتمام جشنِ یوم آزادی کے موقع پر کثیر الجہات شخصیت کے حامل شاعر و ادیب حضرت علقمہ شبلی کو (15 اگست 2014 بروز جمعہ بوقت ساڑھے چھ بجے شام) دہلی کلب ہال' 91 بی۔ چترنجن ایونیو' سکنڈ فلور' کولکاتا۔ 73 میں اعزاز دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میدانِ صحافت میں نووارد رسالہ 'محفلِ خوش رنگ' مدیر معروف ادیب محمد افضل خان کا اجرا بھی ہوا اور ایک شاندار مشاعرہ سے ذی فہم

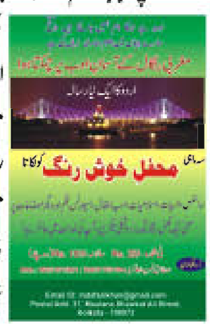

اور ادب نواز سامعین کرام محظوظ بھی ہوئے۔ تقریب کی صدارت خوش فکر شاعر محترم انجم عظیم آبادی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب محسن علی شیرازی' ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی' جناب عبدالمتین بٹلہ' جناب جمال احمد (ہیومن رائٹس)' جناب قمرالدین ملک (مالک کٹن گیلری)' جناب خالد عبداللہ' سید سعید (خلافت کمیٹی کے سکریٹری) اور فاروق انجینئر رونقِ محفل کو دوبالا کیا۔ فریضۂ نظامت ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

پریس ریلیز، محمد افضل خان، کولکاتا، 20 اگست 2014

اخلاق آہن کا شعری مجموعہ 'سرور'

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور اردو کے شاعر ڈاکٹر اخلاق آہن کے پہلے شعری مجموعہ 'سرور' کی رسم اجرا پروفیسر انور پاشا، پروفیسر اسلم اصلاحی اور سید محمد منظر سادات پوری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

جے این یو کے اسکول آف لینگویجز سینٹر میں منعقد رسم اجرا کی تقریب میں معروف دانشور اور جے این یو کے شعبۂ سیاسیات کے استاد پروفیسر منیندر ناتھ ٹھاکر نے کہا کہ ہندی کے معروف شاعر مکتی بودھ کو جو کچھ اندھیرے میں دکھائی دے رہا تھا اخلاق آہن کو دن کے اجالے میں دکھنے لگا۔ مکتی بودھ یہ سب کچھ کہنے کے لیے فنتاسی کا سہارا لیتے ہیں، سپنے میں چیزیں صاف نہیں دکھتی ہیں، لیکن اخلاق بے باکی سے سماج کی پرت در پرت کھولتے ہیں۔ پروگرام کی صدارت کررہے پروفیسر انور پاشا نے مجموعہ کے حوالے سے کہا کہ اخلاق احمد آہن کی شاعری عہد حاضر کا آئینہ ہے۔ امریکہ سے تشریف لائے اردو کی کئی کتابوں کے مصنف مہمان خصوصی سید منظر سادات پوری نے کہا کہ حالانکہ میرا تعلق نثر نگاری سے رہا ہے مگر میں آہن کے شعری مجموعہ 'سرور' سے اور ان کی شاعری سے کافی متاثر ہوا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ پروگرام کے آخر میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے وابستہ کلثوم فاطمہ نے تمام شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اگست 2014

تذکرہ شعرائے سیوان

سیوان: سیوان ضلع بہار کی شعری تاریخ اور شاعروں سے متعلق 'تذکرہ شعرائے سیوان' کے رسم اجرا کی تقریب کا مورخہ 24 اگست کو انعقاد کیا گیا۔ رسم اجرا مشترکہ طور پر بدر عالم، الحاج عین الحق صدیقی، سید علاء الدین، شہزاد فاروقی، قمرالدین دھوم نگری، باب الدین احمد، حاجی انور حسین ڈائریکٹر سینک ماڈل اسکول اور سید عارف حسنین کے ذریعے انجام دی گئی۔ اس موقعے پر محمد شفیق الرحمٰن ڈائریکٹر دہلی پبلک اسکول قمر صدیقی ڈائریکٹر پبلک اسکول، باب الدین احمد اور ڈاکٹر احتشام احمد میڈکل آفیسر نے تذکرہ شعرائے سیوان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بدرِ عالم سی اے نے صدارتی خطاب میں کہا کہ سید عارف حسنین نے تذکرہ شعرائے سیوان کے ذریعہ اردو زبان اور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں قابل قدر کیا ہے۔ سید عارف حسنین مصنف و مرتب نے تذکرہ شعرائے سیوان سے متعلق مختصر مگر کارآمد باتیں کی۔

پریس ریلیز، سید عارف حسنین، سیوان، بہار 25 اگست 2014

'گلدستۂ اطفال' کا رسم اجراء

مورخہ 30 اگست 2014 کو جگن موہن پیلس میسور میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری چیرپرسن کرناٹک اردو اکادمی کے بدست جناب حسینی بیگ وظیفہ یاب ہیڈ ماسٹر کی لکھی ہوئی کتاب ''گلدستۂ اطفال'' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ موصوف کی یہ کتاب طلباء، اساتذہ، اور والدین کی رہنمائی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مضامین بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت پر تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں حسینی بیگ صاحب نے بچوں کی اخلاقی تربیت کی افادیت اور اہمیت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

نعمت اللہ خان، ممبر کرناٹک اردو اکادمی، میسور، 1 ستمبر 2014

عالمی انوارِ تخلیق

بنگلور: ''زیادہ تر لوگ سمجھتے ہیں کہ ادب، شعرو سخن اور قلم کی کاوشیں دراصل گھاٹے کا سودا ہیں، لیکن جب ادب: ادیب کی، شعروسخن: شاعرو سخن ور کی اور قلم کی کاوشیں: ایک قلم کار کی 'زندگی' بن جائیں تو یہ کیوں کر گھاٹے کا سودا ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر ایم اے حق کی ادارت میں رانچی (جھارکھنڈ) سے شائع ہونے والے رسالے 'عالمی انوارِ تخلیق' کا اجرا کرتے ہوئے، کرناٹک کے مایہ ناز افسانہ نگار و طنز و مزاح نگار اور صدر، جنوبی ہند مرکزی شمعِ اردو ادب، بنگلور، شکیل رضا نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اجرا کی یہ تقریب، بروز منگل، مورخہ 26 اگست 2014 سہ پہر 4 بجے، عزیز بلگامی کی صدارت میں ان ہی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس میں مشہور شاعر و افسانہ نگار الف احمد برق بنگلور اور صوفی نظام الدین بطور مہمانانِ خصوی

اورایم اے حق بطور مہمان اعزازی شریک جلسہ رہے۔ اسی موقع پر ایم اے حق نے کہا کہ آپ کے خلوص کا قرضدار بن گیا ہوں۔ یہ رسالہ عام معنوں میں محض کوئی رسالہ نہیں، بلکہ یہ ایک تحریک ہے جو اردو زبان وادب کو نوجوان نسل، بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اگست 2014

الحسن

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے محسن الملک ہال کی سالانہ میگزین 'الحسن' کا اجرا کرتے ہوئے ایڈیٹوریل بورڈ کی کاوشوں کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ اقامتی ہال کی ان سرگرمیوں سے طلبہ کی ادبی وتخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع اس میگزین میں جو مضامین شائع کیے گئے ہیں اس سے طلبہ کی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ محسن الملک ہال کے قیام کے پچاس سال مکمل ہوگئے ہیں اور انھیں یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ یہ میگزین انٹرنیٹ پر بھی پیش کی جارہی ہے تاکہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس ہال کے سابق طلبہ اس کا مطالعہ کرسکیں۔ وائس چانسلر جنرل شاہ نے ایم ایم ہال کے طلبہ سے طلبہ یونین کے انتخابات کرانے اور طالبات کو اس میں ریزرویشن فراہم کرنے کے بارے میں بھی ان کے افکار ونظریات کو جاننے کی کوشش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 ستمبر 2014

وفیات

شمیم فاروقی

پٹنہ: بزرگ اور ممتاز شاعر اور انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کے سابق آفیسر شمیم فاروقی کا جمعہ 29 اگست 2014

کو چھ بجے شام میں بھکنا پہاڑی میں واقع ابوسلیمان اپارٹمنٹ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 71 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کے انتقال کی خبر پورے ادبی حلقہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورا ادبی حلقہ سوگوار ہوگیا۔ شمیم فاروقی کی پیدائش 25 دسمبر 1943 کو گیا ضلع کی مشہور بستی بیتھو شریف میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید قسیم الدین احمد تھا۔ شمیم فاروقی نے رانچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور انڈین براڈ کاسٹنگ سروس میں 34 سال ملازمت کرکے 31 دسمبر 2002 کو سبکدوش ہوئے۔ اس دوران وہ آکاشوانی پٹنہ اور آکاشوانی دربھنگہ میں پروگرام ایگزیکٹیو کے علاوہ کئی دوسرے عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ایک خوش فکر اور معتبر ومستند شاعر تھے ان کا ایک شعری مجموعہ 'ذائقہ میرے لہو کا' شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے۔

روزنامہ 'پیغام' دہلی، 31 اگست 2014

محمد عتیق صدیقی

نئی دہلی: دہلی کے معروف صحافی اور مشہور سیاسی اور سماجی کارکن محمد عتیق صدیقی کا 9 اگست کو نوئیڈا کے میٹرو اسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ گزشتہ دو

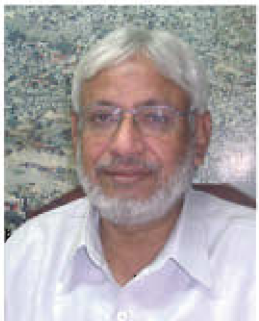

ماہ سے مرحوم مختلف امراض میں مبتلا تھے۔ 72 سال کی عمر میں عتیق صدیقی نے جس طرح بے لوث قوم کی خدمت، بچوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا، عوام میں بیداری کے پروگرام منعقد کیے، مختلف مسائل پر آواز اٹھاتے رہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری، جمعیت علماء ہند کے دہلی اسٹیٹ کے نائب صدر، گلی قاسم جان آر ڈبلیو اے کے صدر، دہلی سٹیزنس ویلفیئر کاؤنسل کے سکریٹری جیسے عہدوں پر عتیق صدیقی نے اپنی کارکردگی کے لیے لوگوں کے دل جیتے۔ اس کے علاوہ روزنامہ الیوم، شاہ جہاں اور وحدت نو اخبارات بھی عتیق صدیقی نکالا کرتے تھے۔ ان کے اہل خانہ میں اہلیہ اور ایک بیٹا محمد عامر کے علاوہ بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ عتیق صدیقی ایک ملنسار، خوش مزاج، قوم پرست اور ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کا کام انجام دینے والے شخص تھے۔ شاہی امام سید احمد بخاری نے مسجد درگاہ فیض الٰہی میں نماز جنازہ بعد نماز ظہر پڑھائی۔ مسجد فتح پوری کے امام ڈاکٹر مفتی مکرم احمد طبیعت خراب ہونے کے باوجود عتیق صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرنے ان کی رہائش گاہ پر پہنچے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 اگست 2014

ہوش نعمانی

رام پور: بین الاقوامی شہرت کے مالک استاد شاعر شرافت یار خاں المعروف ہوش نعمانی کا طویل بیماری کے بعد 22 اگست 2014 کو انتقال ہوگیا۔ بہترین لب ولہجہ کے 85 سالہ استاد شاعر ہوش نعمانی کافی عرصے سے صاحب فراش تھے۔ 15 مجموعوں کے شاعر کے سیکڑوں شاگرد ہیں، جن میں بڑی تعداد مرادآباد کی ہے۔ مرحوم ہوش نعمانی ہندوستان، پاکستان، عرب امارات میں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے اشعار اور لب ولہجہ کے سامعین مداح تھے۔ ہوش نعمانی کا سب سے بڑا کارنامہ 'ادب گاہ رام پور' ہے، جسے رضا لائبریری نے شائع کیا تھا، جس میں منظوم تعارف ادیب و شاعروں کا ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک کا تھا۔ ہوش نعمانی کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی کا وقت اب ختم ہونے والا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے آخری مجموعہ کا نام 'اتمام' رکھا۔ وہ استاد شاعر حضرت جلیل خاں نعمانی کے شاگرد تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اگست 2014

غمگین قریشی

سہارنپور: اپنا وطن رامپور اسٹیٹ چھوڑ کر بچپن میں سہارنپور آئے نابینا شاعر غمگین قریشی کا 75 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین میں شہر کے سرکردہ حضرات شریک ہوئے۔ غمگین قریشی نابینا ہونے کے باوجود کافی متحرک رہتے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے نشیب وفراز اور درد وغم منظر عام پر آکر شائقین کی داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ بھی منظر عام پر لانے کی خواہش تھی جو پوری نہ ہوسکی۔ ان کا نام محمد سفیان اور تخلص غمگین تھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 اگست 2014

کالم نویس وصحافی سید علی

کلکتہ: کلکتہ شہر کے مشہور ومعروف صحافی اور ملک بھر کے مختلف اردو اخبارات میں کالم نگاری کرنے والے سید علی کا ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں انتقال ہوگیا۔ وہ گزشتہ ایک سال سے گردے کے عارضے میں مبتلا تھے۔ مرحوم سید علی کی عمر 80 سال کے قریب تھی۔ پیشہ ورانہ اعتبار سے وہ تاجر تھے مگر تحریک اسلامی سے وابستہ رہنے کی وجہ سے وہ سماجی اور ملی کاموں میں بڑھ کر چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی تحریروں کو ملک بھر میں پسند کیا جاتا تھا۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ سید علی کے انتقال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے ممبر پارلیمنٹ اور بنگلہ اخبار قلم

کے ایڈیٹر احمد حسن عمران نے کہا کہ سید علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو مغربی بنگال میں اسلام کی علمی سطح پر نمائندگی کرتے تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 اگست 2014

ابن اسماعیل

نئی دہلی: فکرانگیز اور دانش افروز تحریروں کی بزم کتابی سلسلے کے نام سے سجانے والے بزم ادب کشمیر کے مدیر اور پیشہ ور معالج و معروف ادیب ابن اسماعیل کا انتقال ہوگیا۔ رفیق شاہین نے ہمارا سماج کو بتایا کہ سوپور سے اپنے مریضوں کے معائینے کی غرض سے سری نگر جارہے تھے، تبھی بارہمولہ روڈ پر جس کار میں ابن اسماعیل بیٹھے تھے وہ بھاری ملٹری گاڑی سے ٹکرا گئی۔ عینی شاہدین کے مطابق مع ابن اسماعیل کار میں سبھی سوار جاں بحق ہوگئے۔ موصوف نے حال ہی میں 502 صفحات کا عالمی افسانہ ادب نمبر ترتیب دیا تھا، جس میں رفیق شاہین کے روسی انگریزی کہانیوں کے اٹھارہ طویل ترجمے اور خود مرحوم کے بھی دو ناولوں کے ترجمے شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اگست 2014

بلراج پوری

جموں: معروف سینئر صحافی پدم بھوشن بلراج پوری کا جموں میں انتقال ہوگیا۔ کئی اردو اور انگریزی اخبار نکالنے والے مسٹر پوری نے مختلف علاقوں اور فرقوں کے درمیان امن اور خیرسگالی کا ماحول قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے 1975 میں شیخ عبداللہ اور اندرا گاندھی کے درمیان مشہور سمجھوتہ کرانے میں ثالثی کا کردار ادا کیا تھا۔ انھیں سال 2005 میں پدم بھوشن ایوارڈ دیا گیا تھا اور سال 2009 میں انھیں اندرا گاندھی سدبھاؤنا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 اگست 2014

پروفیسر سید رضا

سری نگر: وادی کشمیر کے نامور شاعر، ادیب اور قلم کار پروفیسر سید محمد رضا موسوی گزشتہ رات شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال کرگئے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھے۔ مرحوم وسطی کشمیر کے ضلع بڈگام سے تعلق رکھتے تھے۔ ادبی حلقوں نے سید رضا کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم گورنمنٹ ڈگری کالج بڈگام میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ مرحوم نے اردو اور کشمیری زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ نعت، منقبت، نوحہ، سلام، غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی علمی، ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اردو اور کشمیری زبانوں میں ان کا کلام مستند مانا جاتا ہے۔ پروفیسر رضا اپنی خوش خطی کے لیے بھی وادی کشمیر میں منفرد مقام رکھتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 ستمبر 2014

خراج عقیدت

اقبال مرزا کے انتقال پر تعزیتی میٹنگ کی نشست

نئی دہلی: معروف ادیب، شاعر، دانشور اور ماہنامہ 'صدا' (لندن) کے مدیر ڈاکٹر اقبال مرزا کے انتقال سے 'اردو دنیا' میں سوگ کا ماحول برپا ہوگیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ان کے انتقال کی خبر پہنچنے پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ ''اقبال مرزا کی وفات اردو دنیا کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ لندن میں رہ کر جس سنجیدگی سے وہ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے تھے، اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹر مرزا کا گہرا رشتہ تھا۔ وہ ہر سال انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرتے تھے اور ہم سبھی ان کے افکار و خیالات سے مستفید ہوتے تھے۔'' شاہد ماہلی نے مرحوم سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اقبال مرزا سے میرا تقریباً 30 سال پرانا علمی و ادبی رشتہ تھا، وہ مجھے بےحد عزیز رکھتے تھے، میں اُن کی میگزین کے مشاورتی بورڈ میں بھی تھا۔ لندن جیسی جگہ میں رہ کر اپنے رسالے کے ذریعے جس طرح سے اردو زبان و ادب کے تعلق سے وہ پورے یوروپ کی نمائندگی کررہے تھے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ''اقبال مرزا بڑے ادیب کے ساتھ ہردلعزیز اور اعلیٰ اخلاق کے حامل انسان بھی تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور چھوٹوں سے نہایت ہی محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ اپنی دانشوری سے ماہنامہ 'صدا' کو انھوں نے بلندی تک پہنچایا۔'' غور طلب ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرزا کا 18 اگست کو لندن میں انتقال ہوگیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اگست 2014

عتیق صدیقی کو خراج عقیدت

نئی دہلی: پرانی دہلی کے معروف سماجی شخصیت، ادیب، سینئر صحافی، روزنامہ الیوم او ہفت روزہ شاہجہاں کے مدیر اعلیٰ محمد عتیق صدیقی کے انتقال پر پرانی دہلی کے سماجی تنظیموں کے اشتراک سے دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کی چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں اور شفیع دہلوی کی جانب سے تعزیتی جلسے کا انعقاد حج منزل ترکمان گیٹ میں کیا گیا۔ جس میں مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے وابستہ سماجی، ادبی، صحافی اور دانشور حضرات نے شرکت کرکے مرحوم عتیق صدیقی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر مرحوم عتیق صدیقی کے خویش اقربا بھی موجود تھے۔ مرحوم عتیق صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی کے سابق چیئرمین پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ مرحوم عتیق صدیقی نے کبھی اپنے اصولوں کے لیے غلط عوامل سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ عتیق صدیقی (مرحوم) دہلی کی سماجی روایتوں کے امین تھے اور اردو کے شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ حج امور سے متعلق تمام امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ رہے۔ حاجی انیس درانی کی صدارت میں منعقد اس جلسے میں ڈاکٹر پرویز میاں نے کہا کہ میں نے ان کے ساتھ کام کرکے جو کچھ سیکھا آج وہ تجربہ میرے کام آرہا ہے۔ حاجی انیس درانی نے کہا کہ عتیق صدیقی جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ماہر تعلیم ماسٹر فرید احمد نے ان کو تمام سماجی کارکنوں کا استاد قرار دیا۔ سابق کونسلر اشوک جین نے کہا کہ انھوں نے اپنے قلم سے ہر تحریک کو طاقت بخشی ہے۔ مرحوم کے صاحبزادے عامر صدیقی نے کہا کہ ضرورت مند افراد ان کا اثاثہ تھے اور وہ خاموشی سے سب کی خدمت کرتے تھے۔ اس موقعے پر شفیع دہلوی، محمود ضیا، جمیل انجم ممتاز چاؤلہ، مولانا انور قاسمی، حاجی اظہار، مولانا سیدالدین قاسمی، حج کمیٹی کے ڈپٹی انگیزیکیٹیو آفیسر محسن علی نے بھی اپنے خطاب میں مرحوم کو تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کی مغفرت کی دعا کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 اگست 2014

بپن چندرا

نئی دہلی: ترقی پسند تحریک کے ایک اہم رکن اور ممتاز تاریخ داں بپن چندرا کے انتقال پر اکادمک حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے اور انھیں فرقہ پرستی کے خلاف جنگ لڑنے والا مرد مجاہد بتایا گیا ہے۔ اس موقعے پر وزیراعظم نریندر مودی نے ممتاز مورخ پروفیسر بپن چندرا کے انتقال پر گہرے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اپنے تعزیتی پیغام میں مسٹر مودی نے پروفیسر چندرا کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ان کے خاندان کے تئیں ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ دوسری جانب کانگریس صدر سونیا گاندھی اور پارٹی کے نائب صدر راہل گاندھی نے مشہور مورخ بپن چندرا کے انتقال پر تعزیت کا اظہار

کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور مایہ ناز تاریخ داں عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ بپن چندرا ایک ممتاز شخصیت تھے اور تاریخ کے ذریعہ ترقی پسند تحریک کو مضبوط بنانے میں گامزن تھے۔ انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھیں جن میں 'انڈیا اسٹرگل فار انڈی پنڈنس' اور 'انڈیا آفٹر انڈی پنڈنس' اہم ہیں۔

ہندوستان کی قومی تحریک اور مہاتما گاندھی کی شخصیت پر ان کا مطالعہ وسیع تھا اور اس ضمن میں انھوں نے کئی اہم کتابیں مرتب کیں۔ ان کے شروعاتی دور کی کتابوں میں 'دا رائز ان گروتھ آف اکنامک نیشنلزم' بھی شامل ہے۔ دہلی کے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مردولا مکھرجی کا کہنا ہے کہ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ میں انھوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا اور جدید ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایسا مثالی کام کیا جسے آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی۔ مردولا مکھرجی کے مطابق ملک میں سیکولرزم کا قیام ان کا نصب العین تھا اور ان کا ماننا تھا کہ سیکولرزم کا مطلب ہی فرقہ پرستی کے خلاف کھڑا ہونا ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق پروفیسر بپن چندرا 1980 میں یہ سوچنے لگے تھے کہ ملک میں فرقہ پرستی کا شکنجہ مضبوط ہوتا جارہا ہے اور 1990 میں سوویت یونین کے زوال کے بعد انھیں لگنے لگا تھا کہ سوشلزم کا مستقبل بہتر نہیں رہ گیا ہے۔ تاہم وہ اپنے نظریہ پر مضبوطی سے قائم رہے اور زندگی بھر سوشلزم کے قیام اور فرقہ پرستی کے خلاف جنگ لڑتے رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اگست 2014

زہرا سہگل کی یاد میں پروگرام کا انعقاد

میرٹھ: زہرا سہگل ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی وراثت ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی فن کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنے فن کے ذریعے ہندوستان کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا۔ ان خیالات کا اظہار اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور یونائیٹڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن کے مشترکہ زیر اہتمام بمقام برہسپتی بھون، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں بھارتیہ ناٹیہ منچ کی معروف کوریوگرافر اور بہترین اداکارہ مرحومہ زہرا سہگل کی یاد میں ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سبھارتی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر منظور احمد نے کی۔ پروفیسر ایچ ایس سنگھ (پرووائس چانسلر، میرٹھ یونیورسٹی) نے شمع روشن کی جبکہ مہمانان ذی وقار کے طور پر محترم اجیت اگروال (چیئرمین گیان بھارتی گروپ آف انسٹی ٹیوشن، میرٹھ) نے شرکت کی اور مہمانان مکرم کے بطور کے کے شرما (مشہور مورخ)، نیرج شرما (ٹی وی سیریل پروڈیوسر وڈائریکٹر)، انجینئر رفعت جمالی (جنرل سکریٹری، ڈاکٹر انجم جمالی فاؤنڈیشن، میرٹھ) اور راج کمار گوجر، ایڈووکیٹ رونق افروز رہے۔ ڈاکٹر شاداب علیم نے شعبۂ اردو کا تعارف کرایا جبکہ مہمانوں کا استقبال صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کیا۔ پروگرام کی نظامت بھارت بھوشن نے ادا کیے اور شکریے کی رسم ڈاکٹر آصف علی نے انجام دی۔ اس موقعے پر پروفیسر منظور احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے زہرا سہگل کو تاریخ ساز شخصیت بتایا۔ اور زہرا سہگل: یادوں کا کارواں پروگرام کو یادگار بتایا۔ اور اس موقعے پر شہر کے معزز افراد کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 11 اگست 2014

فراق گورکھپوری کا یوم پیدائش

گورکھپور: ادب کو فراق گورکھپوری نے اپنی غزلوں سے جس طرح سنوارا سجایا ہے اس سے اس ادب کی عظمت اور بلندی میں اضافہ ہوا ہے۔ فراق کی شاعری اردو زبان و ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار فراق گورکھپوری کے یوم پیدائش کے موقعے پر ساجد علی میموریل کمیٹی کی جانب سے منعقد جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ محمد حامد علی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ فراق پر نہ صرف گورکھپور بلکہ ہندوستان کو ناز ہے وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں جنگ آزادی کے سورما بھی تھے۔ ضمیر احمد، محبوب سعید حارث، راشد کمال سامانی، ظفر احمد خاں نے بھی فراق کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ویریندر شریواستو نے فراق سے متعلق کئی واقعات سنائے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر وجاہت کریم نے فراق کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اگست 2014

مکیش اکبرآبادی کے یوم وفات پر خراج عقیدت

آگرہ: 20 ویں صدی کے آخری دور میں جن اردو شاعروں نے ممتاز مقام حاصل کیا ان میں علامہ مکیش اکبرآبادی کا نام کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ انھوں نے غزل کو تازہ الفاظ اور تازہ واردات کا سنگم بنانے پر زور دیا۔ ان کا تصوف آمیز لہجہ اردو غزل کو بہت راس آیا۔ ان کے یوم انتقال پر ادبا، شعرائے اکبرآباد نے انھیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ قادری نیازی سلسلہ کے صاحب سجادہ اور تصوف کی عملی روایات کے بھی علم بردار تھے۔ مہمان خصوصی خانقاہ نیازیہ بریلی شریف کے نمائندہ حضرت باقر میاں نیازی نے کہا کہ دنیا میں سب سے بہتر انسان اور سب سے مکمل سیرت نبیؐ کی ہے۔ مکیش اکبرآبادی نے اپنی عملی زندگی میں نبی کریمؐ کی عملی زندگی پر چلنے کی پوری کوشش کی۔ اس موقعے پر ایک شاندار نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس میں مقامی و بیرونی شعرا نے بہترین کلام سے نوازا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اگست 2014

صدیق علی خاں کو خراج عقیدت

رام پور: انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام آفریدی باغ لیاقت علی خاں آفریدی کی رہائش گاہ پر صدیق علی خاں اثری مرحوم کو ایصال ثواب کے لیے تعزیتی میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت لئیق خاں آف دہلی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض تنظیم کے جنرل سکریٹری آل احمد خاں سرور نے انجام دیے اس موقعے پر مقررین نے مرحوم کو صوم وصلوٰۃ کا پابند اور نہایت ملنسار قرار دیتے ہوئے ادبی دنیا کا بڑا خسارہ قرار دیا۔ مقررین نے کہا کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں تعلیم کے لیے جو کام کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 اگست 2014

ڈاکٹر غیاث الدین

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے ستیہ وتی کالج میں شعبہ اردو کے ٹیچر انچارج ڈاکٹر غیاث الدین کے انتقال پر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم غیاث الدین ایک لائق اور ہونہار استاد تھے وہ گزشتہ آٹھ سال سے ستیہ وتی کالج میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار شعبے کی ذمے داریاں سنبھالیں اور انھیں بخوبی نبھایا۔ وہ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے تمام تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ وہ ایک ہونہار طالب علم اور لائق استاد کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مرحوم غیاث الدین کے انتقال سے میں بے حد دل برداشتہ ہوں، وہ بہت اچھے اور تعاون پسند انسان تھے۔ ان کا اتنی کم عمری میں انتقال تمام لوگوں کے لیے غم کا باعث ہے۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے کہا کہ وہ ایک اچھے اخلاق والے انسان تھے اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو اساتذہ کی پہلے ہی کمی ہے، اب یہ ایک اور خلا پیدا ہوگیا۔ ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ابوبکر عباد اور ڈاکٹر مشتاق قادری نے بھی مرحوم کے تئیں خراج عقیدت کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 ستمبر 2014

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد
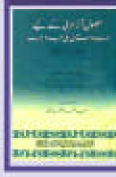
مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)
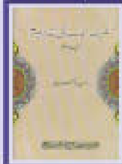
مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

اردو سب کے لیے

ادارہ
صفحات: 121
قیمت: -/45 روپے

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت
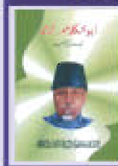
مصنف: رشید الدین خان
صفحات: 684
قیمت: -/200 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)
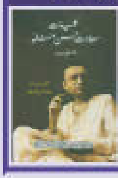
تحقیق، تدوین، ترتیب:
پروفیسر شمس الحق عثمانی
صفحات: 567
قیمت: -/184 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (دوسری جلد)
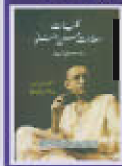
تحقیق، تدوین، ترتیب:
پروفیسر شمس الحق عثمانی
صفحات: 575
قیمت: -/186 روپے

اردو-ہندی لغت
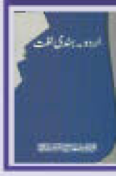
ادارہ، ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ
کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں
صفحات: 416
قیمت: -/220 روپے

کلیات اکبرالہ آبادی (جلد دوم)
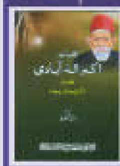
مرتب: احمد محفوظ
صفحات: 803
قیمت: -/257 روپے

اردو میں ترقی پسند تحریک
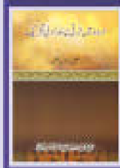
مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی
صفحات: 410
قیمت: -/129 روپے

اردو سافٹ ویئر
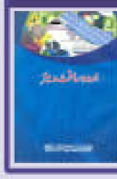
ادارہ
صفحات: 135
قیمت: -/68 روپے

کلیات کمار پاشی (جلد اوّل)

مرتب: چندر بھان خیال
صفحات: 477
قیمت: 166 روپے

کلیات کمار پاشی (جلد دوم)

مرتب: چندر بھان خیال
صفحات: 465
قیمت: 157 روپے

کلیاتِ سلیم واحد سلیم
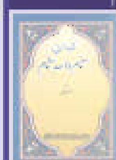
مرتبہ: مسلم سلیم
صفحات: 432
قیمت: -/150 روپے

کلیات محمد قلی قطب شاہ
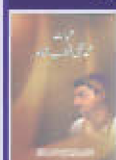
مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر
صفحات: 823
قیمت: -/233 روپے

اے نیو ہندستانی-انگلش ڈکشنری
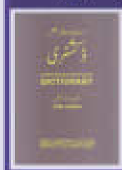
مصنف: ایس ڈبلو فیلن
صفحات: 1216
قیمت: -/656 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October- 2014, Vol. 16, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/9/2014
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000